
آزادی کا ادب

(جلد اوّل)

مرتّبہ

گوپال مِتّل

مکتبہ تحریک۔ ۹، انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

اشاعت اوّل

مارچ ۱۹۵۴ء

قیمت:- تین روپے

(مطبوعہ جید پریس بلیماران دہلی)

فہرست

مقالے:

افسانے اور ڈرامے:

نظمیں:

حرفِ آغاز

اسے ایک نیک فال سمجھنا چاہیئے کہ ہند اور پاکستان دونوں ملکوں میں بیک وقت احیائے ادب کی تحریک کا آغاز ہو گیا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس تحریک کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ یہ احساس بھی کم نہیں۔ اور آگے چل کر اس کا ایک تعمیری شکل اختیار کر لینا یقینی ہے۔

گمرہانِ دانش نے دانشوری کا سُرخ لبادہ اوڑھ کر گذشتہ سات آٹھ برس میں ادب کے نام پر جو دھاندلی مچائی تھی اس کے خلاف اب ردعمل شروع ہو گیا ہے۔ ان سات آٹھ برس میں ان گمرہانِ دانش نے کم از کم اردو ادب میں تو اچھی خاصی اجارہ داری قائم کر لی تھی اور ان تمام ادیبوں کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا جو ادب کی مستقل قدروں کو خیرباد کہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ دَور کتنا ادب دشمن تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ نیاز حیدر تاریخی قدروں کے نام پر بہترین شاعر بن گئے اور ممتاز حسین بہترین نقّاد ؏:

وائے گر از پسِ امروز بود فردائے

محفل کا یہ رنگ دیکھ کر سچّے ادیبوں اور شاعروں نے چُپ سادھ لی۔ اور میدان کرشن چندروں اور علی سردار جعفریوں کے ہاتھ رہ گیا۔ لیکن یہ ہیجانی دور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ آخر ان لوگوں نے جن کے دل میں تخلیق کی سچّی لگن تھی یہ محسوس کیا کہ اگر ادب کو زندہ رکھنا ہے تو ان گندم نما جَو فروشوں سے لوہا لینا ہی پڑے گا۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے صاحب طرز شاعر اور نکتہ رس نقاد علامہ جعفر علی خاں اثرؔ کے یہ الفاظ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں کہ "جب تک اچھی شاعری کے دو قدرداں بھی صفحۂ ہستی پر موجود ہیں اور اس سے کیف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شاعری کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ یہ دو اشخاص بھی اپنی آواز بلند نہ کریں اور کس مپرسی کی افسردگی ایک طویل عرصے تک چھائی رہے۔ تو کیا ہوتا ہے۔ جذبۂ شاعری دوبارہ جنم لے گا۔ کیونکہ انسانی فطرت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔" ان لفظوں میں جو عزم موجود ہے اگر وہ چند دلوں کو بھی گرما دے تو احیائے ادب کی تحریک کا آغاز ہو سکتا ہے۔

ادب کے سچے پرستار اب بھی موجود ہیں۔ لیکن ایک تو غوغائیوں نے ان کو مرعوب کر دیا ہے اور ایک ان میں تنظیم نہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی تنظیم اشتراکی ادیبوں کی طرح ممکن بھی نہیں۔ کیونکہ سچے ادیب اور شاعر فطرتاً انفرادیت کیش اور تنہارو ہوتے ہیں۔ بہر حال ان لوگوں کا یہ فرض ضرور ہے کہ وہ اپنی آواز کو بلند کرتے رہیں۔ اس مقصد کے لئے وحدت فکر کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ جب زندگی تضاد ہے تو طبائع میں اختلاف کیوں نہ ہو۔ اور اگر طبائع میں اختلاف ہے تو اس کا اظہار ادب میں کیوں نہ ہو۔ ادب تو پنپتا ہی تب ہے۔ اگر ادیب کو دل کی بات کہنے کی کھلی آزادی حاصل رہے۔ ہم سُرخ یا زرد فاشسٹ نہیں کہ ادیبوں پر اس قسم کی پابندی عائد کریں کہ وہ یہ لکھیں اور وہ نہ لکھیں۔

احیائے ادب کی تحریک کے سلسلہ میں محمد حسن عسکری کا وہ مقالہ بھی بہت اہم ہے جو انہوں نے ماہنامہ "ساقی" میں جھلکیاں کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اس فقرے سے ہوتی ہے کہ "بہ حیثیت مجموعی اردو ادب اب مر چکا ہے" اور خاتمہ اس فقرے پر کہ "اگر موجودہ ادیبوں کو قربان کر دینے سے ادب میں پھر سے جان آجائے تو یہ سودا گھاٹے کا نہیں رہے گا۔"

ہمارے خیال میں مضمون کے ابتدائی فقرے کے مقابلے میں آخری فقرہ زیادہ اہم ہے

اگر اردو ادب واقعی مرگیا ہے تو اس کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس صورت میں موجودہ ادیبوں کی قربانی دینا صرف خون ناحق سے ہاتھ رنگنے کے مترادف ہے۔ ان کے پورے مضمون سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ ادب مرگیا ہے۔ ادب کی موت کا اعلان انہوں نے بڑی دردمندی سے کیا ہے۔ اور اس اعلان کی پشت پر ایک تعمیری جذبہ کارفرما ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تجدید ادب کے لئے موجودہ ادیبوں کو جن میں ان کے ذاتی دوست بھی ہوں گے قربان کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوسکتے تھے۔

ان کی تلخ بیانی کا معاملہ تو انہیں تک ہے۔ لیکن بات انہوں نے بڑے پتے کی کہی ہے یہ واقعہ ہے کہ جب تک ان ادیبوں کو جو اشتراکی ادب کے علمبردار ہیں۔ بد فضول سمجھ کر نظرانداز نہ کیا جائے گا۔ اس وقت تک اردو ادب کے احیاء کی صورت پیدا نہیں ہوسکتی۔ ان لوگوں نے ادب کے نام پر جو کچھ لکھا ہے وہ ادب کے میدان میں دخل درمعقولات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ لوگ غالباً خود بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی عظمت منوانے کے لئے نقاد کے قلم کا نہیں بلکہ عوام کے لٹھ کا سہارا لیا۔ اور ادبی اقدار کو بالائے طاق رکھ کر تاریخی قدروں اور عوام کی ترجمانی کا ڈھنڈورا پیٹنے لگے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ انہوں نے واقعی عوام کی ترجمانی کی۔ اگر انہوں نے واقعی عوام کی ترجمانی کی ہوتی تو عوام ان سے اتنی بے اعتنائی کا سلوک ہرگز نہ کرتے۔ کہ وہ زندہ درگور ہو جاتے۔ دراصل ان لوگوں کو ادب کی طرح عوام سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ یہ تو صرف اپنی شکست کی آواز تھے۔ اور یہ آواز بھی نغمگی سے محروم اور کرخت بھی۔ اب کوئی اسے سنے تو کیوں سنے۔

بعض لوگ تجدید ادب کے سلسلے میں خاکستر کو کریدنے میں مصروف ہیں۔ کبھی یہ لوگ راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے نام اجتماعی خط لکھ کر ان کی غیرت کو ابھارتے ہیں۔ اور کبھی جوش ملیح آبادی کو تنکوں کا سہارا دے کر انہیں اقبال کے مقابلہ میں کھڑا کرتے ہیں لیکن یہ سب قبرستان میں آواز لگانے والی بات ہے۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ مردے

کبھی زندہ نہیں ہوتے۔ اور پھر یہ بھی تو سوچئے کہ جب یہ لوگ زندہ تھے اس وقت انہوں نے کون سا تیر مار لیا تھا۔

اگر یہ لوگ واقعی ادب کا احیا چاہتے ہیں تو انتظار حسین کے اس مشورے کو اپنا لیں

مرنے والوں کو مرنے دو

جینے والوں کو اپنا لو

یہ انتخاب اسی اصول کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ اور کمیونسٹ ادیبوں کو یکسر نظر انداز کر کے صرف انہی ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا گیا ہے جو ایک موہوم انقلاب کی قربان گاہ پر اپنی انفرادیت اور شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھانے سے اجتناب کرتے رہے جب اس انتخاب کا خیال ذہن میں آیا اس وقت مطلق امید نہیں تھی کہ اتنا اچھا انتخاب تیار ہو جائیگا یہ غلط تصور کہ اردو ادب پر کمیونسٹوں کی اجارہ داری ہے۔ غیر شعوری طور پر میرے دل و دماغ پر بھی حاوی تھا لیکن ہند اور پاکستان کے نامور جریدوں کی ورق گردانی کی گئی تو اس خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا کہ اردو ادب پر کمیونسٹوں کی اجارہ داری اتنی ہی حقیقی ہے جتنی روس اور چین کی خوشحالی۔

انتخاب مکمل ہوا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ اردو کے بیشتر ادیب اور شاعر صرف غیر کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر کمیونسٹوں کے مخالف بھی ہیں۔ امید ہے کہ اسکی اشاعت ان ادیبوں اور شاعروں میں وحدت کا جذبہ پیدا کرے گی اور دنیائے ادب میں دہشت کا وہ ماحول ختم ہو گا۔ جس نے ان کو چپ سادھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

گوپال مِتّل

آثر لکھنوی

مجھے بھی کچھ کہنے دیجئے

(۱)

شاعری کی بہترین اقدار کو پیش نظر رکھنا اور اس کی فوقیت کے بنیادی اصول سمجھنا کسی زمانہ میں اتنا ضروری نہ تھا۔ جتنا آج ہے۔ سستا اور عامیانہ ادب نظموں، غزلوں اور افسانوں کی صورت میں سیل در سیل امڈا چلا آتا ہے اور اس کا واحد مقصد چند لمحوں کے لئے سامانِ تفریح مہیا کرنا، ہزار در ہزار ناشائستہ و عدم تربیت یافتہ پڑھنے والوں کو اپنی طرف مائل کرنا۔ اس قسم کے ادب کے لئے ان کی بھوک تیز کرنا اور جنسی بہیمی خواہشات کی آگ پر تیل چھڑکنا ہے۔ مذاقِ سلیم کا وہ روایاتی اقتدار ختم ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے پڑھنے والوں کی کثیر تعداد جن میں قدروں کے معین کرنے کی استعداد نہ تھی۔ معدودے چند معتبر ادیبوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تھے یہ نوبت پہنچی ہے کہ صحیح رجحانات رکھنے والے اس بھڑکیلی خرافات کے مقابل جو لاکھوں کی تعداد میں سستے اخباروں اور رسالوں کے ذریعے سے اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔ بددل ہو کر مدافعت کی سعی سے دستبردار ہوتے جاتے ہیں اور مایوسانہ لہجے میں کہتے

ہیں کہ وہ دَور ختم ہو گیا۔ جب نفیس اور سنجیدہ ادب میں توانائی تھی اور اپنی اثر اندازی سے دلوں کو موہ لیتا تھا۔ اب گندم نما جَو فروشوں کا بازار گرم ہے اور کانٹوں کو روندنا یا اُن سے اُلجھنا بے سود اور دانشمندی سے بعید ہے۔ عوام کی تھکی ہوئی ذہنیت بلند پایہ اُدبی تخلیق کی متحمل نہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ ہمیشہ گھٹیا، نا مہذب اور سوقیانہ خیالات سے دل بہلائیں گے۔

یہ شکست خوردہ متشائم ذہنیت اتنی ہی غلط بھی ہے جتنی بزدلانہ ہے۔ جب تک اچھی شاعری کے دو قدرداں بھی صفحۂ ہستی پر موجود ہیں اور اس سے کیف اندوز ہو سکتے ہیں شاعری کا اثر زائل نہیں ہو سکتا۔ یہ دو اشخاص بھی اپنی آواز بلند نہ کریں اور کس مپرسی کی افسردگی ایک طویل عرصہ تک چھائی رہے تو کیا ہوتا ہے جذبۂ شاعری دوبارہ ضرور جنم لے گا۔ کیونکہ انسانی فطرت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس تمہید کے بعد چند مخصوص مضامین کا جائزہ لیتا ہوں۔

ایک ماہنامہ میں ایک صاحب کا مضمون پڑھا۔ جس کا عنوان "تلخ تجربے" ہے۔ مضمون کا وہ حصّہ دلچسپ ہے جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ اگر ان کے مشوروں پر کاربند نہ ہوا گیا تو یہی نہیں کہ زبانِ اردو کی خیر نہیں بلکہ قوم کی قوم تہذیب و تمدن سمیت ہلاک ہو جائے گی۔ یہ درست ہے کہ کسی قوم کے کلچر کا سرمایہ اس کے ادبیات میں محفوظ اور کلچر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر زبان کی ترقی بند ہو گئی تو قومی زوال و انحطاط شروع ہو جائے گا۔ یہ مسئلہ دقیق و پیچیدہ ہے اور یہاں اس پر بحث کا موقعہ نہیں۔ جائزہ اس بات کا لینا ہے کہ زبان اور اس کے تحفظ کے لیے جناب موصوف نے کیا کیا مشورے دیئے اور طریقے بتائے ہیں اور وہ کہاں تک قابل عمل اور در خورِ تسلیم ہیں۔ طبقۂ شعراء سے جو اُن کا مخاطب صحیح ہے فرماتے ہیں کہ:۔

"زندگی کے تقاضوں کو سمجھیے اور اس کے مطابق شاعری کیجیے۔ عمل اور جواں مردی کی تعلیم دیجیے۔ آج کل عشق و عاشقی نہیں بلکہ بقائے حیات کے لئے خوراک اور پوشش کی بھی ضرورت ہے۔"

میں عرض کرتا ہوں کہ اس ملک کے باشندوں اور اس قوم اور اس کے افراد کی کاہلی و زبوں حالی قابلِ عبرت ہے جس میں عمل اور جواں مردی کے لئے شاعری کے مار اللحم کی ضرورت ہو۔ جہاں بقائے حیات کے لئے شاعری سے ٹھکر گدائی کی جائے جہاں پنجۂ شل ٹکولنے کو گرم اشعار درکار ہوں۔ جہاں شاعری کپڑا بُننے کا کرگھا بنائی جائے۔ جہاں یہ توقع رکھی جائے کہ وہ مسائل جن کا حل سوچنے میں بڑے بڑے مفکر، مدبر اور سائنسداں سر کھپا رہے ہیں وہ سب گتھیاں شاعر کا قلم معجز رقم ایک جنبش میں سلجھا دے گا۔ ہم یہ سہل نسخہ تو یاد رکھتے ہیں۔ کہ ادب ہمارے اخلاق و اطوار کو متاثر کرتا ہے لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ادب ہمارے کردار کا آئینہ بھی ہوتا ہے جیسے ہم ہوں گے ویسا ہی ہمارا ادب بھی ہوگا۔ خود فریبی سے الگ رہ کر ذرا اس عصرِ جدید کو دیکھیے جس میں خود بینی و خود پسندی و ہوس پرستی سطحیت اور غلامانہ ذہنیت کے سوا کچھ نہیں۔ جس میں سازش اور فتنہ پردازی۔ ساکھ اور رواداری کا بدل ہیں۔ جس میں مذہب کھلونا اور ریاس، وضع ڈھکوسلا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہ منصوبے باندھنا کہ شاعری ہمارا دُکھ درد دُور کرکے دنیا کو رشکِ گلزار (لفظ جنت عمداً استعمال نہیں کرتا) بنا دے گی، شیخ چلی کے خواب دیکھنا ہے۔ ماحول کثیف ہوگا تو شاعری بھی کیچڑ میں لوٹے گی۔ الہام کے سر چشمے خشک ہو جائیں گے۔ روحِ شاعری فنا ہو کر اس کی جگہ خوش نما و خوش آہند فقرے لے لیں گے۔ مغز سے خالی الفاظ و اصوات رہ جائیں گے اور بس۔ محبت کی دیوی کی تقدیس و تنزیہہ کا مضحکہ اُڑایا جائے گا اور نفرت کے خونی دیوتا کی پرستش ہوگی۔ جنسی بھوک کی تسکین کو فطرت

کی آڑ ڈھونڈی جائے گی۔ قصہ مختصر انسانیت دوبارہ بہیمیت کا چولا بدلے گی۔

اس نام نہاد ترقی پسندانہ شاعری کی ژولیدہ بیانی و پراگندہ خیالی اظہر من الشمس ہے تاہم اس سے اُن پڑھ اور جاہل عوام کی رہبری کی امیدیں وابستہ کی جاتی تھیں حالانکہ ان کی سمجھ سے باہر ہے اور جو ٹوٹی پھوٹی سمجھ میں آتی ہے وہ گھر پھونک تماشہ دیکھنے کے سوا کچھ نہیں سکھاتی۔ آج کل قحط، بھوک، وبا، گرانی، فرقہ وارانہ کشیدگی، بزلج اور مارکسیت یا اشتراکیت کی تحریک، مزدور اور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار کی آویزش مسلم۔ لیکن کس ترقی پسند شاعر نے ان کے اسباب دریافت کئے اور قابل عمل حل پیش کیا۔ بجز اس کے کہ بھُس پر چنگاری ڈالی اور آگ پر تیل چھڑکا۔ ایسی شاعری جو سیاسی پروپیگنڈہ اور نفرت پھیلانے کا آلہ ہے اور جو کچھ ہو، ادب کی قلمرو سے خارج ہے۔ انسانیت کے تقاضوں اور اپنے ملک کے حالات سے خالی الذہن ہو کر اشتراکیت کے نعرے لگانا فسطائیت کو لباسِ نو میں جلوہ دینا ہی نہیں بلکہ فسطائیت کی طرف خطرناک بازگشت ہے۔ کیونکہ فسطائیت صرف اپنے دشمنوں کا خاتمہ کرتی تھی۔ یہاں جو اشتراکی نہیں (چاہے اشتراکیت کا دشمن اور اس کی مخالفت میں سرگرم کار نہ ہو) گردن زدنی ہے۔

مضمون نگار موصوف کے ایک ہمخیال شاعر غزل ۱ رسالہ شاہراہ دہلی نمبر ۳-۴ میں فرماتے ہیں:-

دولت کے محافظ سانپوں کو بانبی میں نہ چھوڑا جائے گا
قبروں میں دریچے کھولیں گے، مُردوں کو جھنجھوڑا جائے گا
حکام پہ کوڑے برسیں گے، قانون کو توڑا جائے گا
حکام جو بن کر بیٹھے ہیں، دجال ہیں یہ، حکام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر، آرام کا یہ ہنگام نہیں

کب تک یہ جواری جیتیں گے، کب تک یہ جماعت لوٹے گی
مزدور کے میلے ہاتھوں سے، زنجیر تشدد ٹوٹے گی
دہقان گلے جب کاٹیں گے، ہاتھوں پہ کرن سی پھوٹے گی
مرنے سے حسیں اب فرض نہیں، جینے سے بُرا اب کام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر، آرام کا یہ ہنگام نہیں

اس سے قطع نظر کہ جو ابھی کھیلئے اور ہاریئے تو لٹوے بہایئے اور پانی پی پی کے کوسئے۔ بجوؤں (Badgers) کو شرمانے والی مُردہ کھسوٹ مزدوروں اور فصل دروکرنے کے بدلے ریتنے والے کسانوں کی منظم اور کھلے بندوں قتل و غارت کرنے والی جماعت منصۂ شہود پر لائی جا رہی ہے اور اس کے خون آلود ہاتھوں کو پنجۂ آفتاب سے مشابہ کیا جاتا ہے۔ یہ ہے ایک جھلک اس آزادی اس "سرخ سویرے" کی، اشتراکیت جس کے خواب دیکھتی اور گُن گاتی ہے۔ جس کی خود منتظر ہے اور دوسروں کو دعوتِ شرکت دیتی ہے۔ یہ ہے بقول شخصے وہ اشتراکیت جس نے نفرت کی کیچڑ اُچھالی، خون کی ہولی کھیلی اور دہشت وغم وغصہ کی آگ پھیلائی۔

اسی جذبۂ نفرت و خوں آشامی کے ماتحت دوسرے علمبردار اشتراکیت سامراج کے بوڑھے کتے کو جب وہ سات سمندر پار چلا گیا۔ اس طرح دُتکارتے ہیں۔

"رین اندھیری، سامراج کا بوڑھا کتا روئے"

اور اپنی سوویت پروردہ ذہنیت کا ان الفاظ میں مظاہرہ کرتے ہیں:۔

"چلے سوویت دشمن بننے دیکھو ان کی شکتی
دھری نہ رہ جائے تو کہنا ساری بگلا بھگتی
بپھرا ہے مزدور سنگھٹن، لال سنگھٹن دیر

سب سے بڑا گمبھیر

......آج انہیں مزدوروں کے ہاتھوں میں ہے شمشیر"

مزدور کے ہاتھ میں شمشیر دے کر یہ ادیبان ستم ظریف امن کا پرچار کرتے اور شانتی کا ڈھونگ رچاتے ہیں! زبانی تو یہ چیخ پکار کہ ہائے ہائے مزدور کچلا جاتا ہے۔ کسان پسا جاتا ہے اور عملاً ؟

پھوٹا کئے پیالے، لنڈھتا پھرا قرابا ‏ ‏ مستی میں اپنی یاں تھا اک شور اور شرابا

(میر)

بقول ملٹن: "Licence they mean when they cry for liberty" (چلاتے ہیں آزادی کے لئے اور مقصود ہے کھل کھیلنا)

ایک گمنام شاعر کہتا ہے۔ قطعہ

شاہدِ مدہوش مقابل، ہاتھ میں جامِ شراب ‏ ‏ گوش مطرب کی نوا پر، لب پہ نامِ انقلاب

نفس کے بندے کہاں، تعمیرِ عصرِ نو کہاں، ‏ ‏ کچھ نہیں ابلہ فریبی کے سوا تعبیرِ خواب

جو ادیب یا شاعر اپنے ملک کی سیاسی و تمدنی ضروریات و مشکلات کو سمجھنے اور ان سے پیدا شدہ مسائل کا حل یہاں کے حالات کو پیشِ نظر رکھنے کے عوض دوسرے ملکوں سے دریوزہ کئے ہوئے بلکہ پس خوردہ خیالات کی روشنی میں سوچتے ہیں، جن کے ذہن میں تخریب کے سوا تعمیر کا تصور ہی نہیں۔ جو یہ غور نہیں کرتے کہ مزدوروں اور کسانوں کے "گونگے قہر" کو ان کی تربیت بغیر سنکارنے اور للکارنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ عجب نہیں جو ایک دن یہ شعر پڑھیں ؎

تلوار اٹھی ہوئی ہے چمن کی ہوا نہیں
گلگشت ہو چکی سر و گردن بچائیے

اسی درجے میں بلکہ اس سے بھی بدتر وہ دوسری عیش پسند، نفس پرست اور دولت کے

نشے میں مست جماعت ہے۔ جسے اپنا دوزخ پاٹنے کے سوا دوسرا کام نہیں۔ جو منشائے حیات اور دولت کے صحیح مصرف سے بے خبر اور اس حقیقت سے ناآشنا ہے کہ :-

شیرازہ قوم کا ہے ہر فرد قوم، یعنی
زنجیر کی ہے طاقت زنجیر کی کڑی میں

اور زنجیر دراصل اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے جتنی اس کی سب سے مضبوط کڑی۔ کمزور کڑیوں (پست اور مفلوک الحال افراد یا جماعتوں) کو مستحکم نہ بنانا۔ اور سماجی زنجیر کو پائیدار سمجھنا سفاہت و خود فریبی کی انتہا ہے۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ دولت کی تقسیم غیر مساوی و نامنصفانہ ہے، اس کا تدارک لازم ہے۔ کیجئے اور ضرور کیجئے۔ کوئی سیاسی جماعت یا پارٹی ایسی نہیں جو مزدور اور کسان کی حالت سدھارنے کی خواہشمند نہ ہو۔ ایسی صورت میں اگر تمام پارٹیاں متحد ہوکر سچے دل سے اس کام کا بیڑا اٹھائیں تو کامیابی یقینی ہے۔ مگر ہو کیا رہا ہے؟ بساطِ سیاست پر ایک طرف سرمایہ دار اور دوسری طرف مزدور شطرنج کے مہرے بنے ہوئے ہیں اور ان کے بل بوتے پر سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو مات دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں۔ اُدھر تعلیم گاہوں میں نئے نئے کھلاڑی پر پرزے نکال رہے ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے مہیب طوفانوں اور سیاہ و سرخ آندھیوں کے جھکڑ کا بھی خوف دلایا ہے مگر یہ ہدایت نہیں فرمائی کہ اُن کے کھُردرے رقص میں شریک ہوکر تال پر تال دی جائے اور لَے سے لَے ملائی جائے۔ یا سینہ تان کر مقابلہ کیا جائے اس تمام محنت وجد وجہد و جانکاہی کا صلہ ہے؟

"ایک قلیل عرصہ کے بعد ہی نہ اردو کو سرکاری زبان بننے کا اصرار ہوگا
نہ آپ کو اس کے سرکاری زبان قرار نہ دئے جانے کا افسوس ہوگا۔
اردو ہی باقی رہے گی اور اردو ہی سے حکومت کو اپنے کاموں میں مجبوراً

مدد لینی پڑے گی۔"

اور میرا خیال ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی ــــ نہ ہوگا بانس، نہ بجے گی بانسری۔"

اپنے مضمون کی تمہید میں جناب موصوف نے میر و سودا سے لے کر غالب و حالی و اقبال تک سب کا مضحکہ اُڑایا ہے یا منقصت کی ہے۔ اور ہدایت فرمائی ہے کہ جوش اور ان کے چیلے چاپڑوں کا اتباع کرو۔ جنہوں نے (جوش نے) شاعری میں "ہیجان و اضطراب اور اُمنڈتے ہوئے طوفانوں کی سانسیں شامل کر دی ہیں۔"
کیا تماشا ہے کہ اس دَورِ آزادی میں بھی اپنے لئے کوئی راہ نہ نکالو۔ بلکہ اندھوں کی طرح جوش صاحب کے عصائے شاعری کا سہارا لے کر راستہ ٹٹولو اور ناپو وہ شاعری میں خدا کا مضحکہ اُڑاتے، مذاہب کی تحقیر کرتے اور Bacchus (شراب کا دیوتا) کا پیالہ چڑھائے ہوئے ہیں۔ تم بھی بے غل و غش لنڈھاؤ۔ وہ فاتر العقل اور تھالی کے بینگن نیطشے (Nietzsche) کو اپنا مربی و سرپرست جانتے ہیں۔ اور اس پر ایمان لائے ہیں۔ تم بھی نیطشے کی قبر پر عقیدت کے پھول چڑھاؤ۔ ان کے مرتب کردہ "پروگرام" پر عامل ہو۔ یونانی ابیقورس (Epicurus) کا فلسفہ سمجھے بغیر اس کے ہمنوا ہو کر یہ تو کہو کہ :۔

"اَیُّہَا النّاس خوب عیش کرو — اس سے پہلے کہ گُل ہو شمعِ حیات
کس کو معلوم ہے کہ کل کیا ہو — حالتِ زِیست کیا ہے بعدِ ممات"

مگر یہ نہ کہو :۔

بند ہیں ان کے دیدۂ بینا — مستقل عارضی کو سمجھا ہے
آنکھیں ہیں دیکھنا نہیں آتا — جو بُرا ہے نظر میں اچھا ہے

اپنی تکذیب آپ کرتے ھیں — نفس کی خواہشوں کے ہوکے غلام
اپنی تخریب آپ کرتے ھیں — روح کو دے کے بے حسی کا پیام

ایک طرف جناب موصوف اردو کو ورطۂ ہلاکت میں دکھاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی اعتراف ہے کہ :۔

"جب سرکاری زبان فارسی تھی، اردو زبان بنی اور پھلی پھولی پھر سرکاری زبان انگریزی ہوئی اس وقت بھی اردو کی ترقی مسدود نہ ہوئی"۔

کوئی پوچھے کہ جب قدما و متاخرین کے ہفوات اور مقتضائے وقت نیز زمانے اور زمانے کے رجحانات سے بیگانگی، بے پروائی یا عدم واقفیت کے باوصف اردو پنپتی رہی، جب سودا و میر و غالب و حالی و اقبال کی ماورائی یا پست و افسردہ و سرد و خنک شاعری اردو کا کچھ بگاڑ نہ سکی۔ تو اب جوش سے جواں مرد و جواں سال و شیر دل شاعر اور اُن کے جیش در جیش متبعین کی موجودگی میں اردو کو خطرہ کیونکر لاحق ہوگیا جب ایسے ایسے وقت کے نبض شناس اردو کی پرداخت اور پشت پناہی پر کمربستہ اور کیل کانٹے سے لیس ہیں تو کیا خطرے کی لال جھنڈی دکھانا غلط سگنل (Wrong) نہیں ہے ؟

مبادا غلط فہمی پیدا ہو ایک امر کا اعلان ضروری ہے۔ جوش میرے دوست اور بھائی سے زیادہ عزیز ہیں۔ اور میں اُن کی شاعری کا چند مستثنیات کے علاوہ اور اختلاف خیالات کے باوجود ایک مدت سے معترف ہوں۔ انسان کی حیثیت سے بھی اس رندِ صفا کیش کے کردار کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو اندھیرے میں لعل شب چراغ کی طرح ضو دیتے ہیں۔ میرا دعوٰے ہے کہ جوش کو پیشوا بنانے والے اور اس کی آڑ میں اپنی ہرزہ سرائی کا ڈھنڈورہ پیٹنے والے اور جواز ڈھونڈنے والے اس کی منظومات سے ایک مصرعہ بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے جس میں گندگی، عریانی یا فحاشی ہو، یا اخلاق و

سوقیت وابتذال ہو (البتہ کہیں کہیں ظرافت یا طنز کی چشمک ملے گی) نظم کی ہیئت کے لحاظ سے تو وہ یکسر قدامت پسند ہیں۔ وہ صنف غزل کے مخالف ہیں مگر ایسی غزل کے جس میں تسلسلِ خیال و ہم آہنگی کے بجائے انتشار و پاشیدگی ہو۔ ورنہ ان کے اکثر منظومات میں غزل جلوہ گر ہے۔

معاف کیا جاؤں اگر لگے ہاتھوں کچھ اپنے متعلق بھی کہہ دوں۔ میں کسی سیاسی جماعت میں نہ کبھی شریک تھا نہ اب شریک ہوں۔ فتنہ و فساد، فرقہ وارانہ یا سرمایہ دارانہ تشدد کا، ہر جبر و استبداد اور اقتدار پسندی کا مخالف تھا اور مخالف ہوں۔ اتحاد و یکجہتی کا مذہب کی طرح احترام کرتا ہوں۔ پُر امن جمہوریت کو جو سب کے حقوق مساوی تسلیم کرے اور سب کے لئے یکساں ترقی و فلاح و بہبود کے مواقع مہیا کرے۔ ہر دوسرے نظامِ حکومت سے فائق سمجھتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ دولت کی تقسیم غیر مساوی ہے اور اصلاح کی فوری اور سخت ضرورت ہے۔ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ :-

قصر و مکان و منزل ایکوں کو سب جگہ ہے
ایکوں کو جا نہیں ہے (دنیا عجب جگہ ہے) (میر)

اسی کے ساتھ ان لوگوں کو محب وطن سمجھا ہوں نہ سمجھوں گا جو "چندیں شکل برائے اکل" کے مصداق ہیں۔ جو کہتے ہیں کچھ کرتے کچھ ہیں ؎

میرے مشرب میں ریاکاری سے بدتر کچھ نہیں
یوں تو جو انسان ہے وہ معصیت آلودہ ہے

میرا خیال ہے کہ جو خود اپنے اختیار کیے ہوئے یا قائم کیے ہوئے اصولوں پر نہ چلے اسے کسی طبقے کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں۔ نہ میں ایسوں کا ہمنوا ہو سکتا ہوں جو شاعر کی فطرت آزاد کو ایک خاص ڈگر پر لگانے اور گنے چنے موضوعات کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی فضا میں سوائے گھِس گھِس اور دانتا کِلکِل کے کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور کسی جذبۂ لطیف کا نشو و نما

یا علوئے پرواز دشوار ہے۔ واقعات و مشاہدات و معتقدات کا سیاسی ہوں یا غیر سیاسی وجدان و تاثر کے تحت قالب شعر و نغمہ میں ڈھل جانا دوسری چیز ہے اور ایسے مسائل کو نثر کے بدلے ایسی نظم کی شکل دے دینا جس کی اونٹ کی طرح کوئی کل سیدھی نہ ہو دوسری چیز ہے۔ یہی دشمن ہوں تو ایسی شاعری کا (قدیم ہو کہ جدید) جس میں عریانی و فحاشی، آوارگی و مطلق العنانی کی ترغیب یا تعلیم ہے۔ بیزار ہوں تو ایسی شاعری سے جو بچوں کی بانی سے آگے نہیں بڑھتی۔

فاضل مضمون نگار نے ان شاعروں کو جو "نیا ترقی پسند ادب" کا بِلّا نہیں لگائے ہیں "حقیقی اور تعمیری محبوب" کے بدلے "شاہدِ بے معنیٰ" کی پرستش سے متہم کیا ہے۔ میرے نزدیک شاہدِ بے معنی کو اُن کے "حقیقی" (حقیقی نہ معلوم کس رشتے کی بنا پر کہا گیا ہے) اور "تعمیری محبوب" پر جو "ابوالہول" کا زائیدہ معلوم ہوتا ہے افضلیت ہے کیونکہ شاہدِ بے معنیٰ کی پرستش غلاظت اور گندگی کی پوجا سے ہر حال میں بہتر ہے۔ شاید جناب موصوف کو اس ناقابلِ تردید حقیقت کا علم نہیں کہ جو قوم اپنی ادبی میراث کی قدر یا پروا نہیں کرتی، کلچر سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس میں ادبی پیداوار (صحیح معنیٰ میں ادبی پیداوار) بند ہو جاتی ہے اور ترقی کا دروازہ تیغا ہو جاتا ہے، وہ شاید اس حقیقت سے بھی آگاہ نہیں کہ ناقد میں اتنی وسعتِ نظر ہونا چاہیئے کہ ماضی کو ماضی ہی میں نہیں بلکہ حال میں بھی دیکھ سکے۔ بغیر اس کے وہ حال سے کماحقہٗ آگاہ نہیں ہو سکتا اور معقول ترجمانی نہیں کر سکتا مستقبل کی تعبیر تو بعد کی باتیں ہیں۔

میری رائے ہے کہ ڈی کوئنسی (De quincey) کی طرح ادب کو دوبارہ اس طرح تقسیم کر دینا چاہیئے۔

۱۔ بر بنائے افادیت (Literature of Knowledge)

۲۔ بر بنائے جذباتیت (Literature of Power)

یہی صحیح مفہوم ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کا ہے مگر یہ اصطلاحیں غلط استعمال ہوتے ہوتے نکمی اور گمراہ کن ہو گئی ہیں۔ شاعر (اگر حقیقی معنوں میں شاعر ہے) کسی موضوع پر قلم اُٹھا ہی نہیں سکتا جب تک اس سے متاثر نہ ہو اور متاثر ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ موضوع کسی نہ کسی نہج سے اس کی زندگی سے مربوط و ہم آہنگ نہ ہو۔ اور اس میں خود شاعر کے انفرادی نقطۂ نظر کی جھلک نہ ہو۔ دونوں اقسام کی شاعری میں صرف زاویۂ نگاہ کا فرق رہے گا۔ یعنی جو کچھ کہا گیا اس میں واقعات کو اہمیت دی گئی ہے یا جذبات کو۔ مگر کسی قسم کی شاعری ہو مقدم یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ پیش کیا گیا ادب ہے یا بلا و غما۔

ڈی کوئنسی کے خیالات کو ذرا وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"سماجی نظام کے اس عظیم ودیعت کدے میں جسے ہم مجموعی حیثیت سے لٹریچر کہتے ہیں، دو فرائض الگ الگ وجہ امتیاز ہوتے ہیں۔ یہ دونوں فرائض مل سکتے ہیں بلکہ اکثر مل جاتے ہیں۔ تاہم ان کی سختی سے حد بندی ہو سکتی ہے اور ان میں ایک دوسرے کو پیچھے ڈھکیلنے (Repulsion) کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے۔ اوّلاً وہ ادب ہے جس کا منصب معلومات بہم پہنچانا ہے Literature of Knowledge ثانیاً وہ ادب ہے جس میں (بذاتہٖ) توانائی ہے۔ یعنی Literatur of Power اوّل الذکر ادب کا کام سکھانا ہے To teach۔ مؤخر الذکر کا منصب اثر اندازی ہے۔ To move۔ پہلا مثل آلہ جہاز رانی Rudder کے ہے۔ اور دوسرے کی مثال پتوار یا بادبان (Oar or sail

کی ہے۔ پہلا محض افہام و تفہیم (Under Standing)
سے وابستہ ہے۔ دوسرے میں امکان ہے کہ آخر کار بلند تر شعور یا
ادراک کو اپنی طرف متوجہ کرے۔"

یہی بنیادی امتیاز ہے جس سے نگارشات کی تفریق کی جاتی ہے۔ ایک تو وہ ادب ہوا۔ جس کا مقصد افادی (Didactic) ہے اور دوسرا وہ ادب ہوا جس کا اس سے باہر کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اور جو صرف جمالیاتی (Aesthetic) اصول سے جانچا جاسکتا ہے۔ پہلی قسم کے تحت وہ سب کتابیں آجاتی ہیں جن سے ہماری واقفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یا جو کسی بات کو ثابت کرنا یا ہم سے منوانا چاہتی ہیں۔ مثلاً کتب تاریخ و منطق و فلسفہ و سائنس و معاشیات و اقتصادیات وغیرہ ادبی تنقید کے اصول ان پر منطبق نہیں ہوسکتے۔ بلکہ ان کا انتقاد سائنٹیفک یا فلسفیانہ ہوگا۔ جس میں بیان کردہ اقوال یا دعاوی کی صحت اور پیش کردہ مباحث کے جواز یا متعلق یا غیر متعلق ہونے پر رائے زنی کی جائے گی۔

یہ صرف دوسری قسم کا لٹریچر (Literature of Power) ہے جو ادبی تنقید کا مقصود ہے۔ اس کا تعلق فنون لطیفہ (Fine Arts) سے ہے۔ شاعری، ڈرامے، افسانے جب ان کا اظہار صناعانہ ہو افادی ادب کی طرح صحیح یا غلط ثابت نہیں کئے جاسکتے۔ منطق ان کی بیخ کنی نہیں کرسکتی۔ وہ خود اپنے قوانین کے تابع ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لئے دلائل و براہین کی نہیں بلکہ ذوق و وجدان، قوت متخیلہ اور جمالیاتی احساس (Intuition imagination and aesthetic sense.) درکار ہیں۔ دونوں قسم کے ادبیات کا تعلق راستی سے ممکن ہے۔ لیکن راستی تک پہنچنے کے لئے طریقے مختلف ہیں۔ پہلے میں بصیرت (Intintion) اور دوسرے میں ذوق (Judgment)

رہنما ہوتا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ بہت کم کتابیں ایسی ہیں جو خالص افادی یا خالص جمالیاتی ہوں۔ ایسی حالت میں جو حصہ جس سے مخصوص ہو اس کو بربنائے افادیت یا ادبیت جانچنا ہوگا۔"

(آر۔ اے سکاٹ جیمس)

ادب کیا ہے؟ اس کے متعلق نہ معلوم کتنے متضاد اقوال ہیں۔ لیکن اس امر پر عموماً اتفاق آرا ہے کہ حقیقی ادب میں محض بیان جذبات و واقعات نہیں ہوتا بلکہ ان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاعر کی تخئیل اس کے تجربات و مشاہدات و محسوسات کو اپنے سانچے میں ڈھال کر ضروری تراش و خراش یا حک و اضافت کے بعد از سر نو ترتیب دے کر پیش کرتی ہے۔ اسی میں شعر و ادب کی دلکشی کا راز ہے، یہی اس کی امتیازی شان ہے۔ اسی بنا پر ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی۔ اس کا منشائے اولین دماغی و روحانی انبساط و اہتزاز مہیا کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں مگر جہاں تک غور کرتا ہوں ادب برائے زندگی کے بھی کسی مبلغ نے اس مقصد شاعری سے انکار نہیں کیا ہے۔ اختلاف ہے تو اس باب میں، کہ یہ ابتہاج ادب کا مقصود بالذات ہو یا اس کو ثانوی حیثیت دی جائے اور افادیت کو مقدم سمجھا جائے۔ ادب برائے ادب موضوع سے زیادہ لطافت خیال و رعنائی ادا کو اہمیت دیتا ہے۔ ادب برائے زندگی موضوع کی حیات سے وابستگی پر (فن کارانہ ترجمانی سے زیادہ) زور دیتا ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجیے تو محض نزاع لفظی ہے۔ ہم نے میتھو آرنلڈ کا یہ قول توتے کی طرح رٹ لیا ہے کہ ادب تنقید حیات ہے مگر جو شرط اس نے اضافہ کی ہے اسے یا تو بھلا دیا یا عمداً نظر انداز کر دیا کہ ایسی تنقید اصول حسن و صداقت کی تابع ہونا چاہیے۔ یہ شرط ملحوظ رہے تو ہماری "زندگی کی ترجمان شاعری" کا ایک معتد بہ حصہ دھواں بن کے اڑ جائے۔ یا زندگی کا دائرہ تنگ ہو کر چند "مفید" عنوانات میں مقید ہو جائے۔ تنوع ہے بھی تو کاہے میں؟ سایوں اور پرچھائیوں میں! غالباً یہ مشغلہ دلچسپ ہو۔ اگر ترقی پسند ادب سے سایوں اور پرچھائیوں کے اقسام اور ان کے نمایاں

خصوصیات کا انتخاب کیا جائے۔ عجب نہیں کہ دماغ کے بُنے ہوئے جالے (COBWEBS) نظر کے سامنے آجائیں۔ خود تنقید حیات کے فقرے میں ترجمانی کا مفہوم مضمر ہے جو نقالی دعکاسی سے ماورا ہے۔

ہم نے شاعری کو تماشا یا کھلونا بنا دیا ہے۔ اور ہر قسم کی بکواس کو جسے ادب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں جس کا اگر کچھ مطلب ہے تو کسی خاص طبقے کی حمایت یا مخالفت میں پروپیگنڈا ہے ادب سمجھ لیا ہے۔ حقیقی اور مستقل اقدار ٹھکرائے جا رہے ہیں اور نوجوانوں کے بہکانے کو جن کی عقل ابھی پختہ نہیں ہوئی ہے نیز اقتصادی خلفشار میں مبتلا ہیں، ہر قسم کی آزادی و مطلق العنانی اور اپنی خواہشوں، حیوانی خواہشوں کی رَو میں بہنے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ماضی کی عظمت مٹانے کو اس کے سرمایۂ ادب، اس کے اخلاقی اقدار کی تحقیر کی جاتی یا مضحکہ اڑایا جاتا ہے۔ نازیبا اور بے بنیاد الزامات لگائے جاتے ہیں اور خود بدولت کے قوائے عمل کے اضمحلال کا یہ حال ہے کہ جب تک شاعری کی معجون نوش نہ فرمائیں ہاتھ پاؤں لوتھ رہتے ہیں۔ کوئی پوچھے کہ :-

کام کرنا ہے جنہیں کام کیا کرتے ہیں
مکتبِ شعر میں یا درس لیا کرتے ہیں

اگر مزدور اور کسان کو ان کی پستی سے بلندی کی طرف لانا ہے تو ان کی بیچارگی بیہودگی اور کمزوریوں کو ان کے منہ پر گنوانے کی بجائے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو جگائیے۔ ان کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے اُبھاریئے۔ آپ کا موجودہ طرز عمل تو ان میں یاس کی ٹھٹھر بھرتا اور نہ غم و غصہ کا شکار بناتا۔ اور بہیمیت و بربریت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

(۳)

ایک دوسرے صاحب کا مقالہ جس میں ادب کو تمدن کی روشنی میں جانچا

گیا ہے۔ دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ اس کی تمہید کچھ الجھی ہوئی ہے مگر غالباً ابتدائی سطور کا یہ مطلب ہے کہ ہر شے اپنے وجود کے تعین کے لئے ایک مدرک شخصیت (SENTIENT BEING) کی محتاج ہے ورنہ وجود اشیائے خارجی کا ہم کو علم نہ ہو۔ یہ فلسفہ برکلے (Berkely) سے منسوب ہے۔ وہ میر جسے قنوطی کہا جاتا ہے اس مسئلے کو یوں نظم کر گیا ہے :-

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

اسی فلسفے کی مزید تفصیل یہ ہے کہ بیرونی و خارجی اشیاء کے مطالعے کے بعد انسان خود اپنی ذات کے مشاہدے میں منہمک ہو جاتا ہے جو شاہد ہے وہی رفتہ رفتہ مشہود ہو جاتا ہے (Esse becomes percipe) پھر اسی میر کے ملہمانہ الفاظ ہیں :-

ہم اپنی سیر کرنے یاں جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

لہٰذا جناب موصوف کا یہ ارشاد برحق کہ حسن کا وجود بھی انسانی دماغی کاوشوں کا مرہونِ منت ہے۔ فلسفے کے ایک متعلم اور میر کے خوانِ تکلم کے زلہ ربا کی حیثیت سے آثر کے لئے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں :-

ڈھونڈتا پھرتا ہے کیا بزمِ جہاں میں بے خبر
حسن کہتے ہیں جسے اک نقشِ رنگیں دل میں ہے

جناب موصوف نے کروچے (Croche) کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ "ادب حسن ہے اور حسن ادب ہے" یہ درحقیقت کیٹس (Keats) کے نغمے کی صدائے بازگشت ہے کہ "راستی حسن ہے اور حسن راستی ہے"۔ کیٹس کا دوست لی ہنٹ (LEIGH HUNT)

کہہ گیا ہے کہ "شاعری جذبات صداقت وحسن واقتدار کا والہانہ اظہار ہے۔" یہ بھی کسی مفکر کا قول ہے کہ "شاعری کا منشا تواجد کے ذریعے سے انسانیت کا علو تہذیب اور تربیت ہے۔" یہی ادب کا حقیقی افادی پہلو ہے جسے مریدانِ ادب برائے زندگی سمجھنا کیسا، سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زندگی کے مادّی تقاضوں کو زندگی سمجھ کر اسی کے چکّر میں پڑ گئے ہیں اور اُن الوہی صفات کو جو انسان کے عز وشرف وامتیاز وبرتری کا نمونہ ہیں۔ یکلخت فراموش کر دیا ہے۔ اشتراکیت کے مبلغ ادیبوں کا یہ فرض ہے یا ہونا چاہیئے کہ اپنے آلہ کار مزدوروں کی تعلیم و تربیت اور ذہنی نشوونما کی طرف متوجہ ہوں۔ ان میں صناعانہ مزاج واحساس پیدا کریں تاکہ فنونِ لطیفہ سے تکیّف ہونے اور مناظر قدرت کی رعنائیوں میں تھوڑی دیر کے لئے گُم ہو جانے کی صلاحیت پیدا ہو اور ان ادبائے کرام کا کلامِ بلاغت نظام سمجھ سکیں۔ مزدور جو "عطش زارِ جسم وروح" ہے اس کی بدحالی کے ساتھ اس کی روح کی تشنگی وافلاس دور کرنے کا سامان فراہم کیجیئے۔ اس کی نیک صلاحیتوں کو اُبھاریئے۔ اگر مزدور کو اچھا شہری یا کامریڈ بنانا ہے تو اس کے ننگ انام ہونے اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے بدلے اسے غیرت دلا کر اپنی عزت آپ کرنا سکھایئے۔ بلند کو پستیوں کی طرف گھسیٹنے کے عوض جو پست ہیں، اُن کو بلند کیجیئے۔ انسان بنایئے۔ ورنہ یاد رکھئے کہ سرکس کا کھیل ختم ہونے پر جو عفریت آپ ڈھال رہے ہیں ان کے چنگل سے آپ بھی محفوظ نہ رہیں گے۔ آپ روس اور چین میں اشتراکیت کی کامیابی پر بغلیں بجاتے اور اسی حلقے میں ہندوستان کو لانا چاہتے ہیں۔ کیا روس اور چین کی طرح ہندوستانیوں کی کوئی مشترکہ زبان ہے؟ کیا یہاں بھی قومیت کا تصور عام اور قید مذہب و ملّت سے آزاد ہے؟ کیا یہاں بھی ملک یا وطن پر سب کچھ قربان کر دینے کا

جذبہ کارفرما ہے؟ کیا یہاں بھی فرض کے معنیٰ کوئی سمجھتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو آپ کی مساعی کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ جواب میں ایک پولش ڈرامے کے ترجمے کا اقتباس پیش کرنے کی جرأت کروں گا۔

" رقاصۂ دہر اپنے مقررہ حلقے میں گردش کر رہی ہے، بازیگر آتے، غائب ہوتے اور پھر نمودار ہوتے ہیں۔ وہ سب کو تگنی کا ناچ نچاتی ہے۔ یہاں تک کہ سڑکوں پر خون کے چھڑکاؤ سے پھسلن ہو جاتی ہے اور وہ گر پڑتے ہیں۔ یہ رقص مرگ آٹھ پہر جاری ہے۔ خون! ہر جگہ خون! نئے انسان مستی حلقے میں داخل ہوتے ہیں۔ خون کا سیلاب آتا ہے۔ دنیا رنگین ہو جاتی ہے۔ میں سچ کہتا ہوں!"

(ہلاک فریب)

موجودہ دور آزادی میں بھی بہت کم اشخاص ہیں جنہیں اُن ذمہ داریوں کا احساس ہو، جو آزادی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ آپ کی مزعومہ آزادی تو نہ معلوم کیا کیا گُل کھلائے گی....

نفسیات کی روشنی میں دیکھیے تو فیکٹری کا بندھا ٹکا کام، روزمرہ وہی چرخا ناندھنا مزدور کو بے حس بنا دیتا ہے۔ غریب مزدور، مشین سے جکڑا ہوا مزدور سوائے جھٹکوں اور جھناٹوں کے اور کچھ محسوس نہیں کرتا۔ اس کی آنکھیں اور اس کا دماغ تیزی سے گردش کرنے والے آلات اور ان کے بھراٹوں میں کھو جاتے ہیں۔ یہ حالت معاشی بدحالی و ناداری سے زیادہ افسوسناک ہے۔ کیونکہ نوجوانوں کے ولولوں، اُبھرنے کے شوق، ہمت، فراخدلی، اور وسیع النظری کے انسانی اوصاف کا گلا گھونٹ کر ان امیدوں کا خون کر دیتی

ہے جو فیکٹری میں داخلہ کی محرک ہوئی تھیں۔ جب دیکھو ایک پہیہ گھمانا' یا
کوئی ہتھا یا لیور دبانا! طبیعت اوب جاتی ہے اور ترقی و غور و فکر کی صلاحیتیں
فنا ہو جاتی ہیں۔ تلخ کامی اُن کی روح میں تیزاب کی طرح سرایت کر جاتی ہے
نفرت و بیزاری کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں۔ اور ان کو سماجی یا قومی مخالفت
و مقاومت کے لئے مستعد کر دیتے ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے ورغلائے جا سکتے
ہیں' ان لوگوں کو ہر قسم کے جمالیاتی احساس نیز جذبۂ رحم و آزادیٔ خیال و
عمل سے مغائرت ہو جاتی ہے۔ بدی و بدکاری کے جراثیم پرورش پاتے رہتے
ہیں کتنے آزادی کے نعرے لگانے والوں اور مزدوروں کے حامیوں نے مسئلے
کے اس پہلو پر غور کیا اور اُن بُرائیوں کو دفع کرنے کی طرف توجہ کی۔ بلکہ اس
کے برعکس مزدوروں کے کردار کی خشونت سے فائدہ اُٹھا کر ان کو قوت و
اقتدار و حکومت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا۔ آئے دن کی ہڑتالیں' لوٹ مار
ریلیں اُلٹنے کا مشغلہ' بم کے دھماکے اور نہ معلوم کیا کیا اسی طرزِ عمل کے
غماز ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس راستی کو بھلا دیا گیا ؎

زندگی تقسیم ہو کر زندگی رہتی نہیں
اس کی وحدت کو سمجھنا اور سمجھانا بھی ہو

یہاں زندگی کی بجائے ہر فیکٹری یا کارخانہ ایک اکائی مان لیا گیا اور عام
جمہوری اصول سے مستثنیٰ سمجھ لیا گیا ہے۔ اور اس پیچیدہ مسئلہ کو جمہوریت
کی روشنی میں حل کرنے کی سعی نہیں کی گئی۔ بلکہ مل کے مالکوں اور مل میں کام
کرنے والوں کے مابین مفاہمت کی تدبیریں سوچی گئیں۔ نتیجہ ظاہر ہے
گتھیاں سلجھنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ بلکہ پھندے بڑھتے اور کستے جاتے
ہیں۔ جہاں دیکھئے ؎

ہنگامہ خودی کا برپا ہے
غوغا نفسی نفسی کا ہے

بھلا مزدور کی ذہنی پرداخت کا خیال کون کرے اور زندگی کی کلچرل نعمتوں سے مستفید ہونے کے مواقع کون مہیا کرے۔ تاکہ اپنی ہستی کے مختلف پہلوؤں اور ذمہ داریوں پر مشین سے الگ بھی غور کر سکے۔ اچھا صاحب

خواب بنئے، خوب بنئے لیکن اتنا سوچئے
ان میں ہے تانا ہی تانا یا کہیں بانا بھی ہے

میں اپنی دُھن میں نفس مضمون سے دور نہ ہوتے ہوئے بھی دور ہو گیا۔

کروچے کا یہ تجربہ بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ ادب یا حُسن اپنے خارجی وجود سے پہلے انسان کے باطن میں وجود اختیار کر لیتا ہے۔ مگر اس سے فاضل مضمون نگار کا یہ استنباط سمجھنے سے قاصر ہوں کہ "جب حُسن اپنے وجود کے لئے انسان کے اندرونی جمالیاتی تجربہ کا محتاج ہے تو حُسن برائے حُسن نہیں ہو سکتا۔ اور اگر حُسن برائے حُسن کا نظریہ دُرست نہیں تو ادب برائے ادب کا نظریہ بھی گمراہ کُن اور اصولِ فطرت کے خلاف ہے۔" جب ادب اور حُسن دونوں کا وجود انسان کے جمالیاتی احساس (Aesthetic feeling) کا پروردہ ہے اور ادب و حسن لازم و ملزوم ہیں (ادب حُسن کی تخلیق اور نقاب کشائی کرتا ہے اور حُسن ادب میں اپنی سرشاریاں بھر دیتا ہے) تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس شاعر یا ادیب میں جمالیاتی احساس ودیعت ہے اس کے بیانِ حُسن سے حُسنِ بیان کی کرنیں نہ پھوٹیں؟ یہ مانتے ہوئے کہ حُسن کسی چیز کی صفت نہیں بلکہ محض تصوّر (Abstraction) ہے۔ یا مقالہ نگار کے الفاظ میں اندرونی عمل سے وجود میں آتا ہے۔ اور یہ اندرونی روحانی عمل کسی شخص کا

جمالیاتی تجربہ ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ ایسے تجربے کے بیان میں حسنِ ادب کا متحدہ ظہور نہ ہو۔ بلکہ اس طریقِ استدلال سے تو نتیجہ ادب برائے ادب کے مفید مطلب نکلتا ہے۔ جب ادب حسن ہے اور حسن ادب ہے اور دونوں کا نقطۂ اتصال انسان کا جمالیاتی احساس ہے تو حسن برائے حسن یا ادب برائے ادب کا نظریہ غلط کیوں ہو اور یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ ایسے ادب میں زندگی کی ترجمانی نہ ہوگی۔

دراصل فاضل مقالہ نگار کی زبردست ستم ظریفی یہ ہے کہ ادب برائے ادب کی تردید اور ادب برائے زندگی کی تائید میں کروچے کا سہارا ڈھونڈا۔ حالانکہ یہ اطالوی فلسفی و ماہرِ جمالیات کیٹس اور والٹر پیٹر (Walter Pater) کی طرح حسن کو ادب کا مقصود بالذات قرار دیتا ہے۔ اور Aesthetic transcendentalism جمالیاتی ماورائیت کا مبلغ ہے اور آرٹ یا ادب کو ایسا وجدانی تجزیہ کہتا ہے: جو آپ اپنی غایت ہے، دیکھیے۔ ابھی ادب برائے زندگی کا پرچار کیا کیا سوانگ بھرتا اور روپ دھارتا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کروچے کا مہرہ ٹھیک نہیں بیٹھا۔

یہ عرض کر دوں کہ میں نے اس کروچے سے بحث کی ہے جس کا خلاق مقالہ نگار کا دماغ ہے ورنہ کروچے کے نزدیک آرٹ ابھی تک آرٹ ہے کہ آرٹسٹ کے نہاں خانۂ دل میں ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"The work of art is always Internal, and that which is called External is no longer a work of art."

(ادبی تخلیق (جمالیاتی) ہمیشہ اندرونی عمل ہے۔ جو کچھ بیرونی ہے (یعنی اندرونی

تخلیق کا اظہار ہے) اس کی حیثیت آرٹ کی نہیں رہتی)

ان مدعیانِ ادب برائے زندگی سے کون کہے کہ اگر حُسن و عشق اور اُن کے متعلقہ واردات و کیفیات و مناظرِ فطرت اور ان کی رعنائیاں حقائقِ حیات سے خارج نہیں ہیں۔ اگر عشق وسیع ترین معنیٰ میں تلاشِ حُسن ہے تو اُن کے احوال و آثار بیان کرنے والا اگر لطافت و صداقت سے بیگانگی نہ برتے، تو ویسا ہی ترجمان و مفسّرِ حیات ہے۔ جیسا دیگر مسائلِ حیات پر بحث کرنیوالا جن کی نوعیت معاشی، تمدّنی یا سیاسی ہے۔

ادب برائے زندگی کے وہ علمبردار جو ادب کو چند وقتی مسائل کے بیان تک محدود کر دیتے ہیں یا ادب سے پروپیگنڈا کا کام لیتے ہیں اپنے لئے ایسی دشواریاں پیدا کرتے ہیں جن پر قابو پانے کے اہل نہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں سائے مرتعش ہیں، پرچھائیاں کٹھ پتلیوں کا تماشہ دکھاتی ہیں، گندگی اپنی عفونت پھیلاتی ہے جمالیاتی رنگ قائم رکھنا آسان نہیں۔ یہ فاضل مقالہ نگار کو بھی تسلیم ہے کہ ادب نہ صرف حُسن ہے بلکہ انسان کے جمالیاتی تجربات کی تخلیق ہے۔ لہٰذا اگر خیال کے ساتھ اظہارِ خیال میں رعنائی نہیں بلکہ خطابت کی ہنکار یا عفریت کی ڈکار ہے تو اس کو ادب کہنا ادب کا مذاق اُڑانا ہے۔

جناب موصوف فرماتے ہیں کہ ادب برائے زندگی فلسفۂ حیات (نہ کہ حیات!) کی ترجمانی کرتا ہے۔ کیسا اچھا ہوتا کہ وہ اسی کے ساتھ حیات کا مفہوم بھی متعین کر دیتے۔ اور پھر فیصلہ کرتے کہ ان کا ادب زندگی کی کس شاہراہ پر گامزن ہے اور اس نے حیات کو نزہت و نورانیت بخشنے کے عوض کس قدر کثیف و تیرہ و تار بنا دیا ہے۔

قابلِ احترام مستثنیات ہر قسم کی شاعری میں ہوتے ہیں اور ادب برائے

زندگی کے موئید شاعروں میں بھی ہیں جن کو داد دینے میں میں نے کبھی بخل نہیں کیا ہے لیکن گندہ ادب، عریاں ادب، حسن و صداقت سے خالی ادب، اخلاق و اطوار و شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر کھل کھیلنے کی ترغیب دینے والا ادب، بہیمیت و بربریت کی طرف دھکیلنے والا ادب قدیم ہو یا جدید اور اس کا نعرہ ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی - ایک لعنت ہے پھٹکار ہے اور اس کو ترویج دینے والا رسکن (Ruskin) کے اس تازیانے کا مستحق :-

"کہر اور دھندلکے کے سپوت پوت. ایسا بادل جس میں بوند پانی نہیں. بدبودار بخارات اور کھال کے خول جس میں نہ تو خون ہے نہ گوشت ایسا ہوا بھرا بین باجا (Bag - Pipe) جس پر شیاطین اپنی نوا میں زندگی کے کرتب دکھاتے ہیں. جو خود خبیث ہیں اور دوسروں کو خباثت سکھاتے ہیں. جو اس متعفن گیس سے ابھرے ہوئے ہیں. جسے ہر سانس کے ساتھ اپنے اندر کھینچتے ہیں....."

ان کے ہتھکنڈوں سے شاعری ایک ایسی صداقت بن جاتی ہے جس پر متعدد پٹیاں لپٹی ہوئی ہیں. بے چاری نہ تو کسمسا سکتی ہے نہ مچل سکتی ہے نہ ہاتھ پاؤں مار سکتی ہے. مصری ممی (mummy) کی طرح مجبور اور حفاظتِ خود اختیاری سے معذور ہے. پٹیوں کے خول اُتارتے چلے جایئے. صداقت سکڑتی اور چھوٹی ہوتی چلی جائے گی. لیکن چہرہ مہرہ نظر آنے لگے گا. جسے پہلے کہیں نہ کہیں دیکھ چکے ہیں. آخرکار جب یہ ننگی بوچی صداقت خرگوش کی طرح چوکڑیاں بھرتی بھاگے گی. تو اندازہ ہو گا کہ یہ تو

وہی ننھی منی بی صاحبہ ہیں جنہیں ایک مدت سے بازاروں میں دیکھتے
رہے ہیں۔"

ایک مختصر اقتباس والٹر سیوج لینڈور (Walter Savage Landowr)
کے یہاں سے بھی حاضر ہے۔

"ان کی شاعری میں پارٹی بندی کے ایسے انجرے اونٹ رہے
ہیں جو خود پسندی کی عفونت پھیلانے والی ڈکاریں بن کر
خارج ہوتے ہیں۔"

گوئٹے کا فیصلہ بھی سُن لیجئے۔

"اجسام جو ابھی زندہ ہیں مگر سڑ رہے ہیں اور اپنے گلنے کے تفصیلی
مشاہدے سے خوش ہوتے ہیں۔ ایسی لاشیں جو دنیا میں صرف اس
لئے مقیم ہیں کہ دوسروں کو تباہ ہوتے دیکھیں اور اپنی نمونۂ
مرگ زندگی کے لئے ان کی زندگی سے کسبِ توانائی کریں....
یہ نوبت پہنچی ہے ہمارے خلاقانِ ادب کی!"

یونان کا قدیم حکیم افلاطون کہتا ہے:-

"جو عقل اور نیکی سے بے بہرہ ہیں جو شراب خواری و بدمستی
اور ایسے ہی بیہودہ مشاغل میں لگے رہتے ہیں۔ وہ پستی کی
جانب گھسٹے جاتے ہیں اور اپنی زندگی اسی عالم میں بسر
کر دیتے ہیں۔ وہ راستی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے
وہ اپنا سر بلند ہی نہیں کرتے۔ کسی خالص اور مستقل
مسرت سے دوچار ہی نہیں ہوتے۔ بلکہ دام و دو کی طرح

پستی کی طرف مائل رہتے اور اپنی چراگاہوں میں گھومتے
پھرتے ہیں۔ وہ چرتے رہتے اور پھولتے جاتے ہیں، اپنی ذرّیت
بڑھاتے جاتے ہیں اور اپنی بہیمی خوشیوں کی کبھی نہ
تسکین پانے والی خواہشوں کی بہ جبر پذیرائی کے لئے
اپنے آہنی کھروں اور سینگوں سے برابر ہلاکت و خواری
پھیلاتے رہتے ہیں۔"

ممتاز شیریں

سیاست، ادیب اور ذہنی آزادی

جس چیز کے بنانے میں انسانی شعور کو دخل ہو وہ چیز صرف اپنی خاطر باقی نہیں رہتی۔ اس کا کچھ نہ کچھ مصرف ضرور نکل آتا ہے۔ اس لئے ادب برائے ادب کا فقرہ بہت ہی گمراہ کن ہے۔ ادب زندگی کے لئے ہوتا ہے اور اپنے سماجی پہلو کے بغیر زندگی کا تصور نامکمل ہے۔

سماج افراد کا مجموعہ ہے۔ جب کبھی سماج کی بہتری کا خیال ہمارے ذہن میں آتا ہے لامحالہ فرد کی بہتری کا خیال بھی ساتھ ہی ابھرتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ افراد کی حالت گری ہوئی رہے اور سماج بہتر کہلائے۔ سماج کو بہتر بنانے کی جدوجہد فرد کی آزاد نشو ونما اور ترقی ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ فرد کی آزادی ایک انصاف پرور معاشرہ کی تشکیل کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتی۔ بلکہ وجود ہی میں نہیں آسکتی۔ آج ہندو پاکستان میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہوگا جو اپنے معاشرہ کی بہتری کا خواہاں نہ ہو۔ اور اس مقصد کے لئے اپنے اپنے طریقے سے عمل پیرا نہ ہو لیکن یہ یاد رہے کہ ادیب کا کام دھڑے بندی اور افترا پردازی نہیں۔ سستے نعرے لگانا

اور گالی گلوچ پہ اُتر آنا نہیں۔ ادیب کا کام لکھنا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی یافت ہے اور ذہنی آزادی کے بغیر یہ کام سرانجام نہیں پا سکتا۔

اس دور میں ذہنی آزادی پر حملے دو طرف سے ہو رہے ہیں۔ حکومت کے احتساب کا خوف تو ہے ہی، وہ جس خیال پر چاہے پابندی لگا دے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان میں تین چار افراد نے با اثر ذرائع اظہار پہ مکمل تملیک اور اجارہ داری قائم کر رکھی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس خیال کو کہ ان کی خوشنودی حاصل نہیں اظہار کا موقعہ نہیں ملتا۔ بالفرض محال اگر کسی طریقے سے ایک دبی سی آواز اُٹھائی بھی جائے، تو یہ ان کے ڈھنڈورے کے زور میں سنائی نہ دے سکے گی۔ اور دب کر رہ جائے گی۔ یہ حملے کی منفی نوعیت ہے۔

اب براہ راست ذہنی آزادی پہ حملہ ایک اور طرف سے ہو رہا ہے۔ اس گروہ کے افراد دُہائی تو عقلیت اور سائنسی تجزیہ کی دیتے ہیں لیکن اپنا Dogma منوانے پر اس قدر مصر ہیں کہ اس سے ہٹ کر کسی کو سوچنے یا لکھنے نہیں دیتے۔ یہ لوگ انسانی فکر پہ پہرہ بٹھا کر انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنا چاہتے ہیں۔ بحث و تحقیق کے یہ قائل نہیں۔ دلیلیں ان کے کام کی نہیں۔ دشنام طرازی ان کا شیوہ ہے۔ لیکن آزادئ تحریر و تقریر کے لئے سب سے زیادہ شور و غوغا انہیں کی طرف سے بلند ہوتا ہے۔ یہ آزادی اپنے لئے مانگتے ہیں دوسروں کے لئے نہیں۔ اور اپنے لئے بھی یہ آزادی جھوٹ اور افترا پھیلانے کی آزادی ہے۔ ذہنی آزادی کے یہ دشمن Regimentation کا جواز ہمیشہ یکجہتی اور تنظیم کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ سوچنے کے تمام فرائض یہ کسی روپوش مافوق البشر ہستی کے سپرد کرتے ہیں وہ جو صراط مستقیم تجویز فرماتے ہیں اسی راہ پہ سب کو ہونا پڑتا ہے۔ عقلیت کا یہاں گذر نہیں۔ چون و چرا کی بالکل گنجائش نہیں کسی نے سرمو اختلاف کیا نہیں کہ فوراً خود پسندی، زوال پسندی، انحطاط پرستی، رجعت

پسندی - غرض ہر طرح کے لیبل لگ گئے۔ یہ الفاظ طوطے مینا کی طرح دٹے جاتے ہیں لیکن محض ان الفاظ کا رٹنا نہ دوسروں کو انحطاط پرست اور زوال پسند بناتا ہے۔ نہ انہیں ترقی کی منازل پہ پہنچاتا ہے۔ اصلی بحث سے توجہ ہٹانے اور اپنی علمی بے مائگی کو چھپانے کے لئے ان الفاظ کا نقاب اوڑھ لیا جاتا ہے۔

یہ بڑی قابل افسوس بات ہے کہ ذہنی آزادی کے سب سے بڑے شعوری دشمن وہی ہیں جن کے لئے آزادی سب سے زیادہ معنی رکھتی ہے۔ پبلک ان باتوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ براہ راست شعوری حملہ تو ادیبوں کی طرف سے ہی ہو رہا ہے۔

مصیبت تو یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے احتساب کے حق میں اور ذہنی آزادی کے خلاف جو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں ان میں سرے سے یہ سمجھا ہی نہیں جاتا کہ ادب کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہ ادیب کو ایک طرف یا تو صرف تفریح نگار سمجھتے ہیں۔ یا دوسری طرف محض پرچارک۔ جو کسی سیاسی پارٹی کی ہر آن بدلتی ہوئی پالیسی کے مطابق اپنی تحریریں بدل سکے۔

"جبر" ادب پیدا نہیں کر سکتا۔ جب تک ادیب بے ساختگی سے' آزادی سے نہیں لکھتا ادبی تخلیق ناممکن ہے۔ ادبی تخلیق کو ذہنی ایمانداری سے الگ نہیں کیا جا سکتا "تخیل" قید میں بار آور نہیں ہو سکتا۔ جب ذہنی آزادی فنا ہو جاتی ہے ادب مر جاتا ہے۔

اب جہاں ذہنی آزادی کی بات آئی' تنگ نظری میں فوراً یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ اینگلو امریکن بلاک کے پلڑے میں وزن ڈالا جا رہا ہے۔ اس لئے میں یہ واضح کر دوں کہ یہاں ادب کی بات ہو رہی ہے خواہ وہ پرولتاری ادب کے علمبردار ہوں یا دوسری طرف وہ جو آج یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ادب "ڈیموکریسی" کے نام پہ سیاسی بنایا جائے۔ دونوں میں وہی بات مشترک ہے۔ اور یہاں پاکستان میں بھی ان سب پہ یہ منطبق ہو سکتا ہے جو ادب کو ایک خاص ڈگر پہ چلانا چاہتے ہیں۔ کہ ان کی ضابطہ پرستی سے

ادب محض سیاست یا کسی خاص نظریہ (Ideology) یا اس سے بھی تنگ حدود میں ایک پارٹی لائن کا محکوم بن کر رہ جائے ۔ ادیب کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ۔ اس پر سیاسی قوانین نافذ کرنا سیاسی مقصد کے لئے اس کا گلا گھونٹنا ہے ۔

جو ادیب ادب کو سیاست سے بالکل ہم آہنگ کرنے کے اصول کو مانتا ہے ۔ اور اپنی تحریروں میں اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے اسے گویا سیاسی پروگراموں سے زندگی کو لینا پڑتا ہے ۔ پہلے سیاست کو دیکھنا پڑتا ہے زندگی کو بعد میں ۔ یہاں تک کہ اس کے لئے انسانوں کے درمیان معاشرتی انسانی تعلقات بھی ایک بنے بنائے نظریے کے مقابلے میں ثانوی حیثیت ہی رکھتے ہیں ۔

ادب کا تعلق زندگی سے ہے ۔ سیاست زندگی کا صرف ایک جزو ہے ۔ زندگی کے ایک شعبے کی حیثیت سے ادب میں سیاست کا بھی گذر ضرور ہے ۔ یہاں ادب کو سیاسی نہ بنانے سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ادب محض کسی Ideology کا آئینہ یا کسی سیاسی پارٹی کا آلۂ کار بن کر نہ رہ جائے ۔ یہ نہیں کہ ادب کا سیاست سے کوئی واسطہ ہی نہیں ۔

یہ عجیب و غریب اور احمقانہ سی بات ہو گی اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس موجودہ دور میں جب یہ دنیا تہ و بالا ہو رہی ہے ادب کسی گوشے میں چھپ کر پناہ لے سکے گا ۔ آج ادب گوشۂ فراغت (Ivory Tower) میں پناہ نہیں لے سکتا ۔ اہم معاشرتی اور سیاسی مسئلوں سے گریز ناممکن ہے ۔ ایک ادیب کے لئے سماجی اور سیاسی شعور لازمی ہے ۔ موجودہ دور میں ایک بڑا اہم مسئلہ ادیب کے سامنے یہ ہے کہ اس کا اپنے معاشرہ سے کیا رشتہ ہے ۔ خصوصیت سے ان تحریکات سے اس کا کیا رشتہ ہے جو موجودہ نظام کو بدلنا چاہتی ہیں ۔ ادیب کا سماجی اور سیاسی شعور اس وقت بیدار ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ایک ادیب ایک دانش ور کی حیثیت سے اپنے آپ کو سیاست میں

اس طرح ضم نہیں کر سکتا جس طرح کہ خالص سیاسی پارٹیوں کے ممبر کر سکتے ہیں۔ فن کار کی آزاد اظہار کی خواہش اور سیاسی پارٹیوں کا محکوم بنا دینے والا جبر اور احتساب — ٹریجڈی اسی تضاد کی ہے۔

فنونِ لطیفہ کی ہر صنف میں فنی کارناموں کی تخلیق کرنے والے عموماً غیر معمولی قابلیت کے افراد ہی ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقات پر اپنے معاشرتی اور سیاسی ماحول کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ پھر بھی یہ ایک انفرادی ذہن کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اور اصل تخلیق ایک فرد کے ذہن میں نازک، نفسیاتی عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آپ ایک ادیب کو قید میں ڈال دیجئے۔ جسمانی طور پر قید میں ہونے پر بھی وہ لکھ سکے گا۔ (بلکہ کئی ادیبوں اور بڑے آدمیوں نے کتابیں نظر بندی کے دوران میں لکھی ہیں) لیکن اس کی فکر پر پہرہ بٹھا دیجئے۔ اس کے ذہن کو ایک بیرونی احتساب کے ماتحت کر دیجئے اور اسے مقررہ حد بندیوں میں جکڑ دیجئے۔ کہ "یہ لکھنا چاہئے۔ اس پر لکھنا چاہئے۔ یوں لکھنا چاہئے"۔ تو وہ یا تو ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکے گا۔ یا مجبوراً ہدایات کے مطابق لکھے گا بھی تو بے روح چیزیں لکھے گا کبھی جاندار فنی کارنامے کی تخلیق نہیں کر سکے گا — یہی وجہ ہے کہ Totalitarian ملکوں میں اور جہاں ڈکٹیٹر اور حکومتیں فن کار اور ادیب کو ایک سیاسی سنسر شپ کے ماتحت رکھنا چاہتی ہیں فن پنپ نہیں سکتا۔ یا اس میں انحطاط اور پستی آجاتی ہے۔

نپولین نے اپنے دورانِ حکومت میں فرانس میں سرکاری ادب نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اس نے لکھا "میرا ارادہ فن اور ادب کی راہ ایسے موضوعوں کی طرف موڑنا ہے جو ان پچھلے پندرہ سالوں (یعنی اپنے دور) کے واقعات کی یادگار ہمیشہ کے لئے قائم رکھ سکیں۔" اور اس دور میں بہت پست درجے کے ادیب پنپے۔ ادب کا بھی یہی حال تھا۔ کیونکہ یہ ادیب اور فن کار کو کچھ کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ اور اسے احکام کے مطابق کرنا

پڑتا تھا۔ ایک ہی سال بعد نپولین نے خود ہی اعتراف کیا کہ اس کے سرکاری ادب نے ادب اور فن کے معیار کو نیچے گرا دیا ہے۔ آخر نپولین اچھا ادبی ذوق رکھتا تھا۔ وہ خود ہی اپنے اس "اوفیشل ادب" کو تحقیر کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ سینٹ ہیلینا میں اپنے آخری دنوں میں اس نے پھر راسین کی طرف رجوع کیا۔ ہومر کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اسی ادب کی ایک چیز بھی نہیں پڑھی۔ جو اس کے اپنے عہد کی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس نے خود ہی لکھوایا تھا۔ ادب کے متعلق اس رویہ کی ناکامی کی اس سے زیادہ واضح مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

ہٹلر نے ادب اور فن کے لئے ایک "قومی" معیار بنایا۔ اور اس Dogma کی تبلیغ کی۔ ادب کی جڑیں قوم میں پیوست ہوتی ہیں۔ آرٹ، تہذیب و تمدن کا زیور نہیں۔ آرٹ قومیت کا امتحان اور ثبوت ہے۔ "فن کار کو کسی زمانے یا وقت کی یادگار قائم نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ اپنی قوم کی یادگار ۔۔۔ ہم ایسے فن کاروں کو ڈھونڈ نکالیں گے اور ان کی حوصلہ افزائی کریں گے جو جرمن ریاست پر جرمن نسل کی کلچری مہر ثبت کریں گے"۔ ہٹلر نے سارے ملک میں ادیبوں اور ہر قسم کے فن کاروں کی نگرانی کرنے کے لئے ایک منظم جماعت قائم کر دی تاکہ اس پر نظر رکھیں کہ سارے فن کار اسی "قومی معیار" کے مدنظر انہیں اصولوں کے مطابق تخلیق کریں۔ اور اس نگرانی میں گسٹاپو کی بھی مدد لی جاتی تھی۔ اس رویہ اور سلوک کا نتیجہ جتنا تباہ کن ہو سکتا تھا، ہوا۔ نازی فن اگر سستا بھونڈا پروپیگنڈا نہ بن گیا تو پھیکا، بے جان اور مردہ رہا۔ جس وقت وحشیانہ نہ تھا اس وقت کھوکھلی سستی، جذباتیت یا گندگی کا حامل رہا۔

نازی فن کی طرح اطالوی "نسطائی فن" کی بھی وہی حالت تھی Totalitarian ریاستوں میں سارے عناصر پر ایک "مرکزی تسلط" ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جمالیاتی قدریں اور فن اور ادب بھی اسی تسلط اور سرکاری محاسبہ میں جکڑے جاتے ہیں۔ روس

میں یہی صورت حال پیش آ رہی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے بھی جنہیں روس سے لگاؤ ہے۔ اور جو اس کے معاشی نظام کو یقیناً ایک بہتر نظام مانتے ہیں۔ روس میں شخصی انفرادی آزادی پر پابندی بڑی مایوس کن ثابت ہوئی ہے۔

آندرے ژید لکھتے ہیں۔ سوویٹ یونین جانے سے پہلے میں نے اپنے آپ سے یہ سوال پوچھا... میرا اس پر یقین ہے کہ ایک ادیب کی قدر و قیمت کا انقلابی جذبہ یا انحراف کے جذبہ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہر بڑے ادیب میں یہ جذبہ موجود تھا۔ ایک بڑا ادیب ہمیشہ Non-Conformist ہوتا ہے۔ وہ "بہاؤ" کے خلاف جاتا ہے۔ کہیں روسی ادب اس حقیقت کو جھٹلا تو نہیں دے گا۔ نگاہیں بے تابی سے سوویٹ یونین کی طرف اُٹھتی ہیں۔ کیا انقلاب کی کامرانی فن کاروں کو رَو کے ساتھ بہالے گی۔ اور اس وقت کیا ہوگا جب نئی ریاست فن کار کے انحراف کا حق چھین لے گی؟ جب تک جد و جہد جاری رہے گی آرٹسٹ اس جد و جہد کو اپنے فن میں سموئے گا۔ اس جد و جہد میں اور اس کامرانی میں خود حصہ لے گا لیکن اس کے بعد؟

گورکی کی تدفین کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے بھی ژید نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ گورکی بڑا ادیب تھا، گورکی جد و جہد کا مظہر تھا، کیا گورکی کے بعد ایسا ادب روس میں پیدا ہوگا؟

ژید کا اندیشہ بالکل درست ثابت ہوا فنکار Conformity کی رو کے ساتھ بہہ گئے۔ یہی نہیں Conformity سرکاری طور پر نافذ کر دی گئی۔ ادیب کے لئے ایک راستہ مقرر کر دیا گیا۔ جس سے وہ ذرا بھی ہٹ کر چل نہیں سکتا۔ سر مو انحراف نہیں کر سکتا۔

روس میں فنکاروں اور ادیبوں کے لئے جو حد بندیاں اور پابندیاں ہیں ان کی مستند مثالیں مل سکتی ہیں۔

والڈارف امن کانفرنس میں پولیٹکس کے ایڈیٹر ڈوائٹ میکڈ نالڈ نے (جو یساری (Leftist) ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے سخت مخالف ہیں) روسی مندوبین کے لیڈر فدائف سے پوچھا۔ ایک امن کانفرنس میں روسی ادب کے نمائندے کی حیثیت سے ایک سرکاری رکن کو کیوں بھیجا گیا۔ کسی بین الاقوامی مقبولیت رکھنے والے ادیب کو کیوں نہیں بھیجا گیا؟ مثلاً بورس پیاسرٹناک، آئزک بیبل، ایوانِ کٹالف، اینا اکیمینوا، بورس پلنیاک، مائیکل زدشنکو، یہ سب ادیب کس حال میں ہیں؟ قید میں ہیں یا آزاد ہیں؟

فدائف نے ان میں سے صرف دو کے متعلق بتایا۔ پیاسرٹناک شیکسپیئر کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ مائیکل زدشنکو نے ۱۹۴۷ء میں ایک ناول شائع کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں تو مائیکل زدشنکو کو پوری طرح صاف (Purge) کردیا گیا تھا اس سے پہلے ۱۹۴۳ء میں جب زدشنکو کا ناول The Sun Rises چھپا اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ یہ ناول کتابی صورت میں شائع نہیں ہوا تھا۔ اس کے حصے روسی رسالے "اکتوبر" میں چھپتے رہتے تھے۔ اور اس کے آخری حصّوں کے چھپنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ زدشنکو سوویت یونین کے باہر شاید سب سے مقبول ادیب ہے اس کی مزاح کی چاشنی لئے ہوئے روزمرہ کی چھوٹی موٹی سادہ کہانیوں نے اسے بڑا مقبول بنا دیا ہے۔ اس کے اس عتاب زدہ ناول "جب سورج نکلتا ہے" میں بھی ایسے کئی چھوٹے چھوٹے آٹو بیاگرافک واقعات جمع ہیں۔ اپنے ناول "یوتھ رسٹورڈ" کے بعد زدشنکو نے انسانی نفسیات میں ایک اور وسیع تر تجربہ کرنا چاہا تھا اور یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ کس طرح اس نے اس کا کھوج لگایا کہ مایوسیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح ان مایوسیوں کو دور کر کے اس نے مسرت پائی۔ اس مقصد کے لئے زدشنکو نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار۔ بچپن، نوجوانی، جوانی وغیرہ

کے واقعات لئے ہیں۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ یہ ذرا انفرادی اور داخلی قسم کی
چیز تھی۔ لیکن اس ناول کو بڑا مہلک اور خطرناک قرار دیا گیا۔ Pontiffs
سرکاری قسم کے نقادوں نے سخت تنقیدیں کیں۔ اور ادیبوں کی انجمن
کی "پریسیڈیم" میں اس پر زور شور سے بحث ہوئی۔ اس پر بیسیوں الزام لگائے
گئے۔ اس انجمن کے سکریٹری فدائف نے (امن کانفرنس میں روسی مندوبین کے رہنما
یہی فدائف ہیں) افسوس ظاہر کیا کہ اس ناول کو چھپنے سے پہلے ہی زیر بحث
کیوں نہیں لایا گیا۔ اور ایسی خطرناک اور مہلک چیز کو صفحۂ قرطاس پر نمودار ہونے
ہی کیوں دیا گیا۔ پھر پریسیڈیم کے سامنے ان ایڈیٹروں کی پیشی ہوئی، جنہوں نے
اس ناول کے حصے چھاپے تھے۔ اس بجلی اور رعد کے طوفان میں زوشنکو نے ماسکو
سے بھاگ کر لینن گراڈ میں پناہ لی۔ "ماسکو" فن کاروں کا "صفائی گھر" ہے لینن
گراڈ میں ادب کے لئے ذرا کھلا ماحول تھا لیکن پھر سنہ ۱۹۴۷ء میں لینن گراڈ کے ادبی
حلقوں کو سخت تنبیہہ کی گئی کہ اس نے زوشنکو اور اینا اکمیتوا جیسے ذات باہر
ادیبوں کو کیسے پناہ دی۔ اس کے بعد زوشنکو کی ادبی زندگی کا کیا ہوا یہ تو کامریڈ
فدائف بھی نہیں بتا سکے۔ بہرحال "جب سورج نکلتا ہے" کے بعد زوشنکو کے
سے معروف اور مقبول ادیب کا سورج ڈوب گیا۔

مشہور روسی ناول نگار کانسٹنٹائن فیدن نے جنہیں گورکی کا ساتھ
میسر تھا۔ ایک کتاب لکھنی شروع کی تھی "گورکی ہم میں" یہ گورکی کی قلمی تصویر
ہونے کے ساتھ اس زمانے کا ادبی Memoir بھی تھی۔ اس کتاب کو فیدن نے
تین حصوں میں پلان کیا تھا۔ پہلے حصے میں اپنی گورکی سے پہچان اور سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء میں
گورکی سے ملاقاتوں کا ذکر۔ دوسرے حصے میں سنہ ۱۹۲۸-۲۳ء تک گورکی اور فیدن
کی خط و کتابت اور سنہ ۱۹۲۸ء میں گورکی کی روس کو واپسی۔ اور تیسرا حصہ گورکی نے

اپنی موت (۱۹۳۶ء) تک سوویت یونین میں جو کام کیا اس کے متعلق تھا۔ پہلے دو حصے شائع ہوئے اور دوسرے حصہ پر جو کچھ بیتی اس کے بعد تو اس تیسرے حصہ کے منظرِ عام پر آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس طرح ایک اہم تخلیق کو تکمیل پانے سے پہلے ہی درمیان میں گھونٹ دیا گیا۔ پہلے حصہ کے بارے میں فیدن کو پریسیڈیم کی طرف سے بھی تعریفی خطوط موصول ہوئے تھے "آپ کی تازہ کتاب گورکی کے متعلق لکھی گئی بہترین کتابوں میں سے ہے" یہ ۱۹۴۳ء کی بات تھی۔ جوں ہی اس کا دوسرا حصہ چھپا منظر اچانک بدل گیا۔ "پانٹفون" نے اپنی بندوقیں تان لیں اور "پروداا" اور "لٹریچر اینڈ آرٹ" میں اس کے خلاف مضامین نکلنے لگے۔ اور حسبِ معمول پریسیڈیم (ادیبوں کی اس انجمن کی شاخیں پورے روس میں پھیلی ہوئی ہیں) میں زوردار بحث ہوئی۔ فیدن کا "قصور" صرف یہ تھا کہ اس نے بعض انقلاب سے پہلے کے ادیبوں کا ذرا تفصیلی ذکر کر دیا تھا۔ یہ ادیب الیکسی رمیزوف، فیوڈر، سلوگب اور والمینکی انقلاب سے پہلے کے دور میں کافی پایہ کے ادیب تھے ــــ ایک ادبی memoir میں ظاہر ہے اس دور کے بڑے ادیبوں کا ذکر بالکل فطری بلکہ لازمی تھا۔ لیکن یہ جرم قرار پایا۔ کیونکہ "یہ بیمار، زوال پسند Gentry سے تعلق رکھنے والے ادیب تھے"۔ اور پھر فیدن کا "معروضیت" اور "سمجھوتہ" کا رویہ مجرمانہ تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ فیدن نے کچھ دیر کے لئے سیاست کو بھلا کر اُسے ذرا خالص ادبی چیز بنا دیا تھا۔ اس دور میں سیاست کو کیسے چھوڑا جا سکتا تھا ایک سرکاری نقاد ولیشنیوسکی نے کہا: "فیدن کی کتاب گویا اس زوال پذیر ادب کا "دفاع" پیش کرتی ہے جو "اچھے" اور "برے" میں تمیز نہیں کر سکتا اور مظاہرات کو بڑی خاموشی سے "معروضیت سے جانچتا ہے۔ ایک کرانیکل کی طرح! سیاست سے دور کوئی کیسے رہ سکتا ہے؟ یہ رویہ آخر ہمیں کہاں لے جائے گا؟" اور ایل ڈی ڈمیٹروف

نے لکھا :-

" فیدن " کی کتاب " سوچنے والے " آرٹسٹ کی جانی بوجھی حمایت ہے ۔غیر سیاسی فن کی حمایت ہے ؛'

یہاں یہ ملاحظہ فرمائیے کہ کس طرح بالکل ایک سی رائیں ہیں ۔

خیر یہ تو ایک ادبی memoire کی بات ہوئی ۔ گو ادب کی تاریخ سے قابل ذکر نام نکال دینا اور اسے مسخ کرنا بھی ایمانداری سے دور کی بات ہے ۔ یہاں تو واقعاتی تاریخ کو مسخ کرنے اور مصلحت پر تاریخی حقیقت کو قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا ۔ بڑے بڑے تاریخی واقعات جیسے یوکرین کا قحط (جس میں تیس لاکھ مرے ۔ بنگال کے قحط کی طرح یہ بھی انسان کا لایا ہوا قحط تھا ۔اس پر پندرہ سال تک پردہ ڈالا گیا) پولینڈ میں روس کی خارجی پالیسی وغیرہ پر غلط بیانیوں کی دھند ... اس طرح چھائی ہوئی تھی ۔ کہ صحیح تاریخی حقیقت کا کھوج لگانا مشکل ہو جاتا ہے ۔ جارج اورول ایک اور مثال دیتے ہیں کہ ان کے پاس ۱۹۱۸ء کا میکسم لوٹنیاف کا لکھا ہوا روسی انقلاب کے بارے میں ایک بڑا نادر پمفلٹ ہے ۔اس میں سٹالن کا نام تک نہیں اور ٹروٹسکی کی بے انتہا تعریف کی گئی ہے ۔ اس کے ساتھ زینوئیف (Zinovive) اور کامی نیف (Kame Neá) وغیرہ (یہ دونوں ماسکو ٹرائیلز میں قتل کیے گئے) کی کارگزاریوں کو بھی سراہا گیا ہے ! اس پمفلٹ کے بارے میں ایک واقعی سمجھدار اور ایماندار کمیونسٹ کا رویّہ بھی کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ بہتر صورت میں یہ کہ یہ بیہودہ دستاویز ہے ۔ اسے روک لینا چاہیے یا اگر کسی وجہ سے اس پمفلٹ کو شائع کرنا ہو اور اس بدلی ہوئی صورت میں کہ ٹروٹسکی کی تعریف کی جگہ تنقیص لکھ دی جائے اور اسٹالن کا نام نمایاں طور پر اس پمفلٹ میں داخل کر دیا جائے تو کوئی بھی کمیونسٹ جو پارٹی کا وفادار ہے اسے بغیر کسی

احتجاج کے قبول کرے گا۔ تاریخی دستاویزوں میں اس طرح کی یا اس سے بڑی جعلسازیاں بے دریغ کی گئی ہیں۔

ایک روشن خیال اور بے تعصب مورخ اس پر یقین رکھتا ہے کہ ماضی کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اور سچی تاریخ بہت قیمتی ہے لیکن Totalitanan نظریۂ تاریخ کے متعلق یہ ہے کہ تاریخ "تخلیق" کی جاتی ہے۔ "ٹوٹالیٹیرین" ریاست ایک طرح کی "تھیوکریسی" ہے۔ اور اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے اپنے متعلق لوگوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانی پڑتی ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی۔ اس لئے پچھلے واقعات یہ ظاہر کرنے کے لئے بدلتے رہنے پڑتے ہیں کہ فلاں غلطی سرے سے سرزد ہی نہیں ہوئی۔ اور فلاں کامیابی یقینی طور پر ہوئی۔

دوسری جنگ کے بعد جو روسی ادیب پمفلٹ لگاری اور جرنلزم کیطرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ان میں سب سے پیش پیش ایلیا اہرن برگ تھے۔ جرمنوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے اہرن برگ بڑے جوش و خروش سے لکھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک سنہ ۱۹۴۵ء میں پراودا میں ایک مقالہ نمودار ہوا۔ "کامریڈ اہرن برگ کی مبالغہ آمیزی" جرمنوں میں اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ اہرن برگ نے یہ دیکھ کر اپنا قلم روک لیا۔ یہ اس لئے تھا کہ جنگ اب ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی۔ کہ اب جرمنوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ سوویٹ فوجیں جرمنی میں داخل ہو رہی تھیں اور اس لئے روس کو اب جرمنی کے معاملہ میں ذرا الگ پالیسی اختیار کرنی تھی۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ ادیب کو سیاسی حکمت عملی کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے قلم کو بھی موڑنا پڑتا ہے اور غلط بیانی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔

الیکسی ٹالسٹائی کا ناول "روڈ ٹو کیلواری" جس کے لکھنے میں ۲۱ سال

صرف ہوئے اور جو میری نظر میں موجودہ روسی ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے۔
شالوخوف کا "اور ڈان بہتا رہا" کا پایہ بھی بہر حال اس سے کمتر ہی ہے۔ یہ
بھی سیاسی قسم کی تنقید سے بچ نہ سکا۔ ادیبوں کی انجمن کے سکریٹری فداایُف کو
اس میں کوئی "ہیرو" تاریخ بنانے والے ہیرو نظر نہیں آئے۔

کئی دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کوئی کتاب چھپ کر روسی عوام میں بہت مقبول
ہونے پر بھی منظر عام سے ہٹالی گئی ہے۔

دوسری جنگ کے بعد جب ذرا کچھ "ڈھیل" دی گئی تھی۔ (احتساب اب
پھر سخت ہو گیا ہے) اس وقت جو آوازیں اُٹھتی نظر آئیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ روسی ادیب اور ان سرکاری قسم کے نقادوں کے علاوہ دوسرے نقاد صورتِ
حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ وہ اس احتساب سے اور اس احتساب کے تحت اپنے ادب
سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان میں ایک اضطراب سا نظر آتا ہے۔ ویسلی گروسمین پوچھتے ہیں
"کیا ہمارا موجودہ ادب ہمارے ماضی کے بڑے ادب کا وارث کہلانے کا مستحق
ہے۔ یہ دیکھ کر واقعی دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے ادبی حلقے جلد بازی میں لکھی گئی سطحی
چیزوں پر ہی مطمئن ہیں۔ اور ان پر فخر بھی کرتے ہیں!" ڈرامانسٹ کے ٹرنیف
لکھتے ہیں: "سٹالن گراڈ پر کچھ نہیں تو دس سے زیادہ ڈرامے لکھے گئے۔ مگر ان میں سے
ایک بھی باقی نہ رہا۔ وہ اس لئے معدوم ہو گئے کہ وہ اچھا مستند ادب نہیں تھا۔
وہ نئی کارنامے نہیں تھے۔ پھر ٹرنیف آگے چل کر لکھتے ہیں: لہ "ہم روسی اب اتنے
مضبوط اور طاقتور ہیں کہ آنکھیں بند کر لینے اور ہماری ناکامیوں اور کمزوریوں پر
پردہ ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم میں سے کسی گروہ یا افراد کی کمزوری اور

لہ Be not afraid to dare

برائی کو بے نقاب کرنے میں کوئی خطرہ نہیں۔ سودیت ادب کو برائیوں پر جرات سے ہنسنا چاہیئے۔

جیراسیموا (Gerassimova) کے ناول Bader Gates[1] کی ہیروئن یا اور کرداروں کو "یوں نہیں یوں ہونا چاہیے" کے اصول کے تحت تنقید کرتے ہوئے مکاروف نے اعتراض کیا کہ اس ناول کی ہیروئن کے کردار میں نامطابقت اور بے اصولی ہے۔ اس پر Chetunova کا مناسب جواب تھا۔ "اس کے کردار میں نامطابقت اور بے اصولی اس لئے ہے کہ وہ انسان ہے — ایک نوجوان لڑکی ہے۔"

ایک خاتون نقاد Motyleva نے ایک نوجوان طالب علم کی زبانی ادب کے بارے میں کچھ سُنا تو انہوں نے حیران ہو کر لکھا کہ "ہماری نئی نسل کو کیا ہوتا جا رہا ہے۔ کہ ایسی رائیں اور ایسے خیالات ان کے دماغ میں سمانے لگے ہیں۔" وہ نوجوان طالب علم فنکار کی ذہنی آزادی کی بڑے جوش و خروش سے حمایت کر رہا تھا۔

ایسے حالات میں معمولی یا درمیانہ درجہ کے لکھنے والے تو شاید آسانی سے اور اطمینان سے لکھ سکیں گے۔ لیکن اگر کسی ادیب میں غیر معمولی قابلیت ہو۔ جینس کا شرارہ ہو۔ اُپج ہو تو وہ بالکل گھٹ کے رہ جائے گا۔ ایسے ادیب کو جو ادب کو واقعی کچھ دینا چاہتا ہو۔ عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ دریافت کر سکتا ہو۔ کوئی گہری Profound کوئی تخلیق کر سکتا ہو۔ خاموش رہنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں۔ جب حُسن کی تلاش، ہیئت پرستی Formalism کا جُرم بن جاتی ہو اور کسی بھی قسم کی اُپج اور انفرادیت "بورژوا برائی" قرار پاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے

---

[1] Soviet Literature.

کہ ایسے معمولی لکھنے والے جن کی تحریروں میں پروپیگنڈا، نعرہ بازی یا قصیدہ خوانی ہو۔ معروف اور مقبول بنا دیے جاتے ہیں۔ اور جس میں جوہر ہو وہ گمنام رہتا ہے بلکہ گمنام بنا دیا جاتا ہے۔ اصل ہوتی صدف میں چھپا پڑا رہ جاتا ہے خصوصیت سے ایسے فن کار جن کے فن میں گہرے اندرونی جذبات، لطیف اور نازک احساسات، روح کی گرمی اور وجدان کو زیادہ دخل ہے۔ مثلاً موسیقی داں، مصوّر اور ادیبوں میں خصوصیت سے شاعر ایک ناگفتہ بہ یاسیت سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ جبھی تو ایک پیاسٹرناک ترجموں کی طرف لگ جاتا ہے۔ جبھی تو ایک شوستاکووچ کے چہرے پر ٹریجڈی لکھی ہوتی ہے (اور گو وہ امن کانفرنسوں میں تیار کرائی ہوئی اور رٹی ہوئی تقریر بڑے جوش سے کر سکتا ہے لیکن دوسرے وقت اس سے کچھ پوچھا جائے تو وہ کانپنے لگتا ہے اور باریک دکھی آواز میں دو جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (جیسا کہ نیویارک امن کانفرنس میں ہوا) اور ایک میکافسکی خودکشی کر لیتا ہے پیاسٹرناک غیر معمولی صلاحیتوں کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری میں غنائیت، موسیقی، مصوّری ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایسی خوبیاں ہیں جو وہاں کوئی اچھی نظر سے دیکھی نہیں جاتیں۔ اور پھر اس کی شاعری زیادہ تر "انفرادی" ہے۔ اور حسّاس۔ اس لیے اب پیاسٹرناک نے ترجمے میں پناہ لی ہے۔ اگر وہ حسن تخلیق نہ کر سکے تو کم از کم شیکسپیئر کے حسین کارناموں کو اپنی زبان میں تو منتقل کر لے۔

میکافسکی کے علاوہ جن شاعروں نے خودکشی کر لی۔ یسنین (Yessenin) انہیں اور Bagritsky بھی کچھ کم پایہ کے شاعر نہیں تھے لیکن میکافسکی ان میں یکتا تھا اور جدید روس کا عظیم ترین شاعر مانا جاتا تھا۔ وہ گویا انقلابی تحریک کا وجدان تھا۔ صحیح معنوں میں انقلاب کا شاعر اعظم اور انقلاب کے فوراً بعد اس نے انقلاب کی فتح اور کامرانیوں کو بھی اسی قوت اور جوش اور ولولے کے ساتھ اپنی نظم

میں زندہ کیا۔ لیکن اس کے بعد؟ ... اس کے بعد اس کے قلم کی یہ قوت اس کا وجدان کدھر... لیکن شاعر کے وجدان کے لئے ایک خاص راستہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے تصور پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔ اور "پارٹی لائن" شاعری کا معیار قرار پائی۔ میکا فسکی جینیس تھا۔ اور جینیس[1] ایک ایسا درخت ہے جو کوئی نادر۔ ان جانا پھل پیدا کرتا ہے۔ ہسپرڈیس کے "سونے کے سیب" لیکن میکافسکی کو ایک سال بالکل ایک ہی سائز اور ایک ہی وضع کے آلوچے پیدا کرنے تھے۔ چند سالوں بعد سیب اور آخر میں کھیرے۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ یہ سہہ نہ سکا۔ تخلیق کے لمحات سکوت سحر کے لمحات ہوتے ہیں جن میں فن کار ایک خواب کی سی کیفیت میں ان قوتوں سے ہمکلام ہوتا ہے۔ جو عام سطح کے خیالات واحساسات سے بالاتر ہوتے ہیں۔ یہ بات ایک سیاسی شخص کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اور وہ فن کار پر برستا ہے۔ اگر فن کار کو کسی پہلے سے طے کئے ہوئے پروگرام کے مطابق کسی طے شدہ نمونے پر لکھنا پڑے بلکہ اسے اس طرح لکھنے پر مجبور کیا جائے تو ایک حساس آرٹسٹ کس مپرسی کی حالت میں ہمت ہار بیٹھے گا اور انتہائی صورت میں ایک میکافسکی سا جینیس خودکشی کر لے گا... خودکشی کرتے ہوئے میکافسکی نے یہ چھوٹی سی نظم چھوڑی :-

[2] As they Say
the incident is closed,
Love Boat
Smashed against more.

---

[1] Herbert Read :- Poetry + Anarchism

[2] ترجمہ سکیس ایسٹ من Artist in Uniform.

I'm quits with life
No need itezimimg
Mutual griefs,
Woes
Offences
Good luck and good-bye!

کسی شرح کی ضرورت نہیں۔ یہاں محبت کا گذر تھا۔ لیکن تعجب تو اس پر ہوتا ہے کہ وہ Mores بھی تھے۔ وہ دوسرے حالات، سماجی روایات جن سے اس کی محبت کا سفینہ ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ میکافسکی کو وہ ماحول نہ ملا۔ جس میں وہ آزادی سے، مسرت سے زندگی گذار سکتا۔ اسے وہ ماحول ملا۔ جس میں اسے اس کرب سے کہنا پڑا:۔

"But I mastered my impulse—
And crushed underfoot.
The throat of my songs..."

یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اس انقلاب کے شاعر کو سرمایہ دارانہ نظام کے کسی مایوس انفعالی بورژوا کی طرح اپنے ہاتھوں اپنی زندگی لینی پڑی تو انقلاب نے اس ذہنی اعتماد اور اخلاقی آزادی کا ماحول پیدا نہیں کیا تھا۔

انقلاب فرانس کے موقعہ پر ورڈزورتھ گا اُٹھا تھا۔

Bliss was it in that dawn to be alive But to be Young was the very heaven.

کیونکہ یہ سویرا آزادی، مساوات اور اخوت کے زریں اصولوں کا پیامبر بن کر

آیا تھا۔ دورانِ انقلاب میں جو قتل و خون ہوا سو ہوا۔ جو زیادتیاں ہوئیں سو ہوئیں لیکن مابعد انقلاب جب ان اصولوں کو ٹھکرا کر، ان آدرشوں کو پس پشت ڈال کر رجعتی قوتیں برسر اقتدار آگئیں اور آمریت کا ایک نیا دور شروع ہوا تو ادیب بہت مایوس اور بدظن ہو گئے۔ اور اپنی اخلاقی حمایت "انقلاب" سے ہٹا لی۔ ورڈز ورتھ کا انقلاب کے ساتھ پہلا جوش و خروش سرد مہری میں بدل گیا۔

روسی انقلاب بھی ایک چمکیلی امید، ایک روشن صبح بن کر آیا تھا۔ سب کی نگاہیں ادھر اٹھ گئی تھیں۔ اس وقت اس نظام کا صرف آئیڈیل ان کے سامنے تھا اور وہ بڑی سنجیدگی سے، بڑے خلوص سے "سماجی انصاف" کے لئے کام کرنے لگے۔ بہت سے ادیب براہ راست بائیں سیاسی پارٹیوں سے وابستہ بھی ہو گئے۔ انگلستان میں سارا "نیو رائٹنگ" کا گروپ ادھر تھا۔ جارج آرول، سٹیفن سپنڈر، آڈن، ڈے لیوس، کرسٹوفر ایشر ووڈ، کاڈول اور رالف فاکس نے سپین کی خانہ جنگی میں ری پبلکن محاذ کا ساتھ دے کر اپنی جانیں بھی دے دیں۔ اور ملکوں میں بھی یہی حال تھا لیکن آگے چل کر انہیں بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ روس میں حالات دن بدن جو صورت اختیار کر رہے تھے۔ اب انہیں خبر ہونے لگی تھی۔ "انسانیت" کے لئے جو خوش آئند خواب انہوں نے دیکھا تھا حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔

مخلص اور ذہین ادیبوں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ وہ سیاسی پارٹیوں میں رہ کر ادب کی راہ میں کچھ پا نہیں سکے۔ Power Politics اور سیاسی چالبازیوں کو ان کا مزاج قبول نہ کر سکا۔ فن کار ہمیشہ سچائی کا جویا ہوتا ہے۔ پارٹی پروپیگنڈا اور سیاسی مصلحتوں کے لئے جس طرح اکثر جھوٹ افترا اور Distortion سے بے دریغ کام لیا جاتا ہے۔ ایک سچے فن کار کی طبیعت اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ ہمیشہ سے لبرل ماحول میں پلے ہوئے ادیب جو ذہنی آزادی تحریر اور تقریر کی آزادی کو عزیز

رکھتے ہیں۔ ہمیشہ "پارٹی لائن" پر رہنے کے "جبر" کو برداشت نہ کر سکے۔ پھر ان کی انفرادی معروضیت کو بالکل کچل کر ایک اٹل Dogma پر اجتماعی ایمان لے آنا تھا۔ ان سب باتوں نے ادیبوں کو سیاست سے متنفر کر دیا۔ ژید نے Back from (1936) The U.S.S.R. میں کہا تھا کہ ہمیں روس کی بعض خامیوں کو دیکھ کر Cause سے مایوس نہیں ہونا چاہئے اور جن باتوں کو روس میں دیکھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ انہیں Cause سے منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ اور ژید نے ۱۹۳۳ء میں اسوقت بھی جب وہ سوویت روس کے مداح تھے کہا تھا۔[۱] "ہر چیز پست اور ذلیل بن جاتی ہے۔ اعلیٰ ترین آدرش بھی، جب سیاست گھس آتی ہے اور انہیں اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے" اور پھر جب کوئی اسے "تبدیلی مذہب" کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہے بالکل کیتھولک مذہب کی طرح۔ کمیونزم قبول کرنے کے معنی ہیں کہ آدمی تجسس، دریافت اور تحقیق کی آزادی سے دست بردار ہو جائے۔ ایک Dogma کا محکوم ہو جائے۔ لکیر کا فقیر، اور تقلید پرست بن جائے۔" (ژید کے بارے میں، میں یہ ہرگز ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ انہیں خریدا جا سکتا ہے۔ اور وہ ضمیر فروش ہیں)

سلونے اپنے آپ سے سوال کرتا ہے[۲] "کیا میرے لئے صرف پارٹی کی سچائی سچائی بن کر نہیں رہ گئی ہے۔ اور انصاف "پارٹی کا انصاف"؟ کیا پارٹی کی مصلحتوں نے میری اخلاقی قدروں کو، اخلاقی حس کو مردہ نہیں کر دیا ہے۔ اور میں بھی انہیں "بورژوا تعصبات" نہیں سمجھنے لگا ہوں۔ کیا میں ایک انحطاط پذیر "چرچ" سے اسی لئے بھاگا تھا کہ ایک اور قید کی جکڑ بندیوں میں پھنس جاؤں اور پارٹی کی موقعہ پرستیوں

۱۔ Journals vol III P.P. 275-276

۲۔ Bread and Wine.

کا ساتھ دوں؟ میرے دنولے میرے وجدان کو کیا ہو گیا ہے۔ سیاست کو ہر چیز سے پہلے، روحانی ضرورتوں سے بھی پہلے رکھ کر کیا میں نے زندگی میں بہت کچھ نہیں کھو لیا ہے؟"

بہت سے حساس مخلص فنکاروں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا ہو گا اس کش مکش سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ یہ محسوس کیا ہو گا کہ فن کار کا دائرۂ نظر زندگی کے متعلق سیاستدانوں سے کہیں وسیع تر ہے۔ اور اس کا پیغام وسیع انسانیت کے لئے ہے۔ اور اچھے اچھے بڑے فن کار سیاسی پارٹیوں سے علیحدہ ہونے لگے۔ لیکن سیاسی پارٹیوں سے الگ ہونے کے بعد بھی وہ "انقلابی" ہی رہے ہیں۔ ایک صحیح معنوں میں آزاد فنکار انقلابی طاقت کا نمائندہ ہے۔ یہ سب فن کار اب بھی انسانیت کی بہبودی اور انسان کی آزادی کے لئے جد و جہد میں مصروف ہیں۔ وہ انسانیت ہی کے لئے لکھ رہے ہیں۔

سلونے نے اطالوی کمیونسٹ پارٹی سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی جو کتابیں لکھی ہیں۔ وہ بھی انسان کی آزادی کی جد و جہد میں کچھ کمتر کوششیں نہیں ہیں۔ ژید کی کتابیں بڑی سے بڑی پیش کش ہیں جو ایک ادیب انسانیت کو دے سکتا ہے۔ اپنی تازہ کتاب "تھی سی ایس" میں تو انہوں نے ایک انتہائی انمول اور حد درجہ ترقی پسند آئیڈیل پیش کیا ہے۔ بلکہ یہ تو ایک طرح کی ترمیم شدہ "اسٹالن ازم" ہے۔ موجودہ اشتراکیت سے بھی آگے ایک منزل۔ اس ناول میں "تھی سی ایس" جو شہر تخلیق کرتا ہے۔ اس میں دولت کی برابر تقسیم ہوتی ہے۔ مکمل معاشی انصاف، طبقاتی تفریق مٹادی جاتی ہے۔ اگر سبقت کا کوئی معیار ہے تو وہ ذاتی قابلیت ہے۔ "تھی سی ایس" خود اپنی رعایا کے کسی بھی فرد کی طرح عام آدمی کی سی سیدھی سادی زندگی بسر کرتا ہے ملک میں ہر آدمی کو پوری شخصی آزادی میسر ہے۔ ژید کے "تھی سی ایس" کا سب سے بڑا کام مینا توڑ سے بچنا نہیں بلکہ ایک ایسے شہر کی تخلیق کرنا اور اس میں ایسا انتظام قائم

کرنا ہے جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ مسرت پا سکیں - اور سب بلا کسی تفریق زیادہ اچھی طرح زندگی بسر کر سکیں - آنے والی انسانیت کے لئے اس نے اپنا یہ کام چھوڑا۔" تھی سی ایس" میں ژید نے ایک اور بڑا آئیڈیل پیش کیا ہے کسی فرد کی زندگی مکمل اسی وقت ہو سکتی ہے جب وہ ترغیبوں اور جسمانی راحتوں کی بھول بھلیاں اور محض اپنے آپ کی قید سے باہر نکل کر اپنے فرائض پورے کرتا ہے اور انسانیت کی خدمت کرتا ہے - ایک فرد کی مکمل زندگی وہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی شخصیت کو بھی پوری طرح اُبھالے اور اس کی ذات سے معاشرے کو بھی پورا پورا فائدہ پہنچے - اور یوں ژید نے اجتماعی اور انفرادی زندگی کو جو گویا بالکل ہی مخالف اور متضاد نقطے سمجھ لیے گئے ہیں ملایا ہے (یعنی سماجی ذمہ داری کو کوئی " بیرونی جبر" کی وجہ سے اپنے آپ پر عائد نہ کرے بلکہ اسے خود اس کا احساس ہو)

" تھی سی ایس" میں ژید کے یہ صرف چند جملے ہیں!

" ساری برائیوں اور فساد کا منبع دولت کی غیر مساوی تقسیم ہے"

" میری سب سے بڑی طاقت ہے ترقی پہ میرا یقین ... ایک نقطے کے بعد آدمی ٹھہر نہیں سکتا - آگے ہی آگے بڑھ سکتا ہے ..."

" ہمارے سارے تصور انسانیت کی بہبودی کے لئے ہیں اور انسان اس سلسلے میں کبھی بھی حرف آخر نہیں کہہ سکتا"

یا پھر ژاں پال سارتر نے *Les Mouches* میں انسانی آزادی کا اور خود انسان کا جتنا سر بلند اور قد آور تصور پیش کیا ہے۔ " نئے انسان" کا اس سے بلند تر تصور اور کیا ہو سکتا ہے؟

جیسے ہی یہ ادیب سیاسی پارٹیوں سے علیحدہ ہونے لگے تو پیشہ ور انقلابیوں اور سیاسی پارٹی بازوں نے انہیں بدنام کرنا شروع کر دیا اور وہی سارے القابات

اور بیہودہ بیٹلے الزامات جو ہزاروں دفعہ دُہرائے گئے ہیں اور بلا کسی امتیاز کے سارے ادیبوں پر لگائے جاتے ہیں۔ ان کے ناموں کے ساتھ بھی لگا دیے گئے۔ "رجعت پسند" "انحطاط پرست" "زوال پسند" "انفعالیت پسند" "بیمار ذہنیت رکھنے والے" اور "انسانیت کش ادب پیدا کرنے والے" (یہ آخری لقب فن کار کے لئے کتنا موزوں اور مزیدار ہے) بورژوا ماحول نے ان ادیبوں کو بیمار کر دیا ہے۔ انہیں اپنے ذاتی اقتدار اور ذاتی منافعت سے کام ہے۔ انہیں عوام کی مصیبتوں سے بالکل سروکار نہیں، انہوں نے حقیقت سے منہ موڑ لیا ہے۔ اور فرادیت کی راہ اختیار کر رہے ہیں۔ تصوف کی طرف مائل ہیں، خود پسند ہیں، فاشسٹوں سے ان کا گٹھ جوڑ ہے۔ اچھا ہوا کہ ہماری صفیں ان سے پاک ہو گئیں۔ یہ عموماً یوں ہوتا تھا کہ اچھے اچھے ادیبوں کے علیحدہ ہو جانے کے بعد چند معمولی یا کمتر درجہ کے محرر فوراً موقعہ پا کر سامنے آجاتے تھے۔ تاکہ یہی پارٹی لائن کے محافظ کہلائیں۔ اور اس بہانے ان سب اچھے ادیبوں کو بے نقط سنائیں۔

آج پاکستان میں بعینہٖ یہی صورت پیش آ رہی ہے۔ دو چار نو وارد جن کی کوئی ادبی حیثیت نہیں، ادب کے محتسب بن بیٹھے ہیں۔ اور اچھے اچھے ادیبوں کو بے نقط سنا رہے ہیں۔ اور جسے چاہیں اس پر مخصوص القاب اور لیبل چپکائے جاتے ہیں۔ اور "آڑ" حسب معمول سیاست کی لی جاتی ہے۔

مجھے تسلیم ہے کہ شخصی آزادی کے بغیر ایک اوسط درجہ کا آدمی مزے سے زندگی گذار سکتا ہے۔ مگر یہ تصور ان اقدار میں سے ہے جو انسانیت نے ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد حاصل کی ہیں۔ کم سے کم مغربی اثرات کے ماتحت تربیت یافتہ ذہنوں کو تو یہ چیز اتنی ہی ضروری معلوم ہوتی ہے جتنی ہوا۔ اس کے خلاف جتنی باتیں کہی جا سکتی ہیں ان سب کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی یہ حقیقت باقی رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ

شخصی آزادی ایک مستحکم، جاندار اور وسیع کلچر کی علامت ہے مگر آج کی دنیا میں اس آزادی کو بہت سے خطرات لاحق ہیں خصوصاً ایسے نظاموں میں جو زیادہ سے زیادہ معاشی انصاف کے حصول کا دعویٰ کرتے ہیں "معاشی انصاف اتنی ضروری چیز ہے کہ اگر اسے شخصی آزادی دے کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں۔ مجھے قطعاً اصرار نہیں کہ آزادی کو لازمی طور پر مقدس ہی سمجھا جائے" یہ محمد حسن عسکری کے الفاظ ہیں۔ لیکن معاشی انصاف اور شخصی آزادی ایسی نہیں ہیں کہ یہ دونوں ایک میان میں نہ سما سکیں۔ معاشی انصاف کے ساتھ ساتھ شخصی آزادی کے سوال کو بھی بہر حال نظر انداز نہ ہونے دینا چاہیئے۔

آج ایک روشن خیال بیداری ادیب کے لئے انتخاب، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان یقیناً نہیں، زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام سے وہ کبھی کا ناطہ توڑ چکا ہے۔ آج انتخاب دراصل اس نظام میں جو معاشی انصاف، سیاسی جمہوریت اور شخصی آزادی کا ایک ساتھ حامل ہو۔ انتخاب اس میں اور اشتراکیت کی موجودہ بحرانی عملی صورت میں ہے۔ نصب العین کا سوال ادیب کے سامنے بہت اہم ہے لیکن اس نصب العین کی خاطر جدوجہد میں صلح "ذرائع" کی اہمیت کا بھی وہ منکر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ تشدد آمیز ذرائع کا اثر حصول یافتہ مقصد کا ایک جزو لاینفک بن کر چمٹا رہے گا۔ مانا کہ کسی سیاسی گروہ کے سامنے مقصد اعلیٰ دارفع ہے۔ ادیب بھی اسی آدرش کا پرستار ہے اور اس آدرش کو عملی صورت میں دیکھنے کے لئے مضطرب ہے لیکن اس سیاسی گروہ کو کئی بار اپنے اصولوں سے انحراف کر کے سمجھوتہ بازی اور مصلحت سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب سیاسی کارکن کی ہر غلطی ہر آن بدلتی ہوئی حکمت عملی پہ سچائی اور صداقت کو نچھاور نہیں کر سکتا۔

کسی سیاسی پارٹی سے منسلک ہو جانے کے بعد یا اس کی حاشیہ برداری کر

ادیبوں کو ایک "پارٹی لائن" کا محکوم ہو جانا پڑتا ہے۔ اسی چیز کا انکشاف تھا جو ایشیا اور یورپ کے باشعور ادیبوں کو ایک پرولتاری انقلاب کی خاطر اپنے آپ کو سیاست سے وابستہ کر لینے اور سیاسی کارکنوں کے ساتھ کچھ دور چلنے پر ہوا۔ اور ان کی صلاحیتیں پارٹی پروگرام کی حدبندیوں کو توڑ کر نکل گئیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ آج ادیب سیاسی پارٹیوں کی آمریت کے خلاف بھی آواز اٹھا رہا ہے۔ اور اپنی ذہنی آزادی اور اظہار رائے کا حق برقرار رکھنے کی مقدس جنگ بھی لڑ رہا ہے۔

پیرس میں یونسکو کے افتتاحی اجلاس میں ژاں پال سارتر نے ایک مضمون پڑھا: "ادیب کی ذمہ داری" اس میں وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم ایک ادیب اور ایک سیاسی کارکن کا تقابلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں کے سامنے ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے لیکن سیاسی کارکن اکثر اپنے مقصد کے حصول کے لئے تشدد کے سوا اور کوئی ذریعہ اختیار نہیں کرتا۔ ادیب اس سے یقیناً ایک بلند سطح پر ہے کہ وہ آزادی اور انسانیت کی حکومت کا آدرش اپنے سامنے رکھے بھی تو اسے تشدد سے کام لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تشدد کا تو وہ سرے سے منکر ہے۔ جھوٹ، افترا، حقیقت کا مسخ کرنا یا اسے دبا دینا یہ تشدد کی صورتیں ہیں۔ جہاں تشدد لفظوں کا "ذریعہ" اختیار کرتا ہے۔ یہ ادب کی سطح نہیں بلکہ پروپیگنڈا اور اشتہار بازی کی پست سطح ہے۔ ایک ایسے دور میں جب آزادی کو ہر گھڑی، ہر طرف سے خطرہ ہے۔ اس کے تو سیع اثر کے لئے ایک ادیب جب تک کمر بستہ نہیں ہوتا۔ وہ ادب بھی پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن ماحول کو بدلنے کے شدید جذبے کے بغیر یوں ہی تخلیقی آزادی چاہنا صرف حسن سے لطف اندوز ہونے کی آزادی چاہنے کے مترادف ہے یعنی یہ "فن برائے فن" کی حمایت ہے اور آج کوئی بھی "فن برائے فن" کا حامی نہیں ہو سکتا۔ اور اس طرح ادیب کی سماجی ذمہ داری دوچند بڑھ جاتی ہے لیکن جب تک اس کی

انفرادیت کو ابھرنے کا موقعہ نہ ملے۔ ادیب کو سماجی ذمہ داری کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ فن کار کی علیٰحدہ شخصیت اور اس کی سماجی ہستی ایک ساتھ ہو جائیں۔ اس وقت ادیب محض سیاست کی پیداوار نہیں ہونگے اور سیاسی مصلحت سازی سے ہٹ کر انسانیت کے لئے ایک بلند آدرش قائم کر سکیں گے۔

احمد رسول خاں

جماعتی ادب

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ فرد جماعت ہی کے اندر اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ اسی کے اندر رہتا ہے، بڑھتا ہے۔ اسی سے بچپن سے لے کر آخیر تک بیوہار رکھتا ہے اسی کے اقتصادی حالات کے مطابق ڈھلتا ہے۔ اور اسی کی اخلاقی قدروں سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی کی علمیت اور رسم و رواج سے کبھی وہ خود کو آراستہ کرتا ہے اور کبھی آئندہ زندگی کے نئے عمرانی، اقتصادی اور اخلاقی حادثات کے لئے مسلح ہوتا ہے اس لئے یہ دعویٰ غلط نہیں کہ فرد جماعت کی پیداوار ہوتا ہے۔ لیکن جماعت کیا ہے افراد کا ایک خاص مجموعہ، جو ایک فرد ہی کی طرح ان تجربات کو حاصل کر چکا ہے جنہیں ہر فرد حاصل کرتا رہتا ہے۔ جس طرح سے ایک فرد نشو و نما کے منازل طے کرتا رہتا ہے اسی طرح یہ افراد کا مجموعہ یعنی جماعت بھی ساکن نہیں ہے، بلکہ مسلسل بہتر سے بہتر صورت میں بدلتی رہتی ہے جس طرح ایک فرد اپنی جماعت کے تجربات سے متمتع ہو کر اس سے آگے اپنی انفرادی ترقی کرتا ہے اسی طرح جماعت بھی اپنی پیشرو جماعت پر اس کے اگلے تجربوں سے مستفید ہونے کے بعد اپنی

خصوصی فوقیت حاصل کرتی رہتی ہے۔ غرضکہ اس طرح افراد کی ترقی پر جماعت کی ترقی کا انحصار ہے۔ اور جماعت کی ترقی پر افراد کی ترقی کا۔ فرد اور جماعت ایک دوسرے سے اسی طرح متعلق ہیں جس طرح قطرہ اور دریا۔

کوئی فرد جب پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس کے وجود کے دو رُخ بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کا جسمانی وجود۔ دوسرا شعوری وجود۔ فرد اپنے شعوری رُخ سے چند جبلتیں لے کر پیدا ہوتا ہے جو ورثہ ہوتی ہیں اپنے ان ماں باپ کا، جو خود جماعت کے افراد ہوتے ہیں اور جو خود اپنی جماعت سے متاثر ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ جس طرح فرد کے وجود کے دو رُخ ہوتے ہیں، ویسے ہی جماعت کے بھی دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی دوسرا شعوری جسے عمرانی اور شعوری کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ عمرانی اس لئے کہ وہ اپنے قدرتی ماحول اور سماجی ماحول کا ایک مشترکہ نتیجہ ہوتا ہے۔ قدرتی ماحول میں اقتصادی پیداوار بہت اہم جزو ہے۔ اور شعوری ماحول میں اخلاقی اور معاشرتی حالت نہایت اہم جزو ہے۔ چنانچہ فرد کی جبلتیں جب جماعت کے دونوں رُخوں سے برسرِ پیکار ہوتی ہیں تو وہ جذبات کی صورت میں بدل جاتی ہیں۔ اور یہی جذبات تمام آرٹ یا ادب کی تخلیق کی بنیاد ہیں۔ لہذا ادب فرد کے جذبات سے اُبھرتا ہے اور جماعت کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ غمِ جاناں غمِ روزگار کی صورت اختیار کر لیتا ہے آپ بیتی جگ بیتی ہو جاتی ہے۔

آپ بیتی کو جگ بیتی ہونے تک درمیان میں چند کڑی منزلوں سے گذرنا ہوتا ہے اور یہیں بڑے بڑوں کا پانی مرتا ہے۔ وہ کڑی منزلیں کون کون سی ہیں پہلے تو الفاظ کا صحیح استعمال۔ موزوں اور مناسب بلکہ ناگزیر الفاظ جن کی نہ محض ترتیب اور حسن ترتیب ضروری ہے بلکہ اُن کے آہنگ بھی مجموعی طور پر

پڑھنے یا سُننے والوں کی نظر کے سامنے وہی منظر پیش کر دیں۔ جس سے خود آرٹسٹ دو چار ہو چکا ہے۔ اس لئے ایک ادیب کو نہایت حسّاس ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے اپنے ماحول کو سمجھ کر شدت سے محسوس کرنا نہایت ضروری ہے پھر اپنی قدرتِ الفاظ سے ان احساسات کو اس طرح الفاظ کا جامہ پہنانا چاہیئے۔ کہ سامعین بھی اسی شدت سے متاثر ہوں جس شدت سے ادیب خود متاثر ہو چکا ہے۔ یہ ٹکنیک اتنی مشکل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اتنی اہم ہے کہ اس سے بڑے بڑے ادیب بھی پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے آپ بیتی کو جگ بیتی بنانا ایک معمولی ادیب کے اختیار سے باہر ہے۔

اب آیئے اس شور و غوغا کی طرف جو ہمارے ترقی پسند اور مارکسی نقاد مچا رہے ہیں کہ ادب کو جماعتی ہونا چاہیئے۔ کیا مطلب ہے اس نعرے کا؟ ساحر لدھیانوی صاحب فرما رہے ہیں کہ یہ غیر ممکن ہے کہ جماعت میں رہ کر ادیب غیر جانبدار رہے۔ ادیب کو عوام کی طرف آنا چاہیئے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں کہ ہمارا ایک مطالبہ یہ ہے کہ ادب کو جماعتی ہونا چاہیئے۔ اس نے ایک طرف تو ہمارے مخالفوں کو مغالطے میں ڈال کر اعتراض کا نیا بہانہ پیدا کر دیا ہے۔ دوسری طرف خود ہماری جماعت میں کچھ معصوم اور کچھ دیوانے ایسے ہیں جنہوں نے اس نعرے کا جانے کیا مطلب سمجھ رکھا ہے۔ اپنے مخالفوں کو تو ہم صرف اتنا یاد دلا دینا چاہتے ہیں کہ ادب کو جماعتی ہونا ہی نہیں چاہیئے بلکہ وہ جماعتی ہوتا بھی ہے۔ یہاں مجنوں صاحب ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں ادب ضرور جماعتی ہوتا ہے کیونکہ ادیب خود کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہوتا ہے۔ اور اس حیثیت سے وہ جو کچھ سنتا، دیکھتا اور لکھتا ہے وہ سب جماعتی ہوتا ہے۔ لیکن ہونا اور بات ہے اور ہونے کے لئے حکم لگانا یا مطالبہ کرنا اور بات۔ ہونا اضطراری فعل ہے وہ ادیب کے قبضۂ قدرت

سے ماورا ہے۔ اور ہونے کے لئے کم لگانا کہ ادب ایسا ہونا چاہیے نہایت مضحکہ خیز ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شاعر یا ادیب سے یہ کہنا کہ آج سے تم بورژوا اور سرمایہ داروں سے ناراض یا متنفر ہو جاؤ۔ ادب کی تخلیق کوئی فوجی ڈرل نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی کپڑا ہے کہ یہ اتار دو۔ اور وہ پہن لو۔ نہ یہ کام نعرے لگانے سے پورا ہوتا ہے، کیونکہ ادیب اپنی جماعت کی یا (بہ الفاظِ صحیح تر) اپنے ماحول کی جو ترجمانی کرتا ہے محض غیر شعوری طور پر کرتا ہے اور اپنے جذبات کی مدد سے ادب میں اپنا جو خونِ تمنا شامل کر دیتا ہے وہ بھی غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ ادب زندگی کے لئے ہے اور زندگی عبارت ہے افراد کی مختلف جماعتوں سے، لیکن انہیں کسی سماج سے خواہ وہ پرولتاری ہی کیوں نہ ہو۔ زبردستی وابستہ کرنے کی تلقین کرنے والے تخلیقی ادب سے بڑی حد تک ناآشنائی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ادب کی تخلیق ایک وجدانی عمل ہے جس کا سرچشمہ ادیب کا ماحول ہے لہذا صحیح ادب وہی ہوگا جو ادیب کے ماحول سے متاثر ہو کر پیدا ہو۔ چاہے وہ سرمایہ دارانہ نظریہ کا حامل ہو۔ یا پرولتاری نظریہ کا۔ ہوگا وہ ادیب کے ماحول ہی کا آفریدہ۔ ادیب کے جذبات اپنے ماحول کے تجربوں ہی سے تحریک پاتے ہیں۔ ورنہ ادیب اگر رہتا ہو ایک جماعت میں اور اصولاً ترجمانی کرے دوسری جماعت کی تو اس کی تحریر میں وہ خلوص جو ادب کے لئے لازمی ہے پیدا ہی نہ ہوگا اس قسم کا ادب یا تو دوم درجہ کا یا ادنیٰ قسم کا ادب ہوگا۔ یا وہ صرف پروپیگنڈہ ہو کر رہ جائے گا۔ اس کی وجہ سے اوّل درجہ کا شاعر جوش کی "تہرانی" جیسی تخلیق تو کرے گا لیکن دوم در کا شاعر تاثیر کی "نورجہاں" سے کوسوں دور ہوگا۔ ہم تو قصداً اور بالارادہ کسی بھی جماعت کی ترجمانی کو خواہ وہ ادیب ہی کی جماعت کیوں نہ ہو، ادبی تنگ نظری سمجھتے ہیں۔ فرقہ وارانہ زاویۂ نگاہ ادب

کو محدود بنا دیتا ہے۔ ادب تمام بنی نوع انسان کی زندگی سے ہمدردی رکھے بغیر انسانی زندگی کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادب برائے زندگی ہے تو زندگی سے کسی مخصوص فرقے یا جماعت کی زندگی (خواہ اس کی کتنی ہی تعداد کیوں نہ ہو) مراد نہیں ہوتی۔ بلکہ تمام بنی نوع کی زندگی مراد ہوتی ہے اور پھر زندگی کو بہت بسیط معنیٰ میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اس میں صرف نوع انسانی کی کردار نگاری ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سے متعلق تمام لوازم حیات، عمرانی، اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی اور ان سے متعلقہ تمام امور کو زندگی میں شامل سمجھتے ہیں اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادیب اپنی ہی جماعت کے سرچشمہ سے ادب کی تخلیق کرتا ہے تو اس کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایک روسی ادیب ادب کی تخلیق کے لئے روسی ماحول سے مدد لے گا۔ نہ کہ جرمن یا فرانسیسی ماحول سے۔ ہومر نے یونانی زندگی سے، ورجل نے رومی زندگی سے، گوئٹے نے جرمن زندگی سے، شیکسپیئر نے انگریزی زندگی سے، میر و غالب نے ہندوستانی زندگی سے ادب کی تخلیق کی۔ بلکہ یہ چوٹی کے ادیب ان ان ملکوں میں بھی صرف اپنے گرد و پیش ہی کے بہترین ترجمان ثابت ہوئے اور اپنے گرد و پیش ہی کے حالات کو اس طرح بیان کر سکے کہ ہر زمان و مکان کے انسان کو ان میں اپنی ہی زندگی کی داستان نظر آئی۔ یہ کرشمہ ہے ان کی انسانی زندگی کی پُرخلوص ترجمانی کا، ان کی انسان دوستی کا، اس لئے بورژوا نواب ٹالسٹائی کے ادب میں لینن کو "روسی کسانوں کے انقلاب کے پرتو" دکھائی دئے۔ مارکس اور انگلز خود شیکسپیئر اور گوئٹے کے بڑے پُرجوش مداح تھے۔ حالانکہ یہ دونوں ادیب نہ صرف بورژوا ماحول کی پیداوار تھے۔ بلکہ شاہی درباروں میں بھی رہے تھے۔ لہٰذا "ادب جماعتی ہوتا ہے" کا فقرہ صرف اس حد تک صحیح ہے کہ ادب کی تخلیق میں جماعت کے افراد اینٹ اور گارے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

وہ صرف ذریعہ ہیں، مقصد نہیں، لیکن جب جماعتی ادب کا پیدا کرنا یا کسی خاص جماعت کا ساتھ دینا ادب میں مقصد بن جاتا ہے تو ادب کے دائرے کو محدود اور ادیب کو تنگ نظر بنا دیتا ہے۔

علاوہ اس تنگ نظری کے جب یہ نقاد جماعتی ادب پیدا کرنے کی تلقین فرماتے ہیں تو عموماً وہ پرولتاری جماعت کی اقتصادی اور اس پر منحصر سیاسی زندگی مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ ایک جماعت کے صرف سیاسی یا اقتصادی ہی رُخ تو نہیں ہوتے اس کے روحانی، اخلاقی، علمی اور مذہبی رُخ بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ صرف اقتصادی اور سیاسی رُخ پر اتنا ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں کہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی صرف اقتصادی زندگی کا نام ہے اور جس سے پیدا شدہ نعروں میں ادب کی غرض و غایت محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ ادب کو کسی سیاسی نظریئے کے پلّو سے باندھ دینے سے اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے۔ دنیا کے ادب العالیہ نے اکثر سیاست کا رُخ پھیر دیا ہے۔ لیکن جماعتی ادب کی موجودہ تحریک سے ادب سیاست کا غلام بن کر رہ جائے گا۔ چنانچہ لینن نے پرولتاری مقاصد میں سے جماعتی ادب کی تخلیق کو ایک مقصد قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ادب سیاست کے اشاروں پر ناچنے لگے گا۔ ادب کا کسی سیاسی نظریئے سے غیر شعوری طور پر متاثر ہونا اتنا غلامانہ نہیں ہے جتنا کہ شعوری طور پر اس کی پیروی کرنا۔

در اصل جماعتی ادب کی تحریک لینن کی پیداوار ہے وہ اوّل سیاستداں تھا اور بعد میں نقّاد ادب۔ علاوہ اس کے نئے روس میں اس کی حالت بھی کچھ ایسی تھی کہ وہ ادب کی قوت کو اپنے سیاسی نظریئے کی پشت پناہی کے لئے ضروری خیال کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ "کوئی شخص جو زندہ ہے اور جس نے

ایک جماعت کا دوسری سے رشتہ سمجھ لیا ہے وہ کسی نہ کسی ایک جماعت کا ساتھ دئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا اپنی جماعت کی کامیابیوں پر خوش اور اس کی تکالیف پر رنجیدہ ہونا لازمی ہے۔" دوسری جگہ لکھتا ہے کہ "جماعتی ادب کا اصول کہاں کار آمد ہوتا ہے؟ یقیناً سوشلسٹ پرولتاری جماعت میں، کیونکہ اس پر کسی ایک فرد کی اجارہ داری نہیں ہے اس لئے لعنت بھیجان غیر جماعتی ادبا پر اور لعنت بھیجو ان فوق البشر قسم کے ادیبوں پر! ادب کا مقصد یقیناً پرولتاری مقاصد کا ایک جزو ہونا چاہیے۔" اس کے باوجود لینن کو یہ احساس تھا کہ ادب تمام بندشوں کے علی الرغم بڑا گریز پا ہوتا ہے۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ ان اصولوں سے ادب کی آزادی قطعاً سلب ہو جائے گی۔ اور ادب ادب نہیں رہ سکے گا۔ اسی لئے اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ "یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اکثریت کے اقلیت پر دباؤ ڈالنے سے سب سے کم ادبی تخلیق ہی زبردستی ہمرنگ و ہموار کی جاسکتی ہے۔ اور نہ یہ کہنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اس ضمن میں شخصی ارادے اور انفرادی رجحانِ طبع کو زیادہ آزادی دی جانی چاہیے۔ اس طرح ادب میں انفرادی خیالات اور ہیئت اور مواد کے استعمال میں پوری آزادی ہونی چاہیے۔" آزادی کے اس فرمان کے بعد یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "یہ تو سب ٹھیک ہے کہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں، پھر بھی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرولتاری طبقے کے جماعتی مقاصد کا یہ ادب والا جزو زبردستی پرولتاریوں کے دوسرے جماعتی مقاصد سے ممتاز نہیں کیا جاسکتا۔" گویا لینن کو یہ احساس تھا کہ ادب کو سیاسی ڈھل نہیں بنایا جاسکتا۔ تاہم اس نے ادب اور ادیب کی آزادی کا بڑا مذاق اڑایا ہے اور اس بات کو ثابت کرنے پر بڑا زور صرف کیا ہے کہ ادب یا ادیب کبھی آزاد نہیں ہوسکتے۔ گویا

اس طرح اس نے بھی وہی بات کہی ہے جسے مجنوںؔ نے کہا ہے کہ "ادب کو جماعتی ہونا ہی نہیں چاہئے بلکہ ادب جماعتی ہوتا بھی ہے" اس نے بھی اس سے یہ عجیب منطقی نتیجہ نکالا ہے کہ "چونکہ ادب جماعتی ہوتا ہے اسی لئے ادب کو جماعتی ہونا چاہئے"

غرضکہ لینن کی اُٹھائی ہوئی یہ ادبی تحریک چل نکلی اور جیسا کہ قاعدہ ہوتا ہے "پیراں نمی پرند مُریداں می پرانند" اس کا بھی وہی حشر ہوا۔ لینن کو تو خیر ادیبوں کی آزادی کا خیال بھی تھا۔ لیکن بعد کے مارکسی نقاد تو ادب کو اپنی سیاست کا صرف حلقہ بگوش غلام بنانا چاہتے ہیں۔ لینن کے بعد سٹالن نے بھی جماعتی ادب پر بہت زور دیا ہے۔ ۱۹۴۶ء کی کمیونسٹوں کی ہی پارٹی کی کانفرنس منعقدہ ماسکو میں اس جماعتی ادب کی بڑی دھوم دھام رہی کیونکہ اس تحریک سے کمیونسٹ سیاستدانوں کو دو فائدے ہیں۔ اوّلاً اس تحریک سے وہ اپنے ملکی ادبا کو اپنے ڈھرّے پر لگا سکیں گے۔ روس کی ادبی تاریخ بتاتی ہے کہ زار کی شہنشاہیت کے دوران میں روس کی ادبی تحریکیں زار کیلئے سب سے زبردست خطرہ تھیں۔ چنانچہ اس تحریک سے وہ خطرہ جو اندرونِ ملک میں پرورش پاتا ہے دور ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے پارٹی کے مقاصد کو ادب میں داخل کر دینے سے اس کو سیاسی استحکام نصیب ہوگا۔ اس سے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بیرونی ممالک کے ان ادبا پر جو غیر اشتراکی ہیں آسانی سے لعنت بھی بھیج سکیں گے۔ حال کا ایک روسی نقاد اے مسنکوف لکھتا ہے کہ "ایک ادیب جس نے بورژوا دُنیا سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کر لیا ہے حقیقی آرٹ نہیں پیدا کر سکتا۔ کیونکہ اسے ان سماجی بے انصافیوں کو جو انسان پر انسان کا ظلم و تشدد روا رکھتی ہیں انصاف پر مبنی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُسے

دروغ گوئی سے کام لینا پڑتا ہے" لیجیے صاحب! ایک ہی جنبش قلم سے وہ تمام اعلیٰ ادیب جن کی ادب العالیہ میں جگہ ہے یکسر صاف ہو گئے کیونکہ ان کو اس وجہ سے کہ وہ بورژوا طبقے سے قطع تعلق نہیں کر سکے "حقیقی آرٹ" پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا۔ شہرہ آفاق جرمن شاعر گوئٹے کی تعریف کرتے ہوئے دوسری نقاد ملیروا لکھتی ہے کہ "موجودہ بورژوا کلچر جو اب خستہ ہو کر متعفن ہو چکا ہے اس کے علمبردار ماضی کے شاعرانِ اعظم کے کلام کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی ایک روشن دلیل وہ زاویۂ نگاہ ہے۔ جس سے وہ گوئٹے کے کلام کو پیش کرتے ہیں:" ان دو مثالوں سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ جماعتی لٹریچر کی تحریک نے ایک طرف ان کو ضرورت سے زیادہ زعمِ باطل میں مبتلا کر رکھا ہے۔ چنانچہ آج کسی روسی ادیب کا آپ مطالعہ کریں۔ اس میں ادبی تنقید کی بہت سی خوش فہمیاں کام کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔ اور دوسری طرف اسی زعمِ باطل نے انہیں نہایت تنگ نظر اور متعصب بنا دیا ہے۔ وہ ان تمام ادباء کو جو "ترقی پسند" نہیں ہیں خاطر ہی میں نہیں لاتے۔ ہم مانتے ہیں کہ مارکسی طریقۂ فکر نے ادب کو بہت کافی صالح خون دیا ہے۔ اور ادبی تنقید کو ایک نیا زاویۂ نگاہ بخشا ہے۔ ہماری بہت سی گمراہیوں اور غلطیوں کو صداقت کا راستہ دکھایا ہے۔ پھر بھی ادب کے یہ نئے علمبردار جماعتی ادب کی تنگ گلیوں میں گمراہ ہو چکے ہیں، اور جماعتی ادب کا غلغلہ ادبی تحریک سے زیادہ سیاسی تحریک ہے۔

سیاست کا دامن پکڑ کر ادب کی ناؤ کبھی پار نہیں لگتی۔ اس کی جڑیں بقول لینن جنتا میں گہرائی تک جانی چاہئیں۔" ایک مخصوص طبقے کی طرفداری شاعر اور ادیب کو اسی دروغ گوئی کی طرف لے جاتی ہے۔ جس کی طرف منکوف نے اشارہ کیا ہے۔ خواہ وہ طبقہ تعداد میں کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ تعداد کے زیادہ

ہونے سے صداقت اور حقیقت نہیں بدل جاتی۔ ہمارے اپنے ملک کے ترقی پسند ادباء کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ انہوں نے شاعری کو ردیف اور قافیوں سے تو آزاد کیا۔ لیکن اسے موضوع اور مواد میں قید کر دیا۔ یہ احاطہ بندی ردیف و قافیہ کی قید سے بھی زیادہ سخت نکلی۔ جب تک برطانیہ کی شہنشاہیت رہی، اور بہت سی سیاسی تحریکوں کی پیدا شدہ ایک جذباتی فضا بھی قائم تھی۔ اس وقت تک تو یہ ترقی پسند ادباء کسی حد تک کامیاب رہے مگر اب سیاسی نقشہ بدل چکا ہے ہندوستان اور پاکستان آزاد ہو چکے ہیں، اب بقول سلام مچھلی شہری کے کوئی سیاسی نعرہ نہیں رہ گیا ہے لہٰذا اُن کی ادبی سرگرمیاں بھی مدھم پڑ چکی ہیں۔

انتظار حسین

پرانی نسل کے خلاف ردِّ عمل

"تو دیکھ لیا تم نے آج کل کے نوجوانوں کو" پال پیٹروچ بولا "یہ ہیں ہمارے وارث"

"ہمارے وارث — ہاں" نکولائی پیٹروچ بڑے مایوسانہ لہجے میں کہنے لگا۔ "بھائی جان! مجھے ابھی ابھی ایک عجیب سی یاد آئی ہے۔ اماں جان سے ایک روز میرا جھگڑا ہو گیا تھا۔ وہ جھگڑا مجھے یاد آ رہا ہے۔ انہوں نے سارا گھر سر پہ اٹھا لیا اور میری بات سرے سے سنی ہی نہیں۔ آخر میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ میری بات سمجھ ہی نہیں سکتیں۔ آپ اور زمانے کی ہیں۔ میں اور زمانے کا۔ اس پہ وہ اور چراغ پا ہوئیں لیکن میں دل میں سوچنے لگا۔ میں بھلا اور کیا کرتا۔ گولی کڑوی ضرور ہو گی۔ لیکن اسے ان کے حلق میں اتارنا لازمی تھا اور اب ہماری باری ہے۔ اب ہم سے ہمارے وارث کہیں گے کہ ہم اور نسل کے لوگ ہیں اور اب آپ مہربانی کر کے اس کڑوی گولی کو نگل ہی لیجیے۔"

تورگنیف کے ناول *Father and sons* سے یہ اقتباس

میں نے پیش کرنے کو تو کر دیا ہے لیکن اب سوچتا ہوں کہ تورگنیف کے بوڑھے
کردار نکولائی پیٹروچ سے کچھ زیادتی تو نہیں ہو گئی۔ نئے ادب کی تحریک والوں کا
اس سے موازنہ اس حیثیت سے تو درست ہے کہ انہوں نے بھی اپنے زمانہ شباب
میں اپنی بزرگ نسل سے یہی کہا تھا کہ آپ اور نسل کے لوگ ہیں ہم اور نسل کے لوگ
ہیں یہ گولی بہت کڑوی ہے مگر آپ کو نگلنا ہی پڑے گی۔ اور اب ان کے خلاف
بھی کچھ اسی قسم کا ردّ عمل شروع ہو چلا ہے۔ لیکن نکولائی کے مزاج اور طرزِ عمل کو نظر
میں رکھئے تو یہ موازنہ اس غریب کے ساتھ اچھا خاصا ظلم ہے۔ جو بوڑھا اتنا
ہوشمند ہو کہ اپنی اولاد کی گستاخی پہ اپنی گستاخی کا زمانہ یاد کرے اور پھر نئی
تانتی کی بات کو سمجھنے اور اس کے ساتھ چلنے کی بھی کوشش کرے اس نے اپنے
زمانے میں اپنے اور اپنے بزرگوں کے درمیان سنجیدگی ہی سے کوئی اختلاف محسوس
کیا ہوگا۔ لیکن نئے ادب کی تحریک والوں کے خلاف جو ردّ عمل شروع ہوا ہے۔
اس میں یہ شک بھی شامل ہے کہ آیا انہوں نے اپنے اور اپنی بزرگ نسل کے درمیان
سنجیدگی سے کوئی اختلاف بھی محسوس کیا تھا۔ سعادت حسن منٹو صاحب سے یہ
بیان منسوب کیا جاتا ہے کہ لڑکی کے رخساروں کو گلاب سے کیوں تشبیہہ دی جائے
اور بندر کے پیٹ سے کیوں نہ دی جائے۔ یہ فقرہ صرف ان کی ذہنیت کا نہیں
بلکہ اس پوری نسل کا ترجمان نظر آتا ہے۔ یہ سب کے سب لوگ ایسی بات کرنے
کی کوشش میں تھے کہ لوگ چونک پڑیں اور ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اپنے
حساب سے وہ لوگوں کے چونکانے کے بالکل نئے طریقے استعمال کر رہے تھے۔ اور
واقعہ یوں تھا کہ وہ خاصے فرسودہ طریقے تھے۔ بہرحال وہ طریقے نئے ہوں یا پرانے
اتنا ظاہر ہے کہ ان کی تہ میں کوئی سنجیدہ تخلیقی لگن کارفرما نہیں تھی۔ تخلیقی لگن اظہار
چاہتی ہے۔ نمود نہیں۔ نمود کی خواہش کا تعلق ادیب بننے کے شوق سے ہے اور ادیب

بننے کا شوق اور تخلیقی لگن یہ دو بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ نئے ادب کی تحریک کے لوگ ادیب بننے کا تو بے شک بڑا شوق رکھتے تھے لیکن تخلیقی لگن سے محروم تھے درصل جن حالات میں اس تحریک کا آغاز ہوا اُن کا تقاضا یہی تھا۔ لارڈ میکالے کے بخشے ہوئے نظام تعلیم نے لکھ پڑھ لینے والوں کی تعداد میں اب اتنا اضافہ کر دیا تھا کہ اس نے ایک پورے طبقہ کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس نظام تعلیم کا مقصد کلرک پیدا کرنا تھا نہ کہ ذوق پیدا کرنا۔ لکھ پڑھ لینے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے کلرکیوں کا توڑا پڑ گیا اور اس سے اس طبقہ میں محرومی اور ناکامی کا احساس پیدا ہوا۔ جن لوگوں کو کلرکی مل گئی تھی وہ ڈبل روٹی کھا رہے تھے، اور خوشی سے پھول رہے تھے۔ جن لوگوں کو کلرکی نہیں مل سکی تھی وہ جل جل کے جھلنگا ہو رہے تھے۔ اپنے آپ کو اور دوسروں کو کوسنے دے رہے تھے۔ قدیم انسان کی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب کسی بستی میں پیداوار کے ذرائع ناپید یا محدود ہو جاتے تھے تو لوگ گروہ در گروہ مختلف سمتوں میں چل پڑتے تھے۔ اور جہاں تہاں پرانت کا سامان دیکھتے تھے وہیں ڈیرے ڈال دیتے تھے۔ ہمارے یہاں اس زمانے میں انسان کی اس پرانی عادت نے ایک ذرا بدلی ہوئی شکل میں اپنا اظہار کیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں سے مایوس ہو جانے والے نوجوانوں کے ایک گروہ نے اپنی سماجی حیثیت بنانے کیلئے ایک نیا راستہ ٹٹولا۔ اور ادب کی دنیا میں چھاؤنی چھائی۔ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" ادب نہ بن سکے یہ اور بات ہے۔ ان لوگوں کا دل دُکھا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایسی گرمی پیدا ہو گئی جس کی آنچ ہر وہ قاری محسوس کر سکتا تھا جو ان کی طرح محرومیوں سے دوچار تھا۔ پھر ان کی ذاتی محرومیوں نے ایک اور گُل کھلایا۔ کمبخت بے روزگاری بڑی بُری چیز ہوتی ہے۔ طبیعت چڑچڑی سی ہو جاتی ہے۔ ہر وقت خون کھولتا رہتا ہے۔ ہر بات پہ اور ہر چیز پہ

غصہ آتا ہے۔ ہر مسلّمہ روش کا مُنہ چڑانے اور اس پہ لعنت بھیجنے کو جی چاہتا ہے۔ بیروزگار نوجوانوں کی اس عام عادت نے ادب میں آکر روایت کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کرلی۔ یوں بھی چونکہ ذاتی زندگی میں یہ لوگ امتیاز حاصل نہیں کرسکے تھے۔ اس امتیاز حاصل کرنے اور نمایاں بننے کی کچلی ہوئی خواہش نے یہاں ادبی بغاوت اور بدعت کی شکل میں نمودار ہوکر آسودگی حاصل کی۔

اس تحریک کا ذاتی ناکامیوں سے کس گہری حد تک تعلق تھا اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ جب نئے لکھنے والوں کو ذاتی زندگی میں تھوڑا اطمینان نصیب ہوا تو ان کا لکھنے کا وہ ذوق وشوق ٹھنڈا پڑنے لگا۔ بعض بزرگوں نے تو جنہیں ذرا بڑے عہدے حاصل ہوگئے تھے۔ بستہ باندھ کے ایسا رکھا کہ پھر اس مکتب کا رُخ ہی نہیں کیا۔ پھر بھی ایک اچھا خاصا گروہ ادب سے وابستہ رہا۔ کچھ اس وجہ سے کہ اکثروں کی ذاتی محرومیوں کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا تھا کچھ اس کے تحت کہ ادب ذریعۂ عزت بن ہی گیا ہے تو اس ذریعہ کو ہاتھ سے کیوں گنوایا جائے۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ بعضوں کو ادب سے اب واقعی ایک لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ تاہم وہ پہلی سی گرماگرمی بہر صورت ختم ہوگئی۔ نئے ادب والوں کی زندگی سنورنے اور نئے ادب کی تحریک کے بکھرنے اور ٹھنڈا ہونے کی تاریخ ساتھ ساتھ شروع ہوتی ہے۔ اس واقعہ نے ہمارے یہاں ادب کے متعلق دو بڑے گمراہ کن اور لغو تصور پیدا کردئے ہیں۔ ایک یہ کہ ذاتی آسائش ادب کی تخلیق میں ہارج ہوتی ہے۔ ادیب کو لازمی طور پر مفلس اور پریشان حال ہونا چاہیے۔ دوسرا یہ کہ عام روزمرہ کی زندگی ادب کی تخلیق کا محرک نہیں بن سکتی۔ ادب کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ معمول سے ہٹ کر کوئی واقعہ ہو۔

پہلے تصوّر کا تعلق زیادہ تر قارئین سے ہے جس پر میں یہاں بحث نہیں کروں گا دوسرے تصوّر کا تعلق زیادہ تر خود ادیبوں سے ہے۔ اور اس نے ان کے لکھنے کی روش کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس لئے اس پر ضرور نظر ڈال لینی چاہئے۔ نئے ادب والوں کی جب ذہنی نجی معاشی اُلجھنیں اور اس کے ساتھ جنسی الجھنیں کم ہونے لگیں تو ان کے لئے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ ... اب کس بات کے بارے میں لکھا جائے؟

یہ سوال اس پوری نسل کو اس وقت سے لے کر اب تک بری طرح پریشان کئے ہوئے ہے۔ ان کی یہ پریشانی اس جن کا قصہ یاد دلاتی ہے جو کسی عامل کے قبضہ میں آگیا تھا۔ عامل کا بتایا ہوا ہر کام وہ جھٹ پٹ کرتا اور پھر سامنے آکر کھڑا ہوتا کہ "اب کیا کروں" عامل غریب نے تو یہ سمجھا تھا کہ ایک خدمتگار مل گیا ہے مگر یہ خدمتگار اس کے لئے بلائے جان بن گیا۔ ادیبوں کی اس نسل کا بھی یہی عالم ہے، وہ ادب کے عامل کے قبضہ میں آگئے ہیں، کوئی واقعہ ہوتا ہے اس پر جھٹ پٹ افسانے لکھتے ہیں۔ شعر کہتے ہیں اور پھر سوال کرتے ہیں کہ "بتائیے اب کا ہے پر لکھیں؟" یہ اس نسل کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ایسے عہد میں پیدا ہوئی جب غیر معمولی واقعات کچھ کثرت سے ہونے لگے ہیں۔ مگر غیر معمولی واقعات کے درمیان وقفہ تو آنا ہی ہے۔ اور یہ وقفہ ہمیشہ اُن پر بڑا کٹھن گذرا ہے۔ اس نسل کے عروج کے زمانے میں اگرچہ دنیا ایک بہت بڑے واقعہ سے دوچار تھی اور اکثر ممالک میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ لیکن ان ادیبوں کے لئے یہ ذرا دُور کی بات تھی۔ اب اس کے بارے میں ان کی روش دیکھئے کہ کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ ایک روایت کے مطابق کرشن چندر یہ کہتے ہوئے سُنے گئے تھے کہ اگر جاپانی ہندوستان پر حملہ کر دیں اور ملک میں کچھ گڑبڑ ہو تو ادب پہ بہار آئے۔ اس نسل کے دوسرے افسانہ نگار سعادت حسن منٹو صاحب

کا حال یہ ہے کہ بمبئی کے اس دفتر کے روزانہ چکر کاٹتے تھے جہاں جنگ کے واقعات کی تفصیلات کے ریکارڈ رہتے تھے اور مفتوح ممالک کی عورتوں کی بے حرمتی اور قتل وغارت کے قصّے پوچھتے پھرتے تھے۔ ایک تیسرا گروہ نفسیاتی افسانہ نگاروں کا تھا جو جنگی دفاتر کی بجائے نفسیات کی کتابوں سے رجوع کرتے تھے۔ اب یہ دیکھئے کہ ان دونوں بزرگوں اور اس تیسرے گروہ کے افسانے کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ مگر یہ دیکھئے کہ ادبی تخلیق کے بارے میں دونوں کا نظریہ بالکل ایک سا ہے۔ دونوں ادب کو صحافت سمجھتے ہیں۔ اپنے الگ الگ رنگ اور الگ الگ مزاج کے باوجود کرشن چندر اور منٹو کا یہ ذہنی اتحاد اتفاقی نہیں ہے وہ اس پوری نسل کے ذہنی اتحاد کا ترجمان ہے۔ وہ پوری نسل ہی ادب کی تخلیق کے متعلق ایسا نظریہ رکھتی تھی۔ جو ادب کو صحافت کے پہلو میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اندرے ژید نے ڈوسٹووسکی پر لکھتے ہوئے کچھ اس قسم کی بات لکھی ہے کہ دیکھنے کی نیت سے دیکھنا غلط ہے۔ جو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلتے ہیں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ منٹو اور کرشن چندر کی پوری نسل کے ساتھ یہی واردات گذری ہے۔ وہ بار بار دیکھنے کیلئے گھر سے نکلے اور انہیں دکھائی نہیں دیا۔ جب اپنی محرومیوں کی آگ بجھ گئی تو وہ باہر سے آگ لینے کے لئے نکلے۔ اور اس توقع کے ساتھ کہ ساتھ میں پیمبری بھی ملیگی آگ انہیں بے شک مل گئی، کبھی جنگ سے، کبھی بنگال کے قحط سے، کبھی فسادات سے لیکن آگ اور پیمبری لازم وملزوم تو نہیں ہیں۔ اور آگ تو بہانہ تھی، موسیٰ کو پیمبری یوں بھی ملتی۔ اس بہانے نہ سہی، کسی اور بہانے ملتی۔ شاعری اور ادب بے شک پیمبری کا جزو ہیں۔ لیکن اس نسل کے مزاج میں یہ جزو شامل نہیں تھا اس لئے آگ محض آگ ہی رہی، پیمبری کا بہانہ نہ بن سکی۔ اور ان کے لئے تو خود آگ کا لانا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ جاپان نے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا اور مختلف افسانہ نگار جنگی دفتروں

کے قائل دیکھتے دیکھتے بور ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء سے بہت پہلے نئے ادب کی تحریک کا بازار بہت سرد پڑ چلا تھا۔ اگر حالات معمول پر رہتے تو شاید انہیں دنوں اس نسل کے خلاف ردِّ عمل شروع ہو جاتا اور ادبی تخلیق کی کسی مناسب فضا کا سامان پیدا ہوتا لیکن ایک غیر معمولی واقعہ پھر ہو گیا جس نے اس نسل کی موت کو ملتوی کر دیا۔ ۴۷ء کے فسادات نے بہت سے قابل قدر تہذیبی ورثوں کو خاک میں ملا دیا لیکن نئے ادب کی تحریک کی موت اس کی وجہ سے ملتوی ہو گئی افسانہ نگار اور شاعر آگ کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور یکایک انہیں آگ مل گئی۔ اب کسی ادیب کو جاپان کے حملے کی دعا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، نہ کسی دفتر کے فائلوں میں سر کھپانا ضروری تھا۔ اب سب کچھ سامنے ہو رہا تھا۔ فسادات نے اس سُست پرانی نسل کے لئے قینچی کا کام کیا۔ سرد ہوتے ہوئے خون میں پھر کچھ حرارت پیدا ہوئی۔ اور اس کے ساتھ بے تحاشا افسانے، نظمیں اور غزلیں آنی شروع ہوئیں لیکن یہ حرارت بڑھاپے کی حرارت تھی۔ اس میں وہ تیزی اور شدت نہیں تھی جس کا مظاہرہ زمانۂ آغاز کے نئے ادب میں ہو چکا تھا۔ فسادات نے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔ فکر میں شدت پیدا نہیں کی تھی۔ فسادات یہ کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ہنگامہ خواہ اس کی شکل فسادات کی ہو یا جنگ کی، جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ فکر کو نہیں۔ ایسے حالات میں لوگ رقیق القلب ہو جایا کرتے ہیں۔ سوچتے نہیں ہیں میں نے محرم کے دنوں میں دیکھا ہے کہ محلے کے لونڈے تک نوحے کہنے لگتے ہیں۔ یہ تو اس سوگوار فضا کا اثر ہوا۔ اب ان لونڈوں کو انیس کے پہلو میں تو کھڑا نہیں کیا جا سکتا مگر فسادات کے دنوں میں لکھی ہوئی دو تین کتابوں کے بارے میں سنجیدگی سے یہ پروپیگنڈا وغیرہ کیا گیا کہ انہیں پاکستانی مسلمانوں کے ہر گھر میں ہونا چاہیئے۔ یوں مسلمانوں کے ہر گھر میں کسی کتاب کا ہونا اس کی ادبی وقعت کی دلیل نہیں بن سکتا لیکن ہمارے ادب کی

تاریخ میں دو سنجیدہ ادبی تصانیف واقعی ایسی ہیں جو ہندوستان کے ہر مسلمان کے گھر میں پہنچ گئی تھیں ۔ مسدس حالی اور شکوہ اقبال ۔ لیکن وہ کسی نقاد کی وکالت سے نہیں بلکہ اپنے زور پہ مسلمانوں کے گھروں میں پہنچی تھیں ۔ اور نہ صرف گھروں میں پہنچی تھیں بلکہ دلوں میں اُتری تھیں، وہ محض آگ نہیں تھیں، ان میں پیمبری کا جزو بھی شامل تھا۔ ان نقادوں کی نیت واقعی نیک تھی۔ ادب کے نقاد کی حیثیت سے نہ سہی، سچے مسلمان ہی کی حیثیت سے سہی، لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایندھن سے جلی ہوئی آگ لاکھ شعلے بھڑکائے، بجھ ہی جایا کرتی ہے۔ نہ بجھنے والی آگ تو بس دل کی آگ ہوتی ہے جس کے یہ افسانہ نگار اور شاعر قابل ہی نہیں تھے ۔ چنانچہ فسادات کا ہنگامہ ختم ہونے کے ساتھ ساتھ نئے ادب کا بازار پھر ٹھنڈا پڑنے لگا۔ عسکری صاحب آدمی نبض شناس ہیں ۔ انہیں بہت جلدی اس صورتِ حال کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۸ء ہی میں انہوں نے ایک مضمون ادب کے نئے نسخے کے عنوان سے لکھا اور مخصوص طور پہ پاکستان کے ادیبوں کو یہ سمجھایا تھا کہ اب یوں کام نہ چلے گا ۔ ادب کی تخلیق کا کوئی نیا نسخہ دریافت کرنا چاہیے ۔ اور نسخے دریافت کرنے اور استعمال کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ عسکری صاحب کا مشورہ دُرست تھا۔ اب واقعی اس نسل کو ایک نسخے کی ضرورت تھی۔ لکھنے والوں کی زندہ نسل کو لکھنے کے لئے کسی نسخے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انہیں نسخے کا خیال ہی نہیں آتا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے لکھنے کا طریقہ بعد میں ایک نسخہ بن کر رہ جاتا ہے ۔ لیکن ایک مرتی ہوئی نسل کو زندہ رہنے کے لئے کسی نہ کسی نسخہ کا استعمال کرنا ہی پڑتا ہے ۔ یہ نسخہ بالآخر عسکری صاحب ہی نے تجویز کیا لکھنے کی رفتار جب روز بروز سُست پڑتی چلی گئی ۔ تو انہوں نے آخر ایک دن ادب میں جمود پیدا ہو جانے کی شکایت کی ۔ اور اپنے ہمعصر پاکستانی افسانہ نگاروں کو مشورہ دیا کہ بھائی پنجاب میں قومی عزم کا اتنا بڑا مظاہرہ ہوا ہے۔

وہاں لوگ نہر کھودنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس پر ناول کیوں نہیں لکھتے۔ عسکری صاحب خود چائے کی پیالی میں طوفان اُٹھا چکے ہیں اب وہ دوسروں سے ہانڈی کے اُبال پر لکھنے کی اپیل کر رہے تھے۔ مگر یہ کوئی نیا نسخہ تو نہیں تھا۔ وہی کرشن چندر اور منٹو کے استعمال شدہ مجرب نسخہ کا پاکستانی ایڈیشن تھا۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے نسخے کی ترمیم شدہ نقل کے مطابق بھی چند ایک افسانے لکھے اور نہروں کا پانی بند ہو جانے اور اسی قسم کے دوسرے قومی واقعات کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر وہ افسانے اس واقعے سے بھی زیادہ پھسپھسے نکلے۔ اس قسم کے ایک افسانے "یزید" پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بزرگ نے لکھا ہے کہ زندگی کربلا نہیں ہے' اودھ پنچ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر نسل کا زندگی کے متعلق اپنا ایک تصوّر ہوتا ہے۔ زندگی کو کربلا سمجھنے کے لئے جس کردار کی ضرورت تھی اس سے یہ نسل یکسر محروم تھی۔ اس کا ادب بھی تو اودھ پنچ کے لطیفوں کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔

چند دن تک ادب میں جمود کا خاصا چرچا رہا۔ پُرانی نسل کے تمام لوگ اور بالخصوص نقاد اب بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ انہیں ایمان رکھنا بھی چاہئے۔ ادب اگر ان پُرانے لوگوں کی تحریروں سے عبارت ہے تو ادب میں واقعی جمود ہے۔ لیکن اگر ذرا زاویہ بدل کر دیکھا جائے تو بات صرف اتنی ہے کہ لکھنے والوں کی ایک نسل ختم ہو چکی ہے اس کے جتنے امکانات تھے وہ سب بروئے کار آ چکے ہیں ادب کی تاریخ اب ان سے وابستہ ہی نہیں ہے اس لئے ان کی خاموشی نہ تو ادب میں جمود کی وجہ قرار دی جا سکتی ہے اور نہ ان کی سرگرمی ادب کی زندگی سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ آج کے لوگ ہیں ہی نہیں۔ جس دَور کے وہ لوگ ہیں اُس دَور کا ادب تخلیق کرنے کا نسخہ ہی آج بیکار ہو چکا ہے۔ اس نسخے کے خلاف عام ردِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اب وہ ادب کی تخلیق کا نہیں بلکہ صحافت پیدا کرنے کا نسخہ

سمجھا جاتا ہے اور اس سے جو حرکات و سکنات وابستہ ہیں انہیں بازاری پن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مجھے اس موقعہ پر اس نسل سے پہلے والی نسل یاد آرہی ہے۔ جگر مراد آبادی اس زمانے کے مقبول شاعر تھے اور ان کی مقبولیت کی وجہ سے ترنم سے غزل پڑھنا اور بال بکھیرنا بھی شاعروں اور شاعروں کے قدردانوں میں بہت مقبول تھا۔ ان لوگوں کی نسل کے ساتھ اس کا شعر کہنے کا نسخہ اور چال ڈھال کا وہ فیشن متروک ہو گیا۔ بس مشاعروں میں ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کے بعد والی نسل ادب کی تخلیق کا ایک نیا نسخہ اور چال ڈھال کا ایک نیا فیشن لے کر آئی جس میں لوگوں کو چونکانے کی کوشش کا بڑا عمل دخل تھا اور اس قسم کی کوشش مخصوص طور پر صحافیانہ مزاج کی ترجمان ہے۔ یہ پوری نسل بالاعلان پوچھ رہی تھی کہ صاحب لڑکی کے رخساروں کو گلاب سے کیوں تشبیہہ دی جاتی ہے۔ بندر کے پیٹ سے تشبیہہ دینے میں آخر کیا مضائقہ ہے۔ وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ پہلی مرتبہ اتنی رومان شکن بات کر رہی ہے حالانکہ خود اس میں ایسے لوگ شامل تھے جو فرانسیسی ادب سے اس قسم کی مثالیں چن کر پوری کتاب مرتب کر سکتے تھے۔ بلکہ فرانسیسی ادب سے ترجمہ کی خواہ مخواہ زحمت کیوں کی جائے اودھ پنچ میں بھی ایسے لطیفے مل جائیں گے اودھ پنچ کے زمانے میں کسی عاشق نے ایک نوجوان عورت کے گولی مار دی تھی۔ گولی سینے پر لگی لیکن عورت بچ گئی۔ اودھ پنچ نے یہ خبر ان الفاظ میں شائع کی کہ بس دودھ کا کلھڑ پھوٹ گیا باقی کچھ نہیں بگڑا۔ منٹو صاحب کی تشبیہہ کے مقابلے میں یہ تشبیہہ زیادہ موزوں اور زیادہ رومان شکن ہے لیکن اودھ پنچ والے اتنے ایماندار تھے کہ انہوں نے ان لطیفوں میں سرخ و سیہ حاشئے لگا کر ادب کے طور پر پیش نہیں کیا اسے صحافتی لطیفہ ہی قرار دیا مگر ان افسانہ نگاروں نے اس لطیفہ کو اپنے فن کا اصل جز بنالیا۔ لیکن کیسی ہی چونکانے والی بات ہو آدمی ایک مرتبہ چونکے گا دو مرتبہ

چونکے گا لیکن تیسری مرتبہ جھنجھلا جائے گا کہ یہ تو ہوا مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں ؟
منٹو صاحب کے تازہ افسانوں کی کیفیت ایسی ہے گویا تیسری مرتبہ وہ کہہ رہے ہوں کہ صاحب لڑکی کے رخساروں کو بندر کے پیٹ سے کیوں تشبیہہ نہیں دیجاتی ' آج کا قاری جھنجھلا کر سوال کرتا ہے کہ اچھا یہ تو ہوا، آگے کہئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں' آگے کیا کہنا چاہتے ہیں یہ منٹو کو معلوم نہیں ہے۔ منٹو کی پوری نسل کو معلوم نہیں ہے۔
اشفاق صاحب نے منٹو کے تازہ افسانوں کو جرائم پیشگی کے ان افسانوں کی کڑی سمجھا ہے جو پینگوئن کی سبز کتابوں میں شائع ہوتے ہیں مگر اشفاق صاحب کو معلوم نہیں یہ احساس کیوں نہیں ہے کہ پینگوئن کی سبز کتابیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ چونکا دینے والے اور سنسنی پیدا کرنے والے واقعات ان میں بیان ہوتے ہیں ان کی تکرار نہیں ہوتی ۔اسی چونکا دینے والی روش سے اس نسل کے مزاج کے متعلق ایک دوسری بات نکلتی ہے جب لڑکا نیا نیا بالغ ہوتا ہے اسے اپنی ہر حرکت نئی چیز نظر آتی ہے اور وہ اپنی ذات کو پوری دنیا کا محور سمجھتا ہے۔اسی احساس کے ساتھ وہ رومان لڑاتا ہے اور رومان شکن باتیں بھی کرتا ہے۔ نئے ادب کی تحریک والوں کا مزاج کچھ اسی قماش کا تھا وہ اپنے آپ کو پوری کائنات کا مرکز سمجھ رہے تھے۔اسی لئے ان کی تحریروں میں "میں" کا بہت عمل دخل ہے۔یوں سمجھئے کہ پورا نیا ادب واحد متکلم کا صیغہ ہے اور اس میں اتنی گنجائش بہت کم پیدا ہوتی ہے کہ جمع غائب بھی اس میں سما جائے۔
صحافت اور بلوغت ان دو عناصر سے مل کر نئے ادب والوں کی نسل کا مزاج بنا تھا۔یہ کس قدر حیران کن بات ہے کہ ان میں سے اکثر دن کی پہاڑ سی زندگی پڑی ہے اور ان کا قلم بالکل تھک چکا ہے۔ ورنہ پختہ عمر میں آ کر تو بھلے ادیب اپنا اصل کام شروع کیا کرتے ہیں۔ یہ حیران کن بات بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اس تحریک کے پیچھے سچا تخلیقی جذبہ کام نہیں کر رہا تھا بلکہ جوانی کا جوش، نمود کی خواہش، نمایاں بننے کی

کوشش' یہ چیزیں کارفرما تھیں' عسکری صاحب اس مزاج کی مدافعت پہ بدستور ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان دنوں انہیں "خالص ترین ناول نگار جیمز جوائس" کی یاد آئی ہے جس نے اپنے ناول کے پروف پڑھتے پڑھتے روزانہ اخبار کی خبریں ناول میں داخل کر دیں مگر یہ تو اس بات کی مثال ہے کہ تخلیقی مزاج روزانہ کی خبروں پر بھی تخلیق کی عمارت کھڑی کر لیتا ہے۔ یہ مثال ان لوگوں کا دفاع نہیں کر سکتی جو افسانے کو روزانہ کی خبر بلکہ اس سے بدتر بنا دیتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ معلوم نہیں کہ عسکری صاحب نے منٹو کے ایک افسانے کے نیچے ایک خبر کا حوالہ دیکھ کر اس کے جواز میں یہ مثال پیش کی ہے یا منٹو صاحب نے اپنا افسانہ لکھنے سے پہلے ان سے یہ مثال سن رکھی تھی۔ مختصر یہ کہ نئے ادب کی تحریک مزاج کے اعتبار سے تخلیقی تحریک نہیں تھی لیکن اسے یکسر رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو یہ کہ اس نے ایک تاریخی ضرورت کو پورا کیا دوسرے یہ کہ اس غیر تخلیقی تحریک کے تحت تخلیقی کام بھی ہوا۔ بظاہر میری بات میں اب تضاد پیدا ہو گیا ہے لیکن یہ تضاد نہیں ہے۔ اس تحریک نے تاریخی ضرورت تو اس اعتبار سے پوری کی کہ ہمارے ادب میں واقعی ایک جمود کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور اقبال کے ظہور کے باوجود تجربے کرنے اور اظہار کے نئے رستے تلاش کرنے کی روش نہیں چلی تھی۔ نئے ادب کی تحریک نے اپنی غیر ادبی روش کے باوجود اس کے لئے راہیں کھول لیں۔ رہی دوسری بات کہ اس غیر تخلیقی تحریک کی سرپرستی میں تخلیقی کام بھی ہوا' سو اس میں تضاد کی کون سی بات ہے۔ ادب تو کمبخت ایسے ایسے رستوں سے نکل کر آتا ہے جہاں سے ہمیں اس کا سان و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یاروں نے اخباروں میں قلم چلاتے چلاتے بھی ادب تخلیق کیا ہے اور خطوط لکھتے لکھتے بھی ادبی نثر پارے لکھے گئے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس تحریک کے تحت جو تخلیقی کام ہوا اسے اہمیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس تحریک کے خلاف جو ردعمل

شروع ہوا ہے اس میں یہ احساس بھی شامل ہے کہ جن شاعروں اور افسانہ نگاروں
نے واقعی تخلیقی کام کیا انہیں کبھی نمائندہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکی مگر یہ اس
دَور کے اور اس نسل کے مزاج کی بات ہے۔ وہ مزاج منٹو ہی قبول کر سکتا تھا،
غلام عباس قبول نہیں کر سکتا تھا میراجی کی شاعری میں اگر اس نسل کے صحافت
مزاج لوگوں نے Scandal کا ایک پہلو نہ ڈھونڈ نکالا ہوتا تو انہیں اس
حد تک بھی تسلیم نہ کیا جاتا جس حد تک تسلیم کیا ہے۔

اس پورے مزاج کے خلاف ایک ردّ عمل یقیناً شروع ہو چکا ہے لیکن سوال
یہ ہے کہ یہ ردّ عمل محض منفی ہے یا اس کا کوئی اثباتی پہلو بھی ہے۔ یہ اثباتی پہلو
کیا ہے؟ نئی نسل اگر اپنا کوئی الگ مزاج رکھتی ہے تو اس مزاج کے اجزائے ترکیبی
کیا ہیں؟ یہ سوالات میرے موضوع سے خارج ہیں اور الگ بحث کے طالب ہیں۔
لیکن جس ردّ عمل کا میں نے ذکر کیا ہے اس کی منفیت بذاتِ خود ایک مثبت چیز
ہے۔ ادب اور فن کے ہر شعبے میں پرانے نسخے متروک قرار دئے جا چکے ہیں' اور
نئے رستوں کی تلاش جاری ہے۔ اس عہد کا جو بھی مزاج ہے وہ بہر حال نئے لوگوں
ہی کی تخلیقات میں عکس پذیر ہوگا۔ وقت کی روش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ

مرنے والوں کو مرنے دوں جینے والوں کو اپناؤں

سید اختر علی تلہری (شاہجہانپور)

انسانیت دوست ادب

موجودہ زمانہ اپنے لب و لہجہ اور سیرت عمل کے لحاظ سے نمایاں طور پر انقلابی زمانہ ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے واضح عنوان سے ہٹتی نظر آرہی ہے۔ افکار و خیالات کو پیہم جھٹکے لگ رہے ہیں۔ تیزی سے بدلنے والے ان حالات نے ہمارے ادب میں بھی نئے میلانات پیدا کئے ہیں۔ اب خالص لذت جوئی (استلذاذیت) کی لے اس کے کانوں کو نہیں بھاتی۔ اب وہ اپنے نغموں میں "مقصدیت" کا رس پیدا کرنے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ شعر و ادب کے رنگ روپ میں ماحول کی مناسبت سے اس تغیر کا پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ اور ہمیں نہایت کشادہ دلی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے مگر خدشہ کی بات یہ ہے کہ اس تغیری کروٹ سے وہ ادیب جن کی ادبیت مخصوص سیاسی نظریہ کے چشم و ابرو کے اشاروں پر رقص کرنا آرٹ (فن کاری) کا کمال سمجھتی ہے سیاسی پروپیگنڈے کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تمام ادب کو سرخ سیاسی تحریکوں کا نقیب بنا دیا جائے۔ اب خواہ اس طریقہ سے ادب و شعر کو خون کے تیز دھارے ہی پر کیوں نہ بہنا پڑے۔

یہ تو بالکل صحیح ہے کہ ہمیں اپنے ادب کی کائنات خالص رنگین خیال کی طلسم آرائیوں ہی کے لئے وقف نہ کر دینا چاہیئے۔ یہ وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کر دینا ہوگا۔ جس کی سزا مختلف طریقوں سے ہمیں بھگتنا پڑے گی۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مقصد پسندی کی آڑ لے کر ادب و شعر کو ایسی تحریکوں کا خاص الخاص مبلغ بنا دیں جو کلیت پسندانہ تسلطائیت کا دودھ پی کر پلتی ہیں اور اپنی فطرت کے دباؤ سے آگ اور خون کے نقشے اُبھارتی ہیں۔

موجودہ حالات کا ہمیں سختی سے غیر جانبداری کے ساتھ تجزیہ کرنا ہے۔ اور ان کے تقاضوں کو سمجھنا ہے تاکہ موجودہ انقلاب کی آب و ہوا انسانیت کے ارتقاء کے لئے ناسازگار نہ بن سکے۔

انقلابی رَو نے ہمیں جن حالات کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ بہت ہی خطرناک ہیں۔ انسانی سماج کا گلا گھونٹنے کے لئے چاروں طرف سے مختلف قوتوں کے ہاتھ بڑھ رہے ہیں۔ اور انہیں نظریوں کے تحت جنہیں خوش حالی اور عام آسودگی کا ذمہ دار بتایا جاتا ہے۔ انسانی قدروں کا خون ہو رہا ہے۔ پہلے زیادہ سے زیادہ منظم طور پر انسانی آزادی لوٹی جا رہی ہے اہلِ ثروت کی دست درازیاں تہی دست انسانوں کی زندگی اور ان کی عزت سے کھیل رہی ہیں۔ عشرت و آسائش کی فضائیں ایک لمحہ کے لئے انہیں سانس لینے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے۔ مختلف ٹولیوں میں آدم کی اولاد نے اپنے کو بانٹ لیا ہے اور پھر یا تو کھلے بندوں ایک دوسرے کے گلے کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ اور یا چپکے چپکے ایک دوسرے پر مکر و فریب کے حربے آزما رہے ہیں۔ دلوں میں کچھ ہے۔ زبانوں پر کچھ ہے۔ ہاتھوں میں کھلے ہوئے "نشتر" ہیں۔ اور آستینوں میں "دشنے" چھپے ہوئے ہیں۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ تسلطائی رجحانات، جن کا ایک پہلو یہ ہے کہ زیر دستوں اور کمزوروں

کو اپنے مخصوص اغراض کے حاصل کرنے کے لئے بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ بغیر کسی لحاظ اور پرواکے استعمال کیا جائے۔ پوری قوت کے ساتھ دنیا پر اپنا حاکمانہ اقتدار قائم کرنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ انسانیت کو تباہ کرنے والے یہ رجحان اگر روکے نہیں جاتے تو یہ انقلاب انسانی زندگی کا مستقبل نہایت ہی تاریک بنا دے گا۔ ایسی صورت میں وقت کا اولین مطالبہ انسان و انسانیت کی بہبود چاہنے والوں سے یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کی ہر خفیف سے خفیف حرکت کو انسانی آسائش کا حقیقی مقصد حاصل کرنے کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے رہیں۔

شعر و ادب بھی ہمارے فکر و عمل ہی کی ایک حرکت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایسے میں جبکہ انسانیت کے صحیفہ کا ورق ورق مخالف ہوائیں اُڑا رہی ہوں ہم ان کو سمیٹنے اور ان کے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کریں۔ اسے کسی وقت بھولنا نہیں چاہیے کہ "انسانی قدروں" کا تحفظ ان تحریکوں سے وجود میں نہیں آسکتا جو ہماری ذہنیت کو خون ریزی و قتل و غارت کا رجحان دے کر ہماری "اخلاقی حس" کو مفلوج بناتی ہیں۔ انسانوں کے لئے عیش و آسائش کا سرمایہ مہیا کرنا خون پسند غارت دوست تحریکوں کی فطرت کے خلاف ہے۔ انسانیت کا نصب العین ان تحریکوں کے چوکھٹے میں ٹھیک طور سے جڑا نہیں جا سکتا خالص تخیلی عیاشیوں کے دلفریب چمن کی گلگشت سے منحرف ہونے کے بعد تشدد کے بے آب و گیاہ ریگستانوں میں مالے مارے پھرنا بھی وقت کے مطالبوں سے فرار ہے۔ نسطائیت کی لائی ہوئی تباہیوں کا علاج ان غیر متوازن تشدد پسند سرخ تحریکوں کے پاس نہیں ہے۔ انسانی سماج میں سرمایہ داری نے جو بیماریاں پیدا کر دی ہیں وہ ان سے دور تو کیا ہوتیں البتہ دوسری مہلک تر بیماریوں کا ان سے پیدا ہو جانا

لازمی ہے۔

خون کی چاٹ لگاکر کسی سماج کو امن پسند نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک فریب دوسرے فریب سے نہیں کاٹا جا سکتا۔ عیاری، مکاری اور سازشوں سے طاقت حاصل کرنے والی تحریکوں سے انسانیت کا سچا احترام دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کے ٹیڑھے بیڑھے راستوں پر چل کر شانتی کی منزل نصیب نہیں ہو سکتی۔ متوازن انسانی ارتقا انہیں تحریکوں سے حاصل ہو سکتا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے امن پسند اور صلح جو ہوں اور جو موجودہ سرمایہ داری، رجعت پسندی اور فرقہ واریت کی تباہ کاریوں کا سلسلہ ایسے ذریعوں سے روکنے کی کوشش کریں جو خون پسند، غارت پسند، تشدد پسند نہ ہوں۔ ایسے ہی پُرامن وسیلوں کے راستے پر جو انقلاب چلے گا وہی ہمارے سماج کی "ہر رُخی ترقی" کا سامان ہوگا — "گاندھیائی مذاق" کا یہ انقلاب آہستہ خرام سہی، غیر ہنگامہ خیز سہی۔ مگر ہے یہی وہ انقلاب جو ہمارے سماج کے تمام دُکھ درد دُور کرے گا اور ہمارے لئے مستقل آسائشوں کے دروازے کھولے گا۔

ہمارے ادب و شعر کو اسی امن پسند انسانیت دوست انقلاب کا نقیب ہونا چاہیئے۔ انسانیت کے اقدام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کا مقصد سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ادب و شعر کو آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس کے سمندر میں جو لہریں بھی پیدا ہوں وہ اسی مقصد کی پیامبر بنتی ہوئی، اسی نصب العین کی نقیب بنتی ہوئی۔ اس کے ساز سے جو نغمہ بھی نکلے۔ اس میں اسی کی دُھن، اُسی کی لَے ہو۔

موجودہ زمانہ کی پیدا کی ہوئی تکلیفوں کا بار ایسے ہی ادب کے وسیلے سے ہلکا ہو سکتا ہے اور آج دنیا کے اُفق پر جنگ و بدامنی کے جو کالے بادل

چھائے ہوئے ہیں وہ اسی ادب کی مدد سے چھٹ سکتے ہیں۔

ادب و شعر کا کام شانتی، پریم کے گیت گانا اور امن و صلح کی فضا پیدا کرنا ہے۔ اور اس طرح دنیا کو جہاں تک ممکن ہو جنت بنا دینا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ نفرت، تشدد اور جنگ کے نعرے بلند کرتا رہے۔ اور فتنہ و فساد کی آگ کو ہوا دے کر دنیا کو جہنم بنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔

لیکن آج بدقسمتی سے جو ادب سرخ لیبل لگائے ہوئے "متاع ہر دکان" بنتا جا رہا ہے اس کا پروپیگنڈائی رخ تشدد کے راستوں سے مختلف فتنوں کے پیدا کرنے کے علاوہ کسی دوسری طرف نہیں ہے۔

صاف ستھرے مذہبی تصورات سے بیزاری، اخلاقی آدرشوں سے بیگانگی اسی ادب کے جلو میں چل رہی ہیں۔ اس کے اسٹیج پر عریانیاں رقص کرتی نظر آ رہی ہیں۔ نفرت۔ ہنگامہ پسندی۔ خون آشامی کے رجحان ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ فکری حریت کا گلا گھونٹ کر دنیا کو ایک سیاسی مکتبہ کے آستانہ پر سجدہ ریز دیکھنا چاہتا ہے۔

یہ راستہ امن کا نہیں ہے۔ صلح کا نہیں ہے ان میلانات کی گرد اپنے دامن سے جھاڑ کر جو ادب آگے بڑھے گا وہ ہمیں امن کی منزل تک پہنچائیگا اور ہمارے رجحانات میں انسانیت کا رنگ پیدا کرے گا۔

گوپال متل

سماجی حقیقت نگاری

سوویٹ قاموس فلسفہ میں حقیقت نگاری کو "سوویٹ آرٹ اور لٹریچر کا بنیادی اصول" قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بھی اعلان کیا گیا ہے کہ "آج سوشلسٹ حقیقت نگاری کا طریقہ ان عوامی جمہوریتوں کے فن کاروں کی میراث بن گیا ہے۔ جو سرمایہ داری کے چنگل سے نجات حاصل کرنے کے بعد سوشلسٹ سماج اور سوشلسٹ کلچر کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ یہ لٹریچر اور آرٹ کے ان بہترین نمائندوں کی میراث بھی بن گیا ہے جو سرمایہ دار ملکوں کے اندر عوام کی آزادی اور امن کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں"

سوشلسٹ حقیقت نگاری کی وضاحت کرتے ہوئے سوویٹ قاموس فلسفہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ "انقلابی رومانیت کو جسے نئی چیزوں کے جراثیم اور کونپلوں میں مستقبل کے امکانات دیکھنے کا وصف قرار دیا جاسکتا ہے۔ سوشلسٹ حقیقت نگاری سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ یہ انقلابی رومانیت حقیقت پسندی کا جزو لاینفک ہے۔"

قاموس فلسفہ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ سوشلزمی حقیقت نگاری سوویٹ روس کے بعد باقی ملکوں کے کمیونسٹ ادیبوں کی میراث بھی بن گئی ہے۔ لہذا قدرتی طور پر

ہندوستانی کمیونسٹ ادیب بھی اس بنیادی اصول کے پابند ہوں گے۔ ان حالات میں اس بنیادی اصول کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور اس کو کما حقہٗ طور پر سمجھنے کے لئے اس چیز کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے جسے خاموش فلسفہ میں انقلابی رومانیت کا نام دیا گیا ہے اور اسے سوشلزمی حقیقت پسندی کا "جزو لاینفک" بھی قرار دیا گیا ہے۔

مشہور مصنف لوئی فشر نے جسے ایک مدت تک کمیونسٹوں کا ہمسفر رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے انقلابی رومانیت کی بہت واضح مثال پیش کی ہے۔ یہ مثال سُنی سُنائی نہیں، بلکہ اس کے ذاتی تجربے سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ جب مندرجہ ذیل واقعہ رونما ہوا تو لوئی فشر سوویٹ روس ہی میں موجود تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل اسی کی زبان میں سنئے:

مشہور روسی ناول نگار وِلسی وولود ایوانوف گورکی کی عظیم آٹوموبائیل فیکٹری کی زندگی کے متعلق ناول لکھنے میں مصروف تھا۔ اس خیال کے پیشِ نظر کہ اسے موضوع کے متعلق بہتر آگاہی حاصل ہو جائے۔ اس نے کچھ دیر کے لئے اس کارخانے میں قیام کر لیا۔ اس قیام کے دوران میں مزدوروں کی ایک میٹنگ میں وہ اپنے مسوّدے کے کچھ حصّے سُنانے لگا۔ ایک باب میں اس نے ان مشکلات کا ذکر کیا تھا جو مزدوروں کو دور دراز مقامات سے آتے وقت ناقص سڑکوں اور گھٹیا بسوں کی وجہ سے پیش آتی ہیں میٹنگ میں جو کمیونسٹ موجود تھے انہوں نے اس بنا پر اسے آڑے ہاتھوں لے لیا۔

"اس ناول کو ختم کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا؟" انہوں نے دریافت کیا۔

"چھ ماہ" ایوانوف نے جواب دیا۔

"اس کے بعد چھ ماہ اسے سنسر کرنے میں لگ جائیں گے۔ اور چند ماہ چھاپنے میں۔ تمہاری کتاب ایک سال سے پہلے شائع نہ ہو سکے گی۔ اور ایک سال میں یہاں اچھی سڑکیں بن جائیں گی۔ اور نئی بسیں آجائیں گی۔ اسی طرح کارخانے کے نزدیک نئے اور مستقل

مکان بھی بن جائیں گے۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ تم ان لیبوں، سڑکوں اور مکانوں کا یہ سمجھ کر ذکر کرو کہ وہ اس وقت بھی یہاں موجود ہیں۔"

اس واقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لوئی فشر رقمطراز ہے۔ "بولشویک عظیم خواب کے سحر آگیں اثر سے آگاہ تھے اور جب مستقبل موعود ماضی میں تبدیل ہونے لگا تو انہوں نے اس کے دوررس نتائج کا امید پرستانہ جال بچھا دیا۔ انہوں نے یہاں تک کیا کہ سنہ ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ روسی مصنفوں کے نام یہ حکمنامہ صادر کر دیا کہ وہ حال کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ موجود ہی نہیں ہے۔ اور مستقبل کے متعلق یہ فرض کر لیں کہ وہ آچکا ہے۔ اس ادبی شعبدہ بازی کو سماجی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا۔

روسی ادیبوں نے اس حکمنامے اور اس ادبی شعبدہ بازی کو آسانی سے قبول نہیں کیا۔ کمیونسٹوں نے انہیں تعمیل حکم پر آمادہ کرنے کے لئے ڈکٹیٹرانہ جبر کی مشینری سے پورا پورا کام لیا۔ جن لوگوں نے تعمیل ارشاد سے انکار کیا ان کو طرح طرح کی ایذائیں دی گئیں۔ اور جنہوں نے حکام کا آلہ کار بننا منظور کر لیا ان پر الطاف و اکرام کی بارش کی گئی۔ گویا اہل مذہب کی طرح روسی کمیونسٹوں کے پاس جنت بھی تھی اور جہنم بھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کی جنت اور جہنم خیالی نہیں بلکہ حقیقی تھی۔

انقلاب روس کے فوراً ہی بعد روسی شاعر میکافسکی کی رہنمائی میں کچھ ادیبوں، شاعروں اور مصوروں نے جو اپنے آپ کو مستقبلی کہتے تھے روسی انقلاب کی تائید شروع کر دی۔ سوویٹ گورنمنٹ نے کچھ دنوں تک ان لوگوں کی سرپرستی کی۔ لیکن پھر اپنی سرپرستی کو واپس لے لیا اور اپنے غیر پرولتاری رویے کی پاداش میں تحریک کے رہنما میکافسکی کو خودکشی کرنا پڑی۔

اس کے بعد ٹراٹسکی کی سرپرستی میں "ہمسفروں" کی تنظیم ہوئی۔ ٹراٹسکی نے ان کے متعلق کہا تھا۔" ان کا آرٹ پرولتاری انقلاب کے مکمل طور پر موافق نہیں۔ وہ کچھ

یر تک ہمارے ساتھ جائیں گے۔" یہ وہ زمانہ تھا جب لینن پبلک طور پر یہ تسلیم کرتا تھا کہ ورثہ وائی آرٹ کی روایات کو عجائب گھر میں دفن کرنا قبل از وقت ہے۔" لیکن یہ زمانہ یادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر ٹراٹسکی اور سٹالن کے دھڑوں میں ش مکش شروع ہوئی تو سٹالن نے پرولتاری مصنفوں کی ایسوسی ایشن کے نام سے ایک توازی انجمن قائم کر دی۔ اور خفیہ پولیس کی مدد سے تمام محرر قسم کے ادیبوں کو "لڑا کے ستوں" میں منظم کر دیا۔ سٹالینی ایسوسی ایشن کے متشاعروں اور نام نہاد ادیبوں نے بہت بلد ہمسفروں کو غیر جانب دار کہہ کر ان کی مذمت شروع کر دی۔ اور اعلان کیا کہ "ان کا دیہ پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کے وجود کے منافی ہے۔" سٹالن کی چالبازیوں کے طفیل س ایسوسی ایشن نے بہت جلد تمام پبلشنگ اداروں پر قبضہ کر لیا۔ اور ہمسفروں کو یدان سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوئی فشر کے الفاظ میں یسوسی ایشن جس مصنف کو بھی ترچھی نگاہوں سے دیکھ لیتی اس کی ادبی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا۔ اس طرح بہت سے ذہین اور روشن دماغ مصنفوں کو خاموش کر دیا گیا۔ ان لوگوں ی کسوٹی ادبی نہیں سیاسی تھی۔"

ٹراٹسکی پر سٹالین کے غلبہ پا لینے کے بعد اس ایسوسی ایشن کو ادبی زندگی پر مکمل نٹرول حاصل ہو گیا۔ اور ۱۹۳۰ء میں اس نے مصنفوں کی کانگریس میں جو خارکوف کے مقام ر ہوئی۔ اپنے پروگرام کو باقاعدہ طور پر منظور کرا لیا۔ اس کانگریس میں بیس ملکوں کے نمائندے نامل ہوئے تھے۔ اور اس میں مصنفوں کے نام باقاعدہ ہدایت نامے جاری کئے گئے تھے۔ س موقعہ پر جو ریزولیوشن پاس کیا گیا اس میں درج تھا:-

پرولتاری آرٹ انفرادیت کی مذمت کرتا ہے اور اس سے دستبردار ہوتا ہے۔

پرولتاری آرٹسٹ کو جدلیاتی مادیت کیش ہونا چاہئے۔

پرولتاری آرٹ کو اجتماعی ہونا چاہئے۔

پرولتاری آرٹ کو ڈسپلن کا پابند ہونا چاہیئے۔
پرولتاری آرٹ کو منظم ہونا چاہیئے۔
پرولتاری آرٹ کی تخلیق کمیونسٹ پارٹی کی مصلحت اندیشانہ اور کڑی ہدایت کے مطابق ہونا چاہیئے۔
پرولتاری آرٹ کو طبقاتی جنگ کا ہتھیار بننا چاہیئے۔

معاملہ کمیونسٹ پارٹی کی ہدایت قبول کرنے پر ہی ختم نہ ہوا بلکہ اس ایسوسی ایشن نے اپنے سرکاری آرگن بیزی مینسکی (Bezzymenski) میں یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ "لٹریچر کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ سوشل میدان میں کامریڈ سٹالن کی ہدایات کو عملی جامہ پہنا دے"۔

جب ادب کا کام صرف سٹالن کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانا رہ گیا تو یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ روسی مصنفوں کا سارا زورِ قلم سٹالن کی مدح سرائی اور حکومت روس کی ہر کارروائی کا جواز پیش کرنے پر صرف ہونے لگا۔ لیکن یہ نمرود کی خدائی تھی جس میں "بندگی میں" بھی "بھلا نہیں ہوتا"۔ اپنی تمام غلامانہ ذہنیت کے باوجود ۱۹۳۲ء میں یہ ایسوسی ایشن سٹالن کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ اس کے ممبروں پر ٹراٹسکائی رجحانوں کا الزام لگا۔ اور ان بیچاروں کا مادی وجود ختم کر دیا گیا۔ اسی سال سوویٹ مصنفین کی ایک نئی یونین قائم ہوئی۔ اس یونین نے مصنفوں کے لئے جو نیا ہدایت نامہ تیار کیا اس میں درج تھا:

(۱) لٹریچر کے ارتقا، اس کے فنی کمال اس کی نظریاتی قیمت اور اس کی عملی افادیت کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ ادبی تحریک کا پارٹی اور سوویٹ گورنمنٹ کی پالیسی کے ساتھ گہرا اور قریبی تعلق ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنفوں کو سوشلزم کی تعمیر میں سرگرم حصہ لینا چاہیئے۔

(۲) سوویٹ مصنفوں کی یونین اس اہم کام کی تکمیل کے لئے تجویز پیش کرتی

ہے کہ ایسے اونچے درجے کے فن پاروں کی تخلیق کی جائے جو بین الاقوامی پرولتاریہ کی سوماٸی جنگ کا اظہار کرتے ہوں، سوشلزم کی فاتحانہ سپرٹ کے حامل ہوں۔ اور کمیونسٹ پارٹی کے عظیم دانش مندانہ رویے اور جرأت کا پرتو لئے ہوئے ہوں۔

اس نئے ہدایت نامے کے بعد اور پرانی ایسوسی ایشن کے ممبروں کے خاتمہ وجود کے پیش نظر روسی مصنفوں میں سٹالن کی مدح سرائی کا باقاعدہ مقابلہ شروع ہوگیا۔ جاگیردارانہ دور کے مصنف جب تملق پیشگی اختیار کرتے تھے تو ان کی گراوٹ زیادہ سے زیادہ یہاں تک پہنچتی تھی کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن روسی مصنفوں نے سٹالن کو خدائی صفات سے بھی متصف کر دیا۔ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کو روس کے سرکاری آرگن "پراودا" میں ایک شاعر نے روسی ڈکیٹٹر سے اس طرح خطاب کیا ہے:۔

اے عظیم سٹالن اے عوام کے رہنما
اے تو جس نے انسان کو جنم دیا
اے تو جس نے زمینوں کو زرخیز بنایا
اے تو جس نے صدیوں کو از سر نو جوان کیا
اے تو جس نے بہاروں میں رنگ بھرا

اسی اخبار کی ۲۸ نومبر ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں کاکیشیا کے ایک اور شاعر نے اپنی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

اے سٹالن تو دن کی پیدائش کا وقت مقرر کرتا ہے
صبح کے ستارے تیرا حکم مانتے ہیں۔

ہر چند کہ ذلت کا یہ مظاہرہ انسانی گراوٹ کی انتہا ہے اور روس کے ارباب

دانش اسے صرف اپنی جان بچانے کے لئے گوارا کرتے ہیں لیکن ڈکٹیٹرانہ ستم ظریفی اس سے بھی مطمئن نہیں۔ اور ان غلامان ازلی کے لئے ہر روز کوئی نہ کوئی نیا امتحان موجود ہوتا ہے مشہور مصنف آرتھر کوئسلر نے اپنی کتاب "ظلمت نیمروز" میں سٹالن کی اس ستم ظریفانہ روش کا ذکر بہت دلچسپ پیرائے میں کیا ہے :-

ایک بار اس نے ماہرین کی اس کمیٹی سے جو پارٹی کے اقتصادی جریدے کو مرتب کرتی تھی یہ مطالبہ کیا کہ وہ امریکہ کے صنعتی بحران کا تجزیہ پیش کرے۔ اسے کئی مہینے لگ گئے۔ آخر بڑی جدوجہد کے بعد اس جریدے کا ایک خاص نمبر نکلا جس میں نمبر ا (سٹالین) کے اس نظریئے کی تائید کر دی گئی۔ جس کا اظہار اس نے کانگریس میں اپنی آخری تقریر میں کیا تھا۔ ان اقتصادی ماہروں نے تین سو صفحے لکھنے کے بعد یہ ثابت کر دیا کہ امریکہ میں جو خوشحالی نظر آتی ہے وہ صرف نمائشی ہے۔ ورنہ اندر سے امریکہ بدحالی کا شکار ہے۔ اور اس بدحالی کو صرف ایک کامیاب انقلاب سے ہی دور کیا جا سکتا ہے جس روز اس خاص جریدے کا خاص نمبر نکلا۔ اسی روز نمبر ا نے ایک امریکی اخبار نویس سے ملاقات کی۔ اور اس کے توسّل سے ساری دنیا کو آگاہ کر دیا کہ "امریکہ میں اقتصادی بحران ختم ہو چکا ہے۔ اور اب وہاں کاروبار نارمل ہے۔" ماہرین کی کمیٹی کے ممبروں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ ان کی برطرفی اور گرفتاری یقینی ہے۔ راتوں رات انہوں نے خط لکھ کر اپنی اس بداعمالی کا اعتراف کر لیا کہ وہ ایک انقلاب دشمن نظریہ اور گمراہ کن تجزیہ پیش کرنے کے مجرم ہیں۔ انہوں نے اس بات پر خاص زور دیا کہ وہ اپنے گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور پبلک طور پر اس کی تلافی کا یقین دلاتے ہیں۔ صرف اسا کووچ نے جو ایڈیٹروں کے بورڈ کا ایک ایسا رکن تھا جو بوڑھے انقلابیوں کے گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس بات کو ترجیح دی کہ اس قسم کا خط لکھنے کی بجائے اپنے آپ کو گولی مار لے۔ بعد میں خلوتیانِ راز نے اس بات کا انکشاف کیا کہ نمبر ا نے یہ سارا کھیل صرف اس لئے کھیلا تھا کہ اسا کووچ کو تباہ کر دیا جائے۔ اس شخص پر نمبر ا کو مخالفانہ رجحانات

کا گمان تھا۔"

جن ارباب دانش اور اہل قلم کو اس اذیت ناک آزمائش کا مسلسل سامنا ہو اور ان کے سر پر احتساب کی تلوار ہر وقت لٹک رہی ہو وہ کسی بھی ادبی شعبدہ بازی کو بڑی آسانی سے قبول کر سکتے ہیں۔ اخلاقی پس و پیش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی سوال ہے تو صرف یہ کہ "جادۂ کفر" سے بچنے کی کوشش کی جائے۔ اور اس کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ خفیہ پولیس کے کنٹرول کو بہ رضا و رغبت قبول کر لیا جائے۔ سوویٹ مصنفوں کی یونین نے یہی کیا۔ ایک ریزولیوشن میں اس نے طے کیا:۔

ہماری بات چیت کا فوری نتیجہ ہمارے کام کی ایک ایسی تنظیم ہونی چاہیئے۔ جس کی بنا پر صرف وہ کتابیں ہی سوویٹ مصنفین کی یونین کے سامنے پیش نہ ہوں جو مکمل ہو چکی ہوں۔ بلکہ آئندہ کتابوں کے خاکے اور ان کی سکیمیں بھی۔ تاکہ یونین یہ اندازہ لگا سکے کہ اس کے ممبر کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

مندرجہ بالا حقائق روسی مصنفوں کی غلامانہ ذہنیت اور کورانہ اطاعت شعاری کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں لیکن ان سے یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ سماجی حقیقت نگاری ان آرٹسٹوں اور مصنفوں کی "میراث" کس طرح بن گئی۔ جو "سرمایہ دار ملکوں کے اندر عوام کی آزادی اور امن کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں"؛ ہرچند کہ جمہوری ملکوں کی کمیونسٹ پارٹیاں بھی دہشت پھیلانے کے فن میں ماہر ہیں۔ اور آرٹسٹوں اور مصنفوں کو آنیوالے انقلاب سے خوفزدہ کرنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا ہے لیکن صرف یہ بات بھی جمہوری ملکوں کے مصنفوں اور آرٹسٹوں کو سماجی حقیقت نگاری کے نام پر روس کی مدح سرائی اور اپنے ملک کی توہین کے لئے مجبور نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کو رام کرنے کیلئے روسی رشوت سے بھی کام لیتے ہیں۔ یہ رشوت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی ایک عام قسم جذبۂ شہرت کی تسکین ہے۔ روس کی مدح سرائی کرنے والا گھٹیا سے گھٹیا ادیب صرف

ایک جہت میں عظیم فن کاروں کی صف میں جا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ خالص مادّی انداز میں بھی رشوت دینے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ اس رشوت کی تفصیل آرتھر کوئسلر اور اندرے ژیدے نے بہت اچھی طرح پیش کی ہے۔ یہ رشوت ان دونوں ادیبوں کو راہ راست سے منحرف کرنے میں اس لئے کامیاب نہ ہو سکی کہ یہ لوگ کسی لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ خالص فنکارانہ انداز میں سوویٹ روس اور کمیونزم کی طرف مائل ہوئے تھے۔ الطاف واکرام کی بارش نے ان پر اُلٹا اثر کیا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ الطاف واکرام کی یہ بارش کسی نہ کسی ناگوار حقیقت کو چھپانے کے لئے کی جا رہی ہے لیکن عام لوگ چونکہ لالچ اور تحریص سے بلند نہیں ہوتے اس لئے نوازشات کی فراوانی ان کے ضمیر کی آواز کو خاموش کر دیتی ہے۔

آرتھر کوئسلر اپنے سفر روس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"جب میں کسی صوبے کے صدر مقام پر پہنچتا تو سفارشی خط لے کر مقامی مصنفین کی فیڈریشن کے دفتر میں پہنچ جاتا۔ فیڈریشن کا سکریٹری یہ خط دیکھ کر میرے اعزاز میں دعوت کا انتظام کرتا۔ سیاسی لیڈروں اور ارباب دانش سے میری ملاقات کا انتظام کراتا۔ کسی شخص کو میری خبر گیری پر مقرر کر دیتا اور مقامی ادبی میگزین کے ایڈیٹر اور سٹیٹ پبلشنگ ٹرسٹ کے ڈائرکٹر سے میری ملاقات کراتا۔ طفلس کے مقام پر جب میری ملاقات ادبی میگزین کے ایڈیٹر سے ہوئی تو اس نے مجھے آگاہ کیا کہ اس کی کئی سال سے یہ زبردست خواہش تھی کہ میری کوئی کہانی اس کے میگزین میں اشاعت پذیر ہو۔ میں نے ایک کہانی جو اس سے پہلے جرمن زبان میں شائع ہو چکی تھی اس کے سپرد کی اور اسی شام اس نے دو یا تین ہزار روبل کا چیک میرے پاس ہوٹل میں

بھیج دیا۔ سٹیٹ پبلشنگ ٹرسٹ کے ڈائرکٹر نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ٹرسٹ کو اپنی زیر تصنیف کتاب کو جارجیا کی زبان میں شائع کرنے کی اجازت دے دوں۔ میں نے معاہدے کے ایک چھپے ہوئے فارم پر دستخط کر دیے۔ اور تین چار ہزار روبل کا ایک اور چیک میرے پاس پہنچ گیا۔ (اس وقت روس میں اوسط درجے کے ایک ملازم کو ۱۳۰ روبل ماہوار تنخواہ ملتی تھی) لینن گراڈ اور تاشقند کے درمیان سفر کرتے ہوئے میں نے ایک ہی کہانی آٹھ یا دس میگزینوں کو فروخت کی۔ اور زیر تصنیف کتاب کی اشاعت کے متعدد معاہدے کیے۔

اس وقت تک میری کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ جن لوگوں نے مجھے معاوضے ادا کیے وہ میرے کمال فن سے بالکل ناآشنا تھے۔ جس کہانی کا انہوں نے مجھے معاوضہ دیا انہوں نے مطلق نہیں پڑھی تھی۔ اور جس کتاب کی اشاعت کے لئے انہوں نے میرے ساتھ معاہدے کیے وہ ابھی میں نے لکھی ہی نہیں تھی۔ وہ ادب کے نقّاد نہیں سرکاری ملازم تھے جو اوپر سے آئی ہوئی ہدایات پر عمل کر رہے تھے۔"

اب اندرے ژید کی روداد سُنیے:۔

"روس میں سفر کے دوران جو آسائشیں مجھے حاصل تھیں وہ اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ مجھے ہر جگہ انتہائی آرام دہ کاریں مہیّا کی گئیں۔ اور ہوٹلوں میں بھی مجھے بہترین کھانے اور سب سے اچھے کمرے مہیّا کیے گئے۔ اور پھر ہر جگہ میرا کتنا شاندار استقبال

ہوا۔ ہر جگہ میری آمد پر جشن ہوئے اور خوب خاطر مدارات ہوئی۔
ایسی کوئی نوازش نہیں تھی جس کا مجھے اہل نہ سمجھا گیا ہو میرے لئے
ممکن نہیں تھا میں اس استقبال اور مدارات کی خوشگواریاں لے کر
نہ لوٹوں۔ لیکن یہ تمام نوازشات مجھے مسلسل طور پر یہ یاد دلاتی رہیں
کہ یہاں بھی امتیازات اور مراعات کا دور دورہ ہے۔ حالانکہ میں
یہاں مساوات کی تلاش میں آیا تھا۔ جب میں افسروں کے ہجوم سے
نکل کر مزدوروں کے درمیان پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے بیشتر
انتہائی غریبی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ہر شام میرے اعزاز میں جو
رسمی دعوت ہوتی تھی اس میں اتنے اقسام اور اتنی مقدار میں کھانے
پیش کئے جاتے تھے کہ کھانے کا حقیقی دور شروع ہونے سے پہلے صرف
ابتدائی چیزوں سے ہی طبیعت سیر ہو جاتی تھی۔ ڈنر کے پورے چھ
دَور ہوتے تھے اور یہ مکمل چار گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔ روس میں
بل ادا کرنے کا موقعہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ لہذا یہ اندازہ لگانا میرے لئے
ناممکن ہے کہ اس قسم کی ضیافت پر خرچ کیا اُٹھتا تھا۔ لیکن میرے
ایک دوست نے جو روس میں قیمتوں کی سطح سے واقف تھے مجھے بتایا
تھا کہ اس دعوت پر فی کس دو تین سو روبل کے قریب خرچ ہوتے
ہوں گے۔ یاد رکھئے کہ جو مزدور میں نے دیکھے وہ صرف پانچ روبل
یومیہ پیدا کرتے تھے۔ اور انہیں سادہ روٹی اور خشک مچھلی کے علاوہ
کچھ بھی میسر نہ آتا تھا۔ روس میں اپنے قیام کے دوران میں ہم حقیقت
میں حکومت کے مہمان نہیں، سوویٹ مصنفوں کی مالدار سوسائٹی
کے مہمان تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ آخر انہوں نے ہم پر کتنی رقم صرف

کی۔ ہم پورے چھ آدمی تھے۔ ہمارے ساتھ گائیڈ بھی تھے اور بعض اوقات میزبانوں کی تعداد بھی اس سے کم نہ ہوتی تھی۔ انہوں نے یقینی طور پر یہ سمجھا ہوگا کہ میں ان کے روپے کا اس سے مختلف معاوضہ ادا کروں جو میں نے ادا کیا۔ میرا خیال ہے کہ پراودا نے میرے خلاف جس نفرت کا اظہار کیا اس میں اس واقعہ کو بھی دخل تھا کہ مجھ پر جو روپیہ صرف کیا گیا تھا وہ اکارت گیا"

آرتھر کوئسلر اور انڈرے ژید غیر معمولی اخلاقی جرأت کے مالک تھے۔ کہ الطاف و کرم کی یہ فراوانی ان کے ضمیر کی آواز کو خاموش نہ کر سکی۔ بالعموم ایسا نہیں ہوتا جب ہندوستان کے ایک معمولی صوبائی لیڈر کو بین الاقوامی تمغۂ امن کے ساتھ ساتھ سوا لاکھ روپے کے انعام کا مستحق بھی قرار دے دیا جائے تو یہ بات بالکل قدرتی ہے کہ وہ سوویٹ روس میں "مذہبی اور فکری آزادی" کے وجود پر ایمان لے آئے۔ اور یہ بات بھی بالکل قدرتی ہے کہ اس کی "خوش بختی" دوسرے ناکام سیاسی لیڈروں، مصنفوں اور آرٹسٹوں کے دل میں بھی لالچ کی چنگاری روشن کر دے۔ جمہوری ملکوں میں سماجی حقیقت نگاری کی شمع اسی چنگاری سے روشن ہوتی ہے

میرزا ہر گوپال تفتہؔ

دوہرا اخلاق

بلٹز کے ایڈیٹر اور مالک شری کرانجیا نے چین کے دورے کے بعد ایک کتاب لکھی ہے "China Standsup" اس میں ماؤلینڈ کے کارناموں کو سراہا گیا ہے اور اس دیار کی روشنیوں اور تابانیوں کو زیادہ اُجاگر کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ برطانوی نوآبادی ہانگ کانگ میں پھیلی ہوئی تاریکیوں کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

شری کرانجیا کا ارشاد ہے کہ ہانگ کانگ پہنچنے پر جب ان کی ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پہ رُکی تو دیگر آسائشوں کے علاوہ معمولی بات چیت کے بعد کرائے کی لڑکیوں کا انتظام بھی فوراً ہو گیا۔ اور دوسری صبح کو عشرتِ شبانہ کے ردعمل کے طور پر منہ کا ذائقہ بگڑا ہوا تھا۔ جو کسی طرح درست ہونے میں نہیں آتا تھا۔ اس ذکر سے مراد یہ دکھانا ہے کہ ہانگ کانگ میں عصمت فروشی کرنے والی عورتیں عام ہیں۔ جس کی وجہ غالباً وہاں کا سرمایہ دارانہ نظام ہے۔

عصمت فروشی بہت بڑا گناہ ہے۔ اور جس ملک میں عصمت فروشی عام ہو

اسے بجا طور پر ندامت ہونی چاہیے۔ جو نظام عصمت فروشی کے فروغ کا باعث ہو اُسے بھی ضرور بدلنا چاہیے۔ لیکن عام لوگوں کے نزدیک یہ بات حیرت کا باعث ضرور ہے کہ جو لوگ عصمت فروشی کو اتنا برا سمجھتے ہیں وہ رات بھر کے عیش کے لئے کرائے کی لڑکیاں حاصل کرنے کے روادار کس طرح ہوئے۔ کیا لڑکیوں کا جسم خریدنا اتنا ہی بُرا نہیں جتنا ان کو فروخت کرنا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شری کرانجیا بھی اسی لغزش کا شکار ہیں۔ جس کے ماتحت عام آدمی دو قسم کے اخلاقی ضابطے مقرر کر لیتے ہیں۔ ایک اپنے اور اپنے حامیوں کے لئے اور دوسرا باقی دنیا کے لئے۔ دوسروں کی خامیوں اور برائیوں کی ہم انتہائی بلند آہنگی سے مذمت کرتے ہیں۔ لیکن جب یہی برائیاں اپنی ذات اور اپنے گروہ میں نظر آئیں تو نہ صرف ہم ان کو بڑی فراخدلی کے ساتھ معاف کر دیتے ہیں۔ بلکہ دبی زبان میں ان کا جواز ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔

یہ تضاد عام ہے۔ ہمارے ملک میں شاید ہی کوئی شخص ہوگا جو رشوت اور بلیک مارکیٹ کا مخالف نہ ہو اور انتہائی شدت سے ان کی مذمت نہ کرتا ہو لیکن اس تمام بلند آہنگی کے باوجود جب کسی کو رشوت اور بلیک مارکیٹ کا موقع ملتا ہے تو وہ ہاتھ رنگنے سے باز نہیں رہتا۔ اور بقدر "لب و دنداں" کام نکال لیتا ہے۔

پاکستان سے آنے والے کئی شرنارتھی پاکستان کی اکثریت کے ظلم سے نالاں ہیں اور ان مسلمانوں کی بڑی تعریف کرتے ہیں جنہوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اور اپنے ہم مذہبوں کی مخالفت مول لے کر ان کی امداد کی۔ لیکن یہی لوگ ہندوستان کے ان ہندوؤں کو گالیاں دیتے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ان ہندوؤں کا طرز عمل اتنا ہی

شریفانہ ہے جتنا پاکستان کے ان مسلمانوں کا۔ جو اپنے ہم مذہبوں کی غلط روش کے مخالف تھے۔ اسی طرح ان کی اپنی اقلیت دشمنی بھی اتنی ہی قابل مذمت ہے جتنی پاکستان کے فسادی مسلمانوں کی ہندو دشمنی۔ اگر بادشاہ خان قابل ستائش ہیں تو پنڈت جواہر لال نہرو کو کس زبان سے برا کہا جا سکتا ہے۔ اور اگر پوربی بنگال اور پچھمی پاکستان کے ہندوؤں کا نکاس قابل مذمت ہے تو ان لوگوں کو کیسے اچھا کہا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو شہری حقوق سے محروم کرنے کے حامی ہیں۔

پاکستان کے بعض اخباروں میں ہندوستان کے متعلق غلط اور گمراہ کن خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں اور اس کی مذمت کرنا بھی ہر ایمان دار آدمی کا فرض ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہندوستان کے جو اخبارات اس مذمت میں سب سے زیادہ بلند بانگ ہیں۔ وہی اخبار پاکستان کے متعلق اپنے کالموں میں بھی اسی قسم کی خبریں شائع کر دیتے ہیں۔ ان خبروں کے خلاف پاکستان کے اخبار احتجاج کرتے ہیں اور اس احتجاج کے ساتھ ساتھ چند اور جھوٹی خبریں شائع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کذب بیانی اور پروپیگنڈا کا یہ باہمی مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اس تمام گڑبڑ کا باعث ہے دوہرا اخلاق۔ ہم اپنے لئے کچھ اور پسند کرتے ہیں اور دوسروں کے لئے کچھ اور!

اپنے اور دوسروں کے افعال کو ایک ہی اخلاقی ترازو میں تولنے کا وصف بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے ورنہ دوہرے اخلاق کا حمام ایسا حمام ہے جس میں اگر تمام نہیں تو اکثر و بیشتر لوگ ننگے نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر "ترقی پسندوں" کو لیجیے۔ یہ لوگ غیر اشتراکی ملکوں میں جن میں ہندوستان بھی شامل ہے شہری آزادیوں کے زبردست حامی ہیں۔ ہندوستان میں کوئی ایجی ٹیٹر چاہے کتنی ہی اشتعال انگیزی کرے اس کی شہری آزادی میں فرق نہیں آنا چاہیے۔ اور اسے زہر چکانی کا پورا پورا موقعہ ملنا چاہیے۔ اگر حکومت اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ

ڈالے تو وہ جابر، فاشسٹ اور سرمایہ داروں کی زرخرید ہے۔ لیکن یہی ترقی پسند روس اور اس کے حاشیہ بردار دیشوں میں شہری آزادیوں کے مکمل فقدان پر اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر تسلّی دے لیتے ہیں کہ ان دیشوں کے عوام کے وسیع مفاد کے پیش نظر شہری آزادیوں کو سلب کرنا ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ ہندوستان میں محروم اقتدار ہونے کے باوجود اپنے سیاسی مخالفوں کا سر کچلنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اور علانیہ ڈینگیں مارتے ہیں کہ برسر اقتدار آنے کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی کے تمام مخالفوں کو گولی مار دیں گے۔ ان لوگوں سے کہیں زیادہ ان لوگوں کا طرز عمل باعث حیرت ہے جو غیر کمیونسٹ ہونے کے باوجود ان کی اس منطق کی داد دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے لئے بھی شہری آزادیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن کی ایک جیب میں بم اور دوسری میں ایسڈ بلب ہوتا ہے۔

میرزا ہری گوپال تفتہ

غلطی ہائے مضامیں

استاد محترم پروفیسر برج نرائن میرؔ کا یہ شعر پڑھ کر کہ ؎

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامئے دستار

کہا کرتے تھے کہ میرؔ اس زمانے کے لوگوں سے کہیں زیادہ خوش نصیب تھا کہ اس زمانے میں دونوں ہاتھوں سے سنبھالنے پر دستار سنبھل تو جاتی تھی۔ اس زمانے میں تو دستار کسی صورت نہیں سنبھلتی۔

غالبؔ کے اس شعر کے متعلق بھی کہ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

یہی کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ موجودہ دور کے اہلِ نظر کے مقابلے میں بہت خوش نصیب تھا اس کے دور میں غلطی ہائے مضامیں کا سلسلہ اس سے آگے نہ بڑھتا تھا کہ لوگ نالے کے

رسا ہونے کے متعلق غلط فہمی کا شکار رہتے۔ اب تو غلطی ہائے مضامین اتنا طول کھینچا ہے کہ ان کا سلسلہ یار کی روایتی زلف دراز سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔

مثال کے طور پر محبت کو لیجئے۔ عاشقوں کے پیر و مرشد مجنوں سے لے کر رانجھا تک سبھی محبت کرنے والوں کو ماحول کی ناسازگاری کا سامنا کرنا پڑا۔ اور ہر ایک اس امید کے سہارے خوش ہوتا رہا کہ دنیا میں کہیں نہ کہیں ایسا گوشہ عافیت ضرور موجود ہوگا۔ جہاں وہ محبت کرنے والے اپنوں کی نصیحت اور غیروں کی دشنام سے بچ کر اپنے نخل آرزو کی آبیاری کر سکیں گے۔ اس گوشۂ عافیت کا تصور دنیائے شعر و نغمہ کی جان ہے۔ اور اردو شاعری میں اس کا بہترین اظہار اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" میں ہوا ہے۔

یہ گوشہ عافیت اور یہ "کہیں" قید زمان و مکاں سے ہمیشہ آزاد رہا اور کسی بھی شاعر اور مغنی نے محقق بن کر یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ گوشۂ عافیت کہاں ہے۔ یا کب عالم وجود میں آئے گا۔ اسی ابہام کی بدولت اس کا بھرم قائم رہا۔ اور کامرانیٔ محبت کا حسین امکان شعر و نغمہ کو تر و تازگی بخشتا رہا۔ لیکن برا ہوا ان ترقی پسند شاعروں کا کہ وہ اس گوشۂ عافیت کو بھی زمان و مکاں کی قید میں لے آئے۔ اور اس طرح نہ صرف غلطی ہائے مضامیں کی فہرست میں اضافہ کر دیا۔ بلکہ اس مثالی گوشۂ عافیت کا رومان بھی غارت کر دیا۔

ان ترقی پسند شاعروں کا کہنا ہے کہ محبت کی کامرانی کے راستے میں صرف ہندوستان کا سرمایہ دارانہ احول حائل ہے۔ جوں ہی یہ ماحول ختم ہو کر سرخ پھریرا لہرائے گا۔ محبت کے راستے سے تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ اور ہر عاشق اس کے سائے میں نشاط وصل سے سرشار ہو کر اطمینان کی نیند سو سکے گا۔

اب جہاں تک اختر شیرانی کا سدا بہار "کہیں" ہے آپ نہ تو اس کی کھوج لگا سکتے ہیں اور نہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اختر شیرانی نے اس کی مسرت آگینوں کا جو تصور باندھا ہے وہ غلط ہے لیکن ترقی پسند شاعروں کی جنت موعومہ کا یہ حال نہیں۔ ہر چند کہ اس کے

گرد بھی ایک نقاب آہن پڑا ہوا ہے۔ لیکن اس کی کوئی نہ کوئی جھلک بیرونی دنیا کو نظر آہی جاتی ہے۔ اور صرف یہی جھلک اس جنت مزعومہ کا طلسم پاش پاش کر دینے کے لئے کافی ہے۔

ہر چند کہ عاشقوں اور شاعروں کے تصوراتی طلسم کو برہم کرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن جب وہ اس طلسم کی بدولت جبر کی خوفناک بھول بھلیوں میں پہنچنے والے ہوں — تو میرزا ہر گوپال تفتہ اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ناصح مشفق کا ناخوشگوار منصب سنبھال کر انہیں آنے والے خطروں سے آگاہ کریں۔ اور صاف صاف لفظوں میں بتا دیں کہ اے شاعرانِ گمراہ اور اے عاشقانِ غلط اندیش، سُرخ پرچم کامرانیٔ محبت کا پیامی ہرگز نہیں بلکہ ایک ایسی منزلِ جبر کا نشان راہ ہے۔ جہاں پہنچ کر محبت خوفناک جرائم کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔

اس رجعت پسند اور سرمایہ دارانہ ماحول میں محبت لاکھ جرم سہی لیکن اس جرم کی سزا نصیحت، ملامت اور تضحیک سے آگے کبھی نہیں بڑھتی۔ لیکن اس منزلِ جبر تک رسائی حاصل کرنے کے بعد محبت ایک ایسا جرم بھی بن جاتی ہے جس کی سزا موت ہے۔

شاعرانِ گمراہ اور عاشقانِ غلط اندیش خفا ہو کر میرزا ہر گوپال تفتہ پر سرمایہ دارانہ نظام کی ایجنٹی کا الزام نہ لگائیں۔ اگر انہیں اس بات میں کوئی شک ہے تو اپنے برمی کامریڈوں سے پوچھ لیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ اب محبت کو جرم کہنا صرف ایک شاعرانہ نازک خیالی نہیں۔ کمیونسٹوں نے اس شاعرانہ نازک خیالی کو واقعی ایک حقیقت بنا دیا ہے۔ اور اب محبت ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا کمیونسٹ شریعت میں موت بھی ہو سکتی ہے۔

ہاں یہ واقعہ ہے کہ برمی کمیونسٹوں نے پارٹی کی لیڈرشپ میں انتشار کو روکنے کے لئے محبت اور شادی کے لئے انتہائی سخت گیرانہ ضابطہ مقرر کر رکھا ہے۔ کمیونسٹوں کو پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کی اجازت کے بغیر محبت کے اظہار اور شادی کی تجویز پیش کرنے کی ممانعت ہے۔ پارٹی کی اجازت کے بعد بھی کوئی شخص اپنی محبوبہ سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "تم

خوبصورت ہو" یا یہ کہ "میں تم سے محبت کرتا ہوں" وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ تم پارٹی کا کام بڑی سرگرمی اور خلوص سے کر رہی ہو اور تمہاری اس صفت کا مجھ پہ گہرا اثر پڑا ہے اگر محبت کی اس پیش کش کو جو پارٹی کی اجازت کے بعد کی گئی ہو۔ ٹھکرا دیا جائے تو مرد کا فرض ہے کہ وہ دوسری بار شادی کی تجویز پیش کرے۔ کوئی عورت زیادہ سے زیادہ دو بار شادی کی تجویز کو نامنظور کر سکتی ہے۔ تیسری بار اسے پارٹی کے سامنے پیش ہو کر یہ بتانا ہوگا کہ اسے شادی کی تجویز کیوں پسند نہیں۔ جب ان دونوں کے درمیان شادی اور محبت کے معاملات زیر غور ہوں تو کسی تیسرے شخص کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مداخلت کر کے ان میں سے کسی ایک کا رقیب بن جائے۔ رقیبانہ انداز میں اظہار محبت کی سزا برمی کمیونسٹوں کے دستور میں موت ہے۔

اب اے شاعران گمراہ اور اے عاشقان غلط اندیش! سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ اس جبر ماحول میں محبت کہاں تک سانس لے سکتی ہے۔ اگر پارٹی کی طے کردہ شادیاں ہی مثالی معاشقہ ہیں تو پھر ماں باپ کی رچائی ہوئی شادیوں میں کیا عیب ہے؟ اور اگر اپنی جنت مزعومہ میں جرم محبت کی پاداش میں تم گولی کھا سکتے ہو تو اس زوال آمادہ رجعت پسند اور سرمایہ دارانہ ماحول میں صرف ناوک دشنام سے اتنا کیوں گھبراتے ہو کہ اپنی ناکامی محبت کا انتقام لینے کے لئے معصوم راہگیروں پر دستی بم پھینکنے لگو۔۔۔۔

غلطی ہائے مضامیں کی یہ عاشقانہ اور شاعرانہ شکل تھی۔ اب ایک سیاسی مثال بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی رہنما، دانشور اور ارباب علم کمیونسٹ چین کے جارحانہ ارادوں کی پردہ پوشی کے لئے اس بات کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں کہ ہندوستان اور چین کے درمیان گذشتہ دو ہزار سال سے جنگ نہیں ہوئی دونوں ملکوں کے درمیان بڑے دیرینہ اور گہرے ثقافتی اور تمدنی روابط ہیں اور

ان دونوں کے ورثۂ ماضی میں بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔

اب یہ سب باتیں ظاہرا طور پر بالکل درست ہیں۔ لیکن مضمون کی غلطی کا آغاز یہاں سے ہوتا ہے کہ یہ سیاسی راہ نما، دانشور اور ارباب علم موسی تنگ کی امت کو چین کے ورثۂ ماضی کا وارث حقیقی سمجھے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے۔ اگر یہ غلط فہمی بے ضرر قسم کی غلط فہمی ہوتی تو میرزا ہر گوپال تفتہ ان لوگوں کو ان کی خیالی جنت سے محروم کرنے کی کوشش ہرگز نہ کرتے۔ لیکن جب اس غلط فہمی کی بدولت ملکی تحفظ کو خطرہ درپیش ہو تو چپ رہنا مشکل ہے۔ لہذا اے رہنمایان عظام اور اے دانشوران واجب الاحترام تمہاری آگاہی کے لئے مرقوم ہے کہ موسی تنگ کی امت کو چین کے ورثۂ ماضی کا امین سمجھنا اتنا ہی غلط ہے جتنا ہندوستان کے سرخوں کو رام، کرشن اور بدھ کی مقدس روایات کا حامل اور گنگا جمنا اور گنگوتری کے تقدس کا پاسبان قرار دینا۔

اے رہنمایانِ عظام اور اے دانشورانِ واجب الاحترام! یہ واقعہ ہے، کہ موسی تنگ کی امت چین کے اس ورثہ، قدیم کی جس کے تم اتنے مداح ہو۔ سب سے بڑی دشمن ہے اور اس درخشاں ماضی کے ہر نقش کو بڑی بے دردی سے مٹا رہی ہے۔ وہ عظیم کنفوشس جس کے تم اتنے مداح ہو اور جس کی قسم کھا کر تم ہندوستان اور چین کی دو ہزار سال پرانی دوستی کا دم بھرتے ہو موسی تنگ اور اس کے حواریوں کے نزدیک ہرگز ہرگز واجب الاحترام نہیں۔ کمیونسٹ چین کے نصاب تعلیم میں کنفوشس کا ذکر ایک عظیم مبلغ اخلاق اور مہاتما کی حیثیت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے جاگیرداری، شاہی اور رجعت پسندی کی پشت پناہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شک ہے تو چین کی ایک درسی کتاب کا یہ اقتباس اپنی آنکھوں سے پڑھ لو۔

کنگ چیو لو سٹیٹ کا ایک چھوٹا سا امیر تھا۔ وہ جاگیرداری کے آداب سے خوب واقف تھا۔ سیاست میں قسمت نے چونکہ اس کا ساتھ

نہیں دیا اس لئے وہ تدریس میں مصروف ہوگیا۔ وہ جاگیرداری کا حامی تھا اور طبقاتی نظام پر زور دیتا تھا۔ اس نے لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ شہنشاہ کے وفادار رہیں۔ اور اس طرح رجعت پسندوں اور اشرافیہ کی پشت پناہ بن گیا۔ اس کے بے شمار شاگرد تھے۔ کنگ چیو کو مختلف جاگیردار اور شہنشاہ بڑی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اسے مہاتما سمجھا جاتا تھا۔ اور لوگ اسے کنگ فوتسے (کنفوشس) کہہ کر خطاب کرتے تھے۔

اے رہنمایان عظام و دانشوران واجب الاحترام! چین کے اس عظیم مہاتما کے متعلق چینی سرخوں کی یہ گستاخی بھی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی نہیں تو میرزاہر گوپال تفتہ مزید سرمۂ بصیرت مہیا کئے دیتے ہیں۔

سنو! یہ درسی کتاب اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کیمونسٹوں کے قدم چین میں پوری طرح جمنے نہ پائے تھے۔ اب معاملہ اس سے کہیں دور نکل گیا ہے اور چینی سرخوں نے عظیم کنفوشس کی کتابوں کو جلانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ گھبراؤ نہیں یہ خبر کسی امریکی اخبار کی نہیں بلکہ تمہارے ممدوح "ہندوستان ٹائمز" کی ہے اور اس نے بھی اسے چینی اخباروں کے حوالے سے شائع کیا ہے۔

ہاں تو پھر کان کھول کر سنو! موسی تنگ کی امت نے چین کے تم جیسے دانشوروں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی لائبریریوں کو ان تمام کتابوں سے خالی کر دیں جن میں کنفوشس کی تعلیمات درج ہیں۔ گویا چین میں اب ایسی کسی کتاب کے لئے گنجائش نہیں جس میں چین کے دو ہزار سالہ تہذیب و تمدن کا کوئی روشن پہلو موجود ہو۔ اب چین کا کوئی عالم ایسی کسی خطرناک کتاب کو اپنی لائبریری میں نہیں رکھ سکتا جس میں برادرانہ محبت اور دوستانہ اخلاص کا ذکر ہو۔

اے رہنمایانِ عظام و دانشوران واجب الاحترام! موسی تنگ کی امت کا عظیم کنفوشس کی تعلیمات کے ساتھ یہ سلوک قرین قیاس اس لئے بھی ہے کہ کنفوشس

کی تعلیمات میں فرد کی عظمت پر زور دیا گیا ہے اور یہ بات کمیونسٹ فلسفے کی ضد ہے۔ کنفوشس کی طرح مہاتما گاندھی بھی فرد کی عظمت کے قائل تھے۔ اور ہندوستان کا قدیم فلسفہ بھی فرد کی عظمت کا احترام کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ہند و چین کے ورثۂ ماضی میں مماثلت شک و شبہہ سے بالا ہے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ناقابلِ تردید ہے، کہ جہاں تک چین کے عظیم ماضی کی وراثت کا تعلق ہے۔ موسی تنگ کی امت ناخلف اولاد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ لہٰذا کمیونسٹ چین کے ساتھ ہندوستان کے مراسم کا فیصلہ کرتے وقت اس عظیم ماضی کی روایات کا واسطہ دینا صرف سادہ لوحی ہے۔ ایک ایسی سادہ لوحی جس نے غالب کو یہ پکارنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ؎ :

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ

سید سہیل واسطی

شانتی پیدا ہوئی

۱

وہ جوان تھی اور تندرست تھی —— جس کا صاف مطلب یہ ہوا، کہ کافی حسین تھی۔

اس کے ننگے سر پر گھنگریالے بال دھول اور گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ اور اُن کا رنگ بھورا بھورا سا ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے زہر آلود تبسم اور آنکھوں سے دہشتناک شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ اس کے عریاں شانے پر ناخنوں کی خراشوں میں جما ہوا خون تین سیاہ لکیریں بن کر رہ گیا تھا۔ اس کی ننگی سڈول چھاتیوں کا رنگ صندلی تھا اور ان پر ایک لمحے سے زیادہ نگاہ ٹھہرا لینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ جس وقت میں نے اسے دیکھا وہ بالکل ننگی کھڑی تھی۔ بلا مبالغہ بالکل ننگی! اور اس بھرے بازار میں لوگ اپنے اپنے کاروبار میں اس طرح مصروف تھے جیسے انہیں خبر تک نہ ہو کہ اُن کے آگے، ان کے پہلو میں، ان کے پیچھے —— ان کے سینے پر ایک مادر زاد ننگی جوان عورت دونوں ہاتھوں سے کمر تھامے اپنی لمبی لمبی ٹانگیں پھیلائے، ہر آئے گئے سے پوچھ رہی تھی:۔

"How do you like this pose?"

ایک بوجھل احساس کے زیر اثر میری نگاہیں زمین پر ٹک گئیں۔ یوں ہی اندازے سے میں "بڑبا ڈس" میں داخل ہوگیا۔ اور سیلز مین سے دریافت کیا۔ "پولسن مکھن ہے آپ کے پاس؟"

"جی ہاں صاحب، ہے۔" اور اس کے بعد سیلز مین شاید میری فرمائش کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے تھوڑی دیر کے لئے ننگی عورت کو اپنے ذہن سے فیڈ آؤٹ کر دیا۔ اور خاموشی کو توڑتے ہوئے دوسری بات دریافت کی۔

"کیا قیمت ہے؟"

"لے جایئے۔۔۔ بالکل ٹھیک داموں پر مل جائے گا۔" اور وہ شاید پھر میری فرمائش کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے سر اُٹھا کر جب اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ کاؤنٹر پر دونوں کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں کے کٹورے پر اپنی ٹھوڑی رکھے سڑک پر کسی چیز کو بے حد یکسوئی کے ساتھ دیکھ رہا تھا ــــ جیسے شعر سوچ رہا ہو۔ اس کی توجہ کا مرکز ڈھونڈنے کو میں نے بھی سڑک کی طرف توجہ گھما دی۔ ننگی عورت کھڑی تھی۔ اس کا ایک پاؤں دوسرے پیر سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک فرضی بانسری تھام رکھی تھی۔ جیسے اب اس میں پھونک مارے گی۔ لیکن اس کے سُرخ لبوں سے جو نغمہ پھوٹا۔ وہ تھا۔

"ہاؤ ڈو یو لائک دس پوز؟" ــــ جب نوجوان سے اس وقت اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ وہ اس کی وحشت ناک نگاہوں اور زہریلی مسکراہٹ کی تاب نہ لا کر اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا ہوا سر کو ہلکے جھٹکے دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میں سیلز مین کے بالکل مُنہ کے آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ پولسن کا ڈبّہ میرے حوالے کیا۔ قیمت وصول کی اور سیلز ٹیکس بھی وصول کیا ــــ لیکن کیش میمو لکھے بغیر ہی وہ پھر شعر سوچنے میں مصروف ہو گیا۔ ویسے مجھے بیمار ہی بھائی گی

ردی پر کیش میمو لگانا بھی نہیں تھا۔ پھر مجھے ڈاکٹر سے نسخے پر دستخط کرانا بھی تھا۔ اور جلد سے جلد وہاں سے ہٹ جانا تھا۔

رات کے گیارہ بجے سے قریب ایک بجے کے درمیان روزانہ میں اور میرے چند دوست ہوٹل "ہونولولو" میں چائے پیا کرتے ہیں۔ اس وقت شہر کی گھما گھمی تقریباً ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ ہوٹل "ہونولولو" کے لاؤڈ سپیکر سے لتا، رفیع، طلعت محمود گیتا رائے اور شمشاد کے گونجے ہوئے نغمے تھک تھکا کر سو چکے ہوتے ہیں اور فضا میں سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کرنے کے لئے مناسب حد تک سکون پیدا ہو جاتا ہے۔

اس رات ہم ادب میں عریانیت کے متعلق تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ اچانک میری داہنی جانب سے ایک نسوانی ہاتھ مصافحے کے انداز میں میرے چہرے کے آگے آگیا اور اسی کے ساتھ کانوں میں آواز آئی۔

"آئی ایم این، ڈی، جی ...." جیسے کوئی انڈر گراؤنڈ انقلابی کوڈ لینگوئج میں بول رہی ہو۔ "میں آپ سے اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔" میں نے دفعتاً چونک کر دیکھا۔ وہی مادرزاد ننگی عورت دونوں ہاتھ کمر پر ایک ہی طرف رکھتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کر رہی تھی — "اِن دِس پوز۔"

"ہونولولو" کے رنگین ٹیوب لائٹ اس کے چمپئی جسم پر ایک پہلو سے گلابی اور دوسرے پہلو سے نیلی روشنی کچھ اس تناسب سے پھینک رہے تھے۔ کہ وہ بذاتِ خود اس وقت John Everard کا اُتارا ہوا کلر فوٹو گراف نظر آ رہی تھی۔

"سالی!" اسی وقت "ہونولولو" کا بڑی بڑی مونچھوں والا مینجر اپنی کرخت آواز میں گرجا۔ "تو پھر پہنچ گئی ....؟"

اور لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسے گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے سڑک تک لے گیا۔ اور اپنی مخصوص موٹی موٹی گالیاں بکتا رہا۔ پھر اس نے اس کی گداز رانوں

کی پشت پر اپنے گھٹنے سے ایک ایسا ٹھو کا لگایا کہ وہ بے قابو ہو کر قریب قریب گر پڑی۔
لیکن زمین پر جا پڑنے سے پہلے ہی اس کا سراپا مینجر کے مضبوط بازوؤں میں تھا۔ اور جب
وہ اسے اس طرح اٹھا کر پہلو والے مکان کی طرف بڑھنے لگا۔ تو اس کی لمبی لمبی ٹانگیں زور
زور سے جھول کر احتجاج کرتی رہیں۔ اور اس کے ہونٹوں پر بے باک فقرے مچلتے رہے۔
تھوڑی دیر میں پہلو والے کمرے کی کھڑکی کھل گئی اور اس سے آوازیں آنے لگیں۔

"چھوڑ دو! — مجھے چھوڑ دو! — وہ حرامی پروگریسیو ہے — وہ سالا آرٹسٹ
ہے — وہ کمینہ شریف آدمی ہے۔"

مینجر کوئی دس منٹ بعد اپنی انگلیوں میں چابیوں کا گچھا گھماتا ہوا لوٹا۔ "بند
کر دیا ہے سالی کو بابوجی!" آتے ہی وہ بولنے لگا۔ "سالی میرا سر کھا گئی ہے۔ صبح دس
بجے میں نے اپنی نئی دھوتی لپیٹ کر بھگا دیا تھا۔ مگر پھر اسی طرح دھلی دھلائی موجود ہو گئی۔
... بہت گرمی ہے سالی کو ..."

وہ اگرچہ ہم سے ہی مخاطب تھا۔ مگر اس کی باتوں میں زیادہ دلچسپی دوسرے لوگ
لے رہے تھے۔ جو تعداد میں ہم سے زیادہ تھے اور عمر میں ہم سے کم۔ اسی لئے ہم نے اسی
میں خیریت سمجھی کہ وہاں سے چل دیں۔ اس رات ہماری ادب میں عریانیت کی بحث اس
مجسم عریانیت سے ادھوری ہی رہ گئی۔

دوسرے دن میرے ایک ملاقاتی نے جو سینیٹری ڈیپارٹمنٹ کا سپروائزر رہے
مجھ سے ایک عجیب عورت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ تقریباً ہفتہ بھر سے روزانہ
بھنگیوں کے محلے میں کسی وقت پہنچ جاتی ہے اور وہاں کسی عورت کے نیم عریاں جسم پر
پھٹا پرانا لباس دیکھ کر بڑا ترس کھاتی ہے۔ نظام سرمایہ داری کو ڈانٹا ماٹ سے
اُڑا دینا چاہتی ہے۔ حکومت کو سو صلواتیں سناتی ہے۔ سب سے اخیر میں اپنا سارا لباس
اس کے حوالے کر دیتی ہے اور خود مادر زاد ننگی لوٹتی ہے۔ اور یہ بیان کرتے وقت میرے

ملاقاتی دوست نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا۔ اور شاید میرے خیالات پر طنز کرنے کیلئے چبھتے ہوئے انداز میں بولا۔

"دیکھا آپ نے؟... اس کے دماغ کی اندھیری کوٹھڑی میں غریبوں کی ہمدردی کس حد تک گھس گئی ہے!" اور قہقہے کی دوسری قسط پوری کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ "جنت کے لئے وہ اپنا آپ بھول گئی ہے... بے چاری... مجھے تو آپ لوگوں سے زیادہ ترقی پسند وہی نظر آتی ہے..."

لیکن ایسے استہزائیہ فقروں کا میں اس حد تک عادی ہو گیا ہوں کہ اسے کوئی جواب دینا غیر ضروری سمجھ کر خاموش رہا اور اس خاموشی کے درمیان میں اس بات پر غور کرتا رہا کہ کہیں یہ اسی عورت کو تو نہیں دیکھ آیا ہے۔ جس کو میں نے کئی طرح دیکھا ہے؟

اس کے بعد مہینوں تک نہ تو میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا۔ نہ اس کے بارے میں کوئی قصہ سننے میں آیا۔ البتہ رات کے درمیانی حصوں میں جب کیلنڈر کی تاریخ بدل رہی ہوتی تو "ہونو لولو" کی میزوں پر ہمارے درمیان چائے کی پیالیوں اور سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اس کا ذکر رہا کرتا۔

ہمارے دوستوں میں اس بارے میں دو رائیں نہیں تھیں۔ کہ اس عورت کی اس حالت کے پس پردہ دماغ کا خلل کارفرما ہے۔ لیکن اس باب میں اختلاف تھا —— اور گرما گرم اختلاف تھا کہ دماغ کی اس خرابی کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔

"مارکس نے کہا ہے....."

"لیکن آپ فرائڈ کو نظر انداز نہیں کر سکتے...."

"اور اینگلس کے قول کے پیش نظر..."

"مگر اسپنسر کے خیال کے مطابق...."

"لینن کے الفاظ میں...."

"آپ نے ہیولاک ایلیس کا مطالعہ کیا ہوتا تو آپ سمجھتے کہ...."

ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے مارکس، اینگلس، لینن، فرائڈ، اسپنسر اور ایلیس اور سینکڑوں مفکروں کی روحیں ہمارے اندر حلول کر گئی ہیں اور ہماری بجائے مارکس اور فرائڈ۔ اینگلس اور اسپنسر اور لینن اور ایلیس بحث کر رہے ہیں۔

"اقتصادی تباہی انسان کی ذہنی زندگی پر بھی بُری طرح اثر انداز ہو سکتی ہے..."

"لیکن آخری مرض تو دماغ ہی کا ہوا نا..."

"اس عورت کا علاج کرنا ہو تو اس ماحول کا علاج کرنا ہوگا۔ جس کی پیداوار وہ عورت ہے۔"

"جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود...."

"وہی عینیت کا سنکی اور ناکارہ فلسفہ...."

"بھیا۔ یہاں سائیکو انالیسس کے بغیر کیا راستہ ہے؟...."

"کچھ نہیں جی۔ طبقاتی نفرت کی انتہا اور اس کے بعد انقلاب..."

"مگر انقلاب کے لئے بھی تو ایک ذہنی اور دماغی انقلاب کی ضرورت...."

"بورژوائی استدلال کا اُلجھاؤ مجھے نہیں اُلجھا سکتا..."

"میں کہتا ہوں۔ میں داخلی انقلاب...."

"نہیں۔ پہلے خارجی... مادّی..."

——"پہلے مرغی!"... "پہلے انڈا...."

مجھے ان باتوں میں تقریر کی لذت بہت حاصل ہوتی تھی - اور مجھ سے کہیں زیادہ " ہونولولو " کے منیجر کو ہوتی ہوگی - کیونکہ اب وہ ہماری اس بحث میں کافی دلچسپی لینے لگا تھا - ہماری میز سے اپنے ویٹروں کو ذرا سا بھی غافل دیکھتا تو اس کی مخصوص موٹی موٹی گالیاں حرکت میں آجاتیں ــــ گالیاں ، جو اس کے خیال میں اس کی مردانگی کا ثبوت تھیں - اس کی انگشت شہادت میں چابیوں کا رنگ رقص کرتا رہتا - اور وہ ہماری باتیں سُن سُن کر مسکراتا رہتا - یقیناً اسی چھلے میں وہ چابی بھی تھی - جس نے اس رات اس ننگی عورت کو پہلو والے کمرے میں رکھ کر تالا بند کر دیا تھا ــــ ایک راز سربستہ کی طرح ــــ ایک ایسا راز سربستہ جس نے چائے کی فروخت میں اضافہ کر دیا تھا ــــ اور چابیوں کا چھلا اسی طرح منیجر کی انگلی میں چکر کھاتا رہا....

۲

بمبئی کے ہفتہ وار " داستان " کے ادارے نے اپنے افسانوی مقابلے میں میرے افسانے کو انعام کے لئے منتخب کیا تھا اور اس سلسلے میں مجھ سے میری تصویر طلب کی گئی تھی ــــ

تصویر کا پرنٹ لینے کو جب میں کامرشیل آرٹ سروس کے سٹوڈیو میں داخل ہوا اس وقت اس کا مالک سناتن ہلدار لکڑی کے فریم پر کسے ہوئے کینوس پر ایک تصویر پینٹ کر رہا تھا - یہ تصویر ایک نوجوان عورت کے جسمانی خدوخال کی تھی - اور قوسوں اور دائروں کے اس طلسم میں لباس کا کہیں تصور تک نہیں اُبھر سکا تھا - میری تصویر کا پرنٹ دینے کو جب وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے اس سے دریافت کیا -

" منٹو بابو ؟ "

غالباً اس کے والدین نے اسے بچپن میں اسی نام سے پکارا ہوگا - میں نے اکثر اس کے بے تکلف دوستوں کو بھی اسی نام سے اسے پکارتے سُنا تھا -

"منٹو بابو۔ یہ آپ کیا بنا رہے ہیں؟"

"جی یہ؟ — سر کے تیل کا لیبل ڈیزائن بن رہا ہے۔"

"لیکن سر کے تیل سے ایک مادر زاد ننگی عورت کا کیا تعلق ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ سناتن ہنسا اور کہنے لگا۔

"اس تصویر میں یہ جو سیاہ سیاہ بال ہیں" اور بالوں پر سیاہ رنگ والا برش اوپر سے نیچے کو پھیرتے ہوئے وہ کہتا گیا۔ "یہ اس کے آدھے چہرے کو اور دونوں جانب سے سینوں کو چھپاتے ہوئے اس کے زانوؤں تک پہنچ جاتے ہیں نا؟" اور ناف کے نقطے سے گھٹنے تک سُرمئی غبار سا پھیلا کر وہ ایک بار پھر ہنسا۔ "تو آپ دیکھتے ہیں نا۔ تصویر ننگی بھی ہے اور نہیں بھی۔ اس طرح یہاں اس کی عُریانیت کی پردہ پوشی کرنے والے یہ بال سب سے اہم ہیں۔"

"واہ۔" میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔ اس نے مزید کہا۔

"اور میں نے آپ کو بتایا ہے۔ یہ بالوں کے تیل کا لیبل بن رہا ہے۔"

میرے پاس خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس کی دلیل قطعی تھی۔ اور اس سے ٹکرا جانا کھیل نہیں تھا۔ سناتن نے ایک جاندار قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بالکل نہ دیکھ سکا ہوگا۔ لیکن جب اس کا قہقہہ ختم ہو گیا۔ اور سناتن نے آنکھیں کھولیں تو یکایک سنجیدہ ہوتے ہوئے وہ بولا۔

"دراصل یہ میرا اپنا طریقۂ کار ہے۔ میں پہلے جسم کا اسکیچ بنا لیا کرتا ہوں۔ بعد کو اس پر مناسب اور موزوں لباس پینٹ کر دیا کرتا ہوں۔" برش سے زانوؤں کے توس کو قدرے واضح کرتا ہوا وہ بولتا گیا۔

"یہ لکیریں ٹمپریری ہیں۔ فائنل ڈیزائن میں نظر نہیں آئیں گی۔ میں صرف ان

سے ہٹ دلوں گا۔ اس طرح Effect زیادہ نیچرل ہوا کرتا ہے" اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لکیر پھیل گئی۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ایک ننگی عورت بوتل پر چپکا کر بازار میں رکھ دی جا سکتی ہے؟"

"شاید آپ ایسا نہیں کریں گے" میں نے کہا۔ "لیکن اگر آپ ایسا کر بھی دیں تو کوئی بڑی بات نہیں۔ جیتی جاگتی تندرست اور نوجوان عورت کا گھومنا بھی تو کوئی بڑی بات نہیں۔"

میری اس بات پر سناتن چونکا ضرور، مگر ایک بے پرواہی ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب!"

"میرا مطلب بالکل یہی ہے جو میں نے کہا۔ میں نے ایسا دیکھا"

"اچھا!" اور اس کی بے پروائی قائم رہی۔

"اچھا منٹو بابو، یہ پرنٹ جو مجھے آپ نے دیا اگر اسے میں آپ کو انلارج کرنے کو دوں تو کیا پہلے آپ مجھے ننگا بنا لیں گے اس کے بعد کپڑے پہنائیں گے؟"

سناتن کو میری اس بات پر مزا آ گیا۔ اس نے ایک مرتبہ اور اپنا اُکتا دینے والا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"ہاں! Practically .... مگر واہ بھئی مسٹر وہ آپ بڑے دلچسپ آدمی ہیں!"

اس ہلکے پھلکے مذاق کے بعد اس کی مشغولیت میں خلل انداز ہونا بہتر نہ سمجھ کر میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اور چلنے کے لئے اُٹھا۔ وہ کہنے لگا۔ "بیٹھئے نا ایسی جلدی کیا ہے؟" لیکن بظاہر یہ حسن خوش اخلاقی تھی۔ اس لئے اسے نظر انداز کرتے ہوئے میں چلنے ہی والا تھا کہ سناتن یکایک برش کو رنگوں کی طشت پر رکھتے ہوئے سو فیصدی سوالیہ نشان بن کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"مسٹر و- کیا واقعی آپ نے کوئی ایسی عورت دیکھی؟"

"میں نے غلط نہیں کہا منٹو بابو۔"

"اور اسی حالت میں جیسا کہ آپ کا بیان ہے؟"

"جی۔ بالکل!"

"..... " اس کی آنکھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

"...... " میرے ہونٹ کچھ پوچھنا چاہتے تھے۔

"ہوں — ں — ں — ں!" سناتن کی ناک سے ایک طویل سانس نکلی۔

"میرا خیال ہے" میں نے خود ہی چھیڑ دیا۔ "آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" سناتن نے ایک مرتبہ میری آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر دفعتاً برش اُٹھا کر پینٹنگ کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے کہا۔

"میں اس کے — بارے میں — بہت کچھ جانتا ہوں۔" اور اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے دریافت کیا۔ "آپ کو کہیں ضروری کام سے جانا تو نہیں ہے؟"

"نہیں" میں نے جواباً کہا۔ "لیکن مجھے اپنی تصویر کا یہ پرنٹ بہر حال آج ہی بمبئی بھیج دینا چاہیے۔"

سناتن نے قریب والی میز سے رولی فلیکس کیمرہ اُٹھایا۔ اور اس کے نیچے دبے ہوئے رائٹنگ فولیو میں سے ایک سادہ لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

"پتہ لکھ دیجئے — پیڈ چاہیے؟"

"جی نہیں۔ خط میرے پاس لکھا رکھا ہے۔"

اس نے اپنے چھوکرے کو آواز دی۔ "یہ خط رجسٹرڈ پوسٹ کرآؤ۔"

چھوکرے کے چلے جانے کے بعد اس نے اپنی کرسی میرے قریب کھینچ لی۔ اور چہرے پر تمام سنجیدگی کے آثار پیدا کرتے ہوئے اپنے اوپر افسانے کا موڈ طاری کر لیا......

"نیرو پا اس کا نام ہے ــــ نیرو پا داس گپتا ــــ جس دن وہ میٹرک کا امتحان دے کر گھر لوٹی تو اس نے سنا کہ سینی ٹوریم میں اس کی ماں نے دق کے آخری درجے پر پہنچ کر دم توڑ دیا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کے باپ کو اختلاجِ قلب کے دورے جلدی جلدی پڑنے لگے ــــ اور آخر اسی طرح ایک دن اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ــــ اس کے چند رشتے دار تھے۔ وہ سب کے سب اس زمانے میں جنگی ملازمتوں میں کھپ گئے تھے۔ پھر ان کا کچھ پتہ بھی نیرو پا کو معلوم نہ تھا۔ یہ باتیں ۱۹۴۲ء کی ہیں۔

"اس کے بعد والا سال بنگال پر جس طرح مسلط ہوا وہ تو آپ بھی جانتے ہی ہوں گے جیسے قحط کے مردار خوار گدھ نے اپنے مکروہ پر پھیلا دیے ہوں ــــ مانڈ کا ایک کٹورا اور اس کی قیمت آٹھ آنے۔ پانچ سیر چاول اور اس کا معاوضہ ایک دوشیزہ کا سانس لیتا ہوا ایسا جسم جس پر دو سال کے اندر گوشت چڑھ جانے کی امید ہو۔ یقین ہو کہ زیادہ سے زیادہ دو سال میں بانہیں سڈول ہو جائیں گی۔ سینہ گداز ہو جائے گا۔ کولھا پھیل جائے گا۔ وہ جسم ایسا ہو جائے گا کہ کھڑکی سے اس کی جھلک دیکھ کر سوناگاچی کی سڑک پر چلتا ہوا راہ گیر لمحہ بھر کو رک کر اپنی جیب کا جائزہ لینے لگے گا۔

"اس زمانے میں دیہات شہر کے فٹ پاتھوں پر آبسے تھے۔ شہر کی مرد آبادی میدانِ جنگ کے خیموں میں جابسی تھی۔ عورتوں کی بھاری تعداد نچلی منزلیں چھوڑ کر بلند عمارتوں کے اونچے فلیٹوں میں جابسی تھی۔ سارا بنگال برباد ہو گیا تھا۔ ٹیگور کا وہ سنہرا بنگال (سونار بانگلہ) اس وقت صرف "خاکی بنگال" بنا ہوا تھا۔ اس وقت سب سے اہم چیز تھی خاکی وردی! اور اسی خاکی میں بنگال کا سارا "سونا" گل کر رہ گیا تھا۔

"کہنے کو بنگال ریلیف فنڈ کا بھی جنم ہوا۔ مگر اس بے چارے سے کچھ ہو نہیں سکا۔ پھر بھی اس فنڈ کے پیچھے جو جذبۂ انسانیت کام کر رہا تھا وہ قابلِ احترام ضرور ہے۔

بنگال ریلیف فنڈ کے احترام میں سناتن نے چند سیکنڈ تک خاموشی اختیار کرلی۔

اور پھر اپنا افسانہ کہنے لگا۔

"نیروپا اچھا گانا جانتی تھی۔ فنڈ جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی نے اسے" بھوکا ہے بنگال " گانے کے بہانے اپنے اندر جذب کر لیا۔ اُسے گانے کا جتنا شوق تھا۔ اس سے کہیں زیادہ گانا سُنانے کا شوق تھا۔ اور یہی دوسرا شوق اسے ملک کے اکثر شہروں میں نغمہ بلب لئے لئے پھرا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس خاص ماحول نے اس کے خیالات میں کچھ تبدیلیاں بھی پیدا کر دیں۔ آرٹ کے متعلق اسے یقین ہونے لگا کہ اس کا کوئی نہ کوئی بہت بڑا مقصد ہے۔ اور خواہ وہ مقصد کچھ بھی ہو۔ محض شوق نغمہ سرائی یا خود نمائی نہیں ہو سکتا۔ یہ اس خاص ماحول ہی کا اثر تھا۔ کہ اس نے عوام کی آسوں اور پیاسوں کی ترجمانی کو اپنے فن کا مقصد قرار دے لیا ــــ عوام کی محبوب دُھنوں کو اپنی اصطلاح میں عوامی موسیقی کہنے لگی۔ انہیں تبدیلیوں میں اس کا سبب بھی پوشیدہ ہے کہ " بھوکا ہے بنگال " اس زمانے میں اس کا محبوب ترین گیت تھا۔ لیکن بنگال کا کھُلی آنکھوں سے مطالعہ کرنے کے بعد اس کا جی چاہا کرتا کہ وامق کہیں مل جائے تو اس سے کہے کہ ایک اور گیت لکھو۔ یہ گیت بنگال کا ادھورا گیت ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھو۔

ننگا ہے بنگال ــــ!"

سناتن نے یہاں پہنچ کر ذرا سا توقف کیا۔ اور ایک سگریٹ سُلگا کر پھر بولنے لگا۔

" آپ نے سُنا ہی ہوگا۔ بنگال کے بعض علاقوں میں کپڑوں کی قلت، مہنگائی اور سیاہ بازاری نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ عورتیں یکے بعد دیگرے گھر سے باہر ہو سکتی تھیں، ایک ساتھ نہیں۔ گھر میں ایک کپڑا رہ گیا تھا۔ جسے پہن کر بہو تالاب سے گاگر بھرنے جا سکتی تھی۔ مگر ساس کو ننگے رہنے کے سبب مکان کے اندر رہنا پڑتا تھا۔ کپڑے تو خیر کپڑے ہوتے ہیں۔ کیلے کے پتوں کا آسانی سے مل جانا خواب و خیال ہو گیا

تھا.... وہ بھی اس وقت ایک نہایت ضروری جنس تھی۔ بھوک سے مرے ہوئے انسانوں کی لاش کا کفن اس زمانے میں کیلے کے پتے تھے۔ کیلے کے باغ والوں نے پتے بیچ کر کافی پیسہ پیدا کر لیا۔

اور ادھر بکنگھم مِل ہیں لاکھوں گز فیتے وکٹوریہ کراس کے فاتح سپاہیوں کی چھاتی پر آویزاں کرنے کو بنائے جا رہے تھے۔ بنگال کی عورتیں کنوؤں میں کود کود کر مرنے لگیں محض اس لئے کہ بھوکی تو وہ جی ہی رہی تھیں۔ وہ بھوکی مر بھی سکتی تھیں۔ مگر ننگی جینے اور ننگی مرنے کے لئے اُن کا ضمیر تیار نہیں تھا.... اور مسٹر و۔ میں چاہے کتنا ہی مادہ پرست ہو جاؤں۔ اخلاق ضرورت کی مادی ضرورت پر اس فوقیت کا انکار مجھ سے ہو نہیں سکے گا۔ جس کا مظاہرہ بنگال کی بھوکی عورتوں نے جی کر اور ننگی عورتوں نے مر کر کیا ہے۔ ایک طرف یہ حال تھا اور اُدھر مِل مالک لاکھوں ٹن خاکی ڈرل کے انبار میں دھنسا حکومت سے مزید ملٹری کنٹریکٹ حاصل کرنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ ننگی عورتوں کو آبِ رواں کی چادر چھپا رہی تھی۔ اور ننگے مِل مالکوں کو خاکی ڈرل کے تھان!"

سناتن کی آنکھیں کسی قدر سُرخ ہو گئیں۔ چہرہ تمتما اُٹھا اور دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ اور اس نے تاؤ میں سگریٹ کے اتنے سارے کش لے ڈالے کہ اس کے دماغ کی جھنکار دھوئیں کے لاتعداد حلقوں کی شکل میں سارے کمرے میں پھیل گئی۔ اور یہ حلقے زنجیروں میں ڈھل گئے۔ پھر آخر کار ان زنجیروں کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ کی جھنکار بھی ہوا میں تحلیل ہو گئی اور اس کی آنکھوں کی سُرخی کم ہونے لگی.... تب اس نے پھر افسانہ کہنا شروع کر دیا۔

"نیروپا نے ایک تحریک اپنی ہم عمر لڑکیوں میں چلا دی۔ ان کا کام تھا لوگوں سے فاضل لباس کا چندہ اکٹھا کرنا۔ تاکہ "سونار بانگلہ" کی سُنہری عُریانیت کو ڈھانپا جا سکے۔ انسانیت کی لاج، سیتا و مریم کی پاکدامنی اور دروپدی کی عصمت سے وابستہ

روایتوں کی یاد دلا دلاکر اس گروہ نے لوگوں کی شرافت اور انسانیت کو اُکسایا۔ انسان فطرۃً نیک ہے۔ اس کے ضمیر میں جذبۂ خیر موجود ہے۔ اس کی یہ نیکی اور شرافت سو سکتی ہے۔ قطعاً مر نہیں سکتی۔ وہ اگر سو گئی تو جھنجوڑ کر اُسے جگایا جا سکتا ہے۔ اس تحریک کو خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی۔ اور گو چھوٹے پیمانے پر اور محدود حلقے ہی میں سہی لیکن اس کو بنگال ریلیف فنڈ کا ایک جزو بنا دینے کا سہرا نیروپا داس گپتا کے سر رہا ہے۔ وہ اس گروہ کی مسلمہ لیڈر بن چکی تھی۔"

سناتن کی داستان کو بے صرف انہماک اور دلچسپی سے سنتا رہا۔

"اپنی اس تحریک کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لئے وہ ہر اس آدمی سے ملتی۔ جسے کام کا آدمی کہا جا سکتا ہے ـــــ شاعروں سے گیت لکھوائے۔ موسیقی کے ماہروں سے اُن گیتوں کی عام پسند دُھنیں ترتیب دلوائیں۔ اپنے وفد کے ساتھ لے کر نکلنے کے لئے تصویریں اور پلاکارڈ (*Placcards*) بنوائیں۔ اخبارات میں کارٹون اور اسکیچوں کے ذریعے پھیلتی ہوئی عریانیت کے مناظر چھپوائے! اسی طرح اس کی ملاقات ایک آرٹسٹ فوٹوگرافر سے ہو گئی۔"

سناتن نے سگریٹ کی گردن ایش ٹرے میں مروڑ دی۔

"لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ آرٹسٹ نوجوان تھا۔ اور اچھی شکل وصورت کا مالک تھا۔ اس کے خیالات کچھ ایسے تھے کہ اسے "ترقی پسند" کہنے کی بجائے "باغی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اکثر انتہا پسند سیاسی پارٹیوں کے آرگن، اس کے بنائے ہوئے خاکے اور تصویریں چھاپتے تھے۔ اس کے اُتارے ہوئے فوٹو عموماً کسانوں کی کسمپرسی، مزدوروں کے جلوس، یا اسٹرائک، یا بھوکے ننگے غریبوں کی زبوں حالی بیان کرتے تھے۔ انہیں اسباب سے نیروپا کو وہ کچھ اتنا پسند آگیا تھا کہ وہ اسے "کامریڈ" کہہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ نیروپا اپنی فرصت کے زیادہ سے زیادہ لمحے آرٹسٹ کے پاس ہی رہ کر گذارنے

لگی تھی ...."

سناتن نے اپنی کلائی پر گھڑی کو ایک نظر دیکھا۔

"تھوڑے دنوں کے اندر نیرد پا اسے دیوتا کی طرح پوجنے لگی۔ اب وہ اس سے اتنی بے تکلف ہو گئی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر ہی اس کے کمرے میں داخل ہو جایا کرتی تھی۔ بعض اوقات تو آرٹسٹ بے حد مصروفیت کے ساتھ پینٹنگ کرتے کرتے جب چونکتا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ اس کی اپنی مصروفیت سے کہیں زیادہ انہماک کے ساتھ اس کے عمل کو بڑی دیر سے بیٹھی بیٹھی نیرو' دیکھ رہی ہے۔"

سناتن ذرا چونک سا گیا۔ پھر ایک نامعلوم سی گھبراہٹ پر غالب آتے ہوئے آگے بڑھا....

"ابھی میں نے "نیرو" کہا نا مسٹر و—؟ وہ آرٹسٹ اسے اسی طرح پکارنے لگا تھا۔ در اصل آرٹسٹ نیرو سے نہیں، بلکہ نیرو خود آرٹسٹ سے محبت کرنے لگی تھی... اس کا الٹا بھی غلط نہیں — بات یہ ہے کہ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو اس طرح چاہنے لگے تھے جیسے شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ لیکن خیر۔ مسٹر و۔ میں اس محبت کے بکھیڑے میں آپ کا وقت خراب نہیں کروں گا..."

لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود اس موضوع سے دامن بچانے کے لئے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

"نیرو کو ایک دن کسی طرح معلوم ہوا کہ اس کا کامریڈ کہیں چلا جانے والا ہے۔ وہ بڑی بے چین ہوئی اور جب اس نے آرٹسٹ سے دریافت کیا تو اس نے اس کی تصدیق بھی کر دی۔ لیکن وہ کب جانے والا تھا اور کہاں جانے والا تھا۔ کسی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ اور کامریڈ آرٹسٹ نیرو کو بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اس انکار پر غالباً نیرو کو بڑا صدمہ ہوا۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ کامریڈ کا ایسا کون سا راز ہو سکتا

ہے۔ جس کے بارے میں وہ نیرو پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ اور اس سے بھی چھپانے پر مجبور ہے؟ اور شاید اسی سوچ میں وہ اکثر اس کے بعد سے کھوئی کھوئی سی گھنٹوں ساکت بیٹھی رہا کرتی۔ ایک دن اسٹوڈیو میں اس کی اسی کیفیت سے فائدہ اُٹھا کر کامریڈ آرٹسٹ کنوئیس پر اس کے چہرے کے خد وخال اور شیڈنگ کے اشارے نوٹ کرنے لگا۔ تو تقریباً ۴۵ منٹ تک نیرو اسی طرح بیٹھی رہی اور جب آرٹسٹ نے گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے اسے یاد دلایا کہ اس کی کمیٹی میٹنگ کا وقت نکلا جا رہا ہے تب جا کر وہ چونکی اور Easel پر اپنا چہرہ دیکھ کر اُسے سخت تعجب ہوا۔

دوسرے دن کامریڈ آرٹسٹ اسی تصویر کو تفصیل کے ساتھ بناتا رہا۔ وہ دراصل اس تصویر کو ایک یادگار تحفے کے طور پر نیرو کو دے جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ سارا دن وہ اس کے چہرے کے ارد گرد اپنے تخئیل کی مدد سے جسم کے اعضاء اور بیک گراؤنڈ وغیرہ بناتا رہا۔ اور آدھا دن محض جسمانی اعضاء کے تناسب پر صرف کر دیا۔۔ یہ اس کا مخصوص طریقۂ کار تھا۔۔۔۔"

سناتن یہاں پہنچ کر پھر برش سے تیل کے لیبل پر رنگ آمیزی کرنے لگا۔

"اور جب شام ہوگئی اور کامریڈ آرٹسٹ تھک کر چور چور ہو گیا تو اپنے اسسٹنٹ کے کمرے میں جا بیٹھا۔ اور وہاں چین اسموکنگ کرتا رہا۔ اسے اس طرح خاموش دیکھ کر اسسٹنٹ محض خاموشی کو توڑنے کے لئے بولا۔ "آج آپ نے نیرو یا دیدی کی تصویر پر سارا دن لگا دیا؟" جس پر آرٹسٹ بولا۔

"لیکن بھگوان جانے نیرو آج سارا دن کیوں نہیں آئی ؟!"

"میں تو سمجھا وہ آپ سے مل کر گئی ہوں گی۔" اسسٹنٹ تعجب سے کہنے لگا: "کیا وہ آپ سے مل کر نہیں گئیں ؟"

"لیکن کب ؟" آرٹسٹ کو اور زیادہ تعجب تھا۔ "وہ کب آئی تھی ؟"

"ابھی ابھی ـــ پندرہ منٹ ـــ زیادہ سے زیادہ بیس منٹ یا آدھا گھنٹہ ہوا ہوگا.... صرف چند منٹوں بعد ہی لوٹ گئیں ـــ اور میں سمجھا..."

"تم ہمیشہ اسی طرح سمجھتے رہو!" آرٹسٹ کے لہجے میں جھنجلاہٹ کی تلخی آ گئی۔

"اگر اس دن کامریڈ آرٹسٹ تھک کر نڈھال نہ ہو چکا ہوتا تو وہ نیرو سے ضرور مل کر معلوم کرتا کہ آخر کیا چیز تھی جو اس دن اس کے آنے میں مانع ہوئی۔ اور اگر اسسٹنٹ سچ کہتا تھا تو کیا چیز اسٹوڈیو آنے کے باوجود اس کے کمرے میں نیرو کو جانے سے روک سکی؟ مگر وہ اضمحلال کے سبب غنودگی میں جھونکے لیتے لیتے آخر سو گیا۔

"اس کے دوسرے ہی روز صبح جب وہ نیرو کی تصویر پر باقی کام کر رہا تھا دروازے پر نیرو نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ آرٹسٹ کو اس بات پر بھی تعجب ہوا کیونکہ اس کا اجازت چاہ کر "کامریڈ" آرٹسٹ کے کمرے میں داخل ہونا اب غیر معمولی بات تھی۔ تاہم اس نے فریم کو اُلٹ کر کھڑا کر دیا کیونکہ اس پر جو نیرو تھی اس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اور پھر اس نے نیرو کو اندر بلا لیا۔ اور وہ اندر آئی لیکن وہ نیرو نہ تھی وہ پیرو تیما تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے نلنی اور سمرتی تھیں۔ یہ تینوں نیرو کی سیاسی اور سماجی ہمکار تھیں۔ اس وقت ان کے چہرے احتجاج کر رہے تھے۔

"انہوں نے بتایا کہ کل شام چار پانچ بجے جب نیرو کہیں سے گھر لوٹی تو اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا اور نتھنے پھول رہے تھے، غصے سے آنکھیں چھلچھلا رہی تھیں اور اس کے ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ اس نے ان لوگوں سے بالکل بات نہیں کی اور تیز تیز قدموں سے اندر چلی گئی اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان لوگوں کے قیاس کے مطابق وہ اس وقت اسٹوڈیو سے لوٹی تھی اور اُن کو شبہہ تھا کہ کامریڈ آرٹسٹ نے نیرو کے دل کو کوئی شدید ٹھیس لگا دی تھی یا اس کی

بہت بڑی توہین کی تھی۔

"آرٹسٹ بڑی مشکل سے ان کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ ان کے یہ شبہات بے بنیاد تھے۔ اس نے انہیں بتایا کہ کل تو اس کی ملاقات بھی نیرد سے نہیں ہوئی تھی اس نے ان سے وعدہ کیا کہ شام کو وہ خود جاکر نیرو سے اس سلسلے میں بات کرے گا۔ اس طرح اُن کو رخصت کر کے وہ پھر تصویر کی تکمیل میں لگ گیا۔"

سناتن نے ایک لمبی سانس لی۔ بُرش کو پھر سے رکھتے ہوئے وہ ذرا سا دم لے کر افسانہ سُناتا گیا۔

"اس نے تصویر بڑی جاندار بنائی تھی۔ اتنی جاندار جیسے آنکھوں کے پاس لے جانے پر تصویر خوف سے آنکھیں بند کر لے گی۔ اور ناک کے پاس ہاتھ لے جانے پر گرم گرم سانس محسوس ہوگا۔ جیسے یہ تصویر نہیں تھی بلکہ خود نیرد کسی چیز کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ آسمانی بیک گراؤنڈ سے اس کی لہراتی ہوئی سیاہ لٹیں خوب میچ کر رہی تھیں۔ بینگنی ساڑی کی شکنوں میں سے جہاں جہاں نارنجی بلاؤز کا ہلکا ہلکا رنگ جھلک رہا تھا وہاں وہاں وہ شکنیں ایسی معلوم ہو رہی تھیں، جیسے انہیں چٹکی میں پکڑ لیا جاسکتا ہے۔ اس کے بھرے بھرے صندلی بازو کا گوشت زندہ نظر آتا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے اس پر ہلکی ہلکی بنفشئی رگوں میں گرم گرم خون دوڑ رہا ہے... اور اس بازو میں اگر سوئی چبھودی جائے تو تصویر چیخ اُٹھے گی۔ اور بیتاب ہو کر پہلو بدل لے گی۔"

"واہ!" بے ساختہ میں بول اُٹھا، اور وہ کہانی کہتا گیا۔

"آرٹسٹ کو اطمینان ہو گیا تھا" سناتن بولنے لگا۔ "کہ اس کامیاب اور جاندار تصویر کو دیکھ کر نیرو کا بگڑا ہوا موڈ بدل جائے گا اور اس کے ذہنی عدم توازن کا سبب جو کچھ بھی ہو، واقعات پر سنجیدگی سے بات کرنا اس کے لئے تصویر کی مدد سے ممکن

ہو گا۔ انہیں امید افزا خیالات کے ساتھ وہ تصویر کا فریم لے کر شام کو نیرو سے ملنے نکل پڑا۔ راستے میں اس نے کسی نسوانی آواز پہ رکشا رکوایا تو دیکھا پرودتیما، نلنی اور سمرتی اس کی طرف لپکی آ رہی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک رکشا پر کپڑوں کا ایک بڑا سا گھٹر لدا ہوا ہے۔ سمرتی نے اپنی بغل میں بینگنی ساڑی میں لپٹی ہوئی ایک گٹھری سی دبا رکھی تھی، سب سے پہلے اسی نے بولنا شروع کیا۔

"ہم لوگ نیرو دیدی کے گھر سے آ رہے ہیں۔ ہم نے دروازے پر آواز دی تو انہوں نے بڑے غصے میں ڈانٹ کر پوچھا کہ کون ہے؟" اور اسی طرح سانس لئے بغیر سمرتی بولتی گئی... "اور جب ہم نے بتایا کہ ہم نے بہت سا کپڑا جمع کر لیا ہے اور ان کی تقسیم کے سلسلے میں ان کا مشورہ چاہتے ہیں تو ذرا دیر کے بعد انہوں نے کھڑکی کھولی اور اس کا پردہ سرکا کر اپنی ساڑی میں بندھا ہوا یہ بنڈل پھینک دیا اور بہت زور سے گرجیں — لے جاؤ یہ مشورے تمہارے کام آئیں گے — لیکن یہ ساڑی، یہ سایا، یہ انڈر ویر اور یہ بلاؤز — انہیں مشورہ کیسے سمجھا جائے؟"

"اور ہم نے جب کچھ اور کہنے کی جرأت کی" یہ پرودتیما کہنے لگی: "تو انہوں نے ہمیں مکّار، خود غرض، فریبی، ریاکار، چار سو بیس اور اسی طرح کی اور بہت سی گالیاں دے ڈالیں —!"

"کامریڈ!" یہ گھبرائی ہوئی نلنی تھی: "نیرو دیدی کو یہ کیا ہو گیا ہے؟"

"اور سمرتی اپنے سینے پر کپڑوں کا بنڈل دبائے غم و غصہ اور شبہات کی ملی جلی نگاہوں سے آرٹسٹ کو گھور رہی تھی۔ وہ جیسے پوچھ رہی تھیں: "تم نے نیرو کے ساتھ یہ کیا سلوک کیا ہے کامریڈ؟"

"آرٹسٹ نے ایک مرتبہ اور تسلی آمیز لہجے میں ان سب کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ اس نے انہیں یقین دلایا کہ نیرو کی یہ ذہنی کیفیت جو کسی نفسیاتی حادثے کی پیداوار

معلوم ہوتی ہے اگر بہت ہی نازک صورت اختیار کر لے گی تو صوبے کا کوئی ڈاکٹر وہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے ان سے اپنا اپنا کام کرنے کو کہا۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں شاید یہ طے کیا کہ ان دونوں "کامریڈوں" کو خود ہی نپٹ لینے دو۔ اور آگے بڑھ گئیں۔"

یہاں پہنچ کر منٹو پھر دفعتاً تیل کے لیبل کی طرف متوجہ ہو گیا اور برش اُٹھا کر کمر، کولھے اور سینے کے قوسوں اور دائروں پر پھیرنے لگا۔ اور اس کی کہانی کا باقی حصہ مدھم آواز میں جاری رہا۔

"آرٹسٹ نے جب نیرو کے دروازے پر آواز دی تو اس کی آواز کو پہچان کر نیرو نے ایک وحشتناک قہقہہ لگایا۔۔۔

"تم آئے ہو کامریڈ؟ ۔۔۔ تم کس لئے آئے ہو؟" کھڑکی کے پردے کا ایک گوشہ ہٹا کر اس نے اپنا سر نکالا۔ اور باہر جھانک کر تصویر پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے بولی: "اچھا! تم تصویر لائے ہو! بہت اچھا! بہت بہتر!"

"آرٹسٹ نے جب اسے تصویر کی طرف متوجہ پایا تو موقعہ غنیمت سمجھ کر اس نے تصویر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر نیرو کے بالکل سامنے کر دیا۔ اور کہنے لگا: "دیکھو نیرو جس تحفے کا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا۔۔۔۔"

"نیرو نے یکایک تصویر سے نگاہ ہٹائی اور آرٹسٹ کی آنکھوں میں نظریں گاڑ کر کہنے لگی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو کامریڈ ۔۔۔ اپنے آپ کو تو تم فریب دے ہی رہے ہو اسی کے ساتھ مجھے بھی دھوکا دینا چاہتے ہو۔۔۔۔"

"نیرو!۔۔۔۔" لیکن نیرو نے اسے کچھ کہنے کا موقعہ نہ دیا۔

"یہ تصویر" نیرو بولتی گئی۔ "تمہاری آسوں اور پیاسوں کی حقیقی ترجمان نہیں

.... تم نے اپنی تمناؤں اور خواہشات کی اصلی تصویر نہیں بنائی ہے ....

"نیرو۔ میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب —— دروازہ کھولو۔ اطمینان سے بات کریں گے"

"میرا مطلب؟" بڑے تلخ لہجے میں نیرو نے جواب دیا" بہت صاف ہے میرا مطلب .... میں نے کل تمہارے اسٹوڈیو میں جھانکتے ہی تمہاری خواہشات کی سچی تصویر تمہاری محبت کا اصلی روپ دیکھ لیا تھا .... تم مجھ سے چھپا نہیں سکو گے ... لیکن میری نسوانیت میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس وقت میں تم سے ملاقات کر سکتی .... لیکن آج کامریڈ

"I, ve gathered enough courage ——"

اس کے لہجے سے اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی ہرن ہے جو شکاری کے ہاتھوں گھائل ہو کر بھاگتے بھاگتے اپنی موت کا یقین ہو جانے پر خود بخود شکاری کے قدموں میں آگرا ہو۔ جیسے وہی اس کی جان بچا سکے گا۔ آرٹسٹ اس چیز کو محسوس کر کے حیرت زدہ ہو گیا۔ لیکن انتہائی نرم آواز میں بولا" نیرو۔ پتہ نہیں تم کس چیز کو میری خواہشات اور میری تمنائیں کہہ رہی ہو؟"

نیرو نے دروازے کی چٹخنی ہٹا دی۔ اور میٹھی ہوئی آواز میں کہنے لگی "آجاؤ کامریڈ اندر .... اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی لو تمہاری خواہشات کیا ہیں —— کل تم نے ان کی تصویر بنائی آج تم اس چیز کو دیکھ لو۔ تمہارے لئے کچھ زیادہ فرق تو نہیں پڑے گا لیکن تم میری جرأت کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکو گے کہ تمہاری بزدلی نے اس تصویر میں حقیقت پر جو پردے ڈال دئے ہیں وہ میری بیباک محبت نے آدھ گھنٹہ پہلے اُتار پھینکے ہیں۔"

"اور جب آرٹسٹ نے دروازے کے پٹ کھول کر اندر قدم رکھا تو دوسرا قدم اُٹھا نہ سکا اور جو قدم بڑھا چکا تھا اُسے لوٹا نہ سکا —— نیرو بالکل ننگی تھی —— بلا مبالغہ بالکل ننگی! اس کے جسم پر کہیں ایک تار بھی نہیں تھا —— اس کے ہونٹوں پر برسوں کا پیاسا تبسم بے قرار تھا اور آنکھوں سے دیوانگی کی سی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں اور وہ بکے

جا رہی تھی ـــــ

"یہی ہے تمہاری سب سے بڑی تمنا۔ تمہاری خواہشات کا جیتا جاگتا مجسمہ ـــــ جس کی دنیا کے سامنے تم دیوی کی طرح پوجا کرتے ہو اور تنہائی کے ہیجان انگیز لمحات میں اپنے برش کے رویئں رویئں سے اس کے لباس کا تار تار نوچ کر علیحدہ کر ڈالتے ہو تمہاری زبان جو کھل کر نہیں کہہ سکتی وہ تمہارے قلم کی زبان سے پھوٹ نکلتا ہے۔ اور اس طرح آرٹ کے نادر نمونے اور یادگار تحفے جنم لیا کرتے ہیں۔

"آرٹسٹ کے لئے وہاں ٹھہرنا قطعی ناممکن تھا۔ وہ نہایت تلخ احساسات کے ساتھ لوٹ گیا۔ لیکن جب نیرو پا کو اس کی عدم موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اسی مجنونانہ کیفیت میں باہر نکل آئی اور جب اس نے آرٹسٹ کے رکشا کو بھاگتے دیکھا تو چیخنے لگی۔

"او کامریڈ ـــــ او شریف آدمی ـــــ اجی او آرٹسٹ ـــــ کمین کہیں کے ـــــ تم بھاگتے ہو۔ میری عزت، عصمت، حیا، میری زندگی، میرے وجود پر سے ہر غلاف اُتار کر پھینک دینے والے ریچھ ـــــ تم مجھے اس منزل پر چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے ـــــ اتنا آسان نہیں ہے یہ کام ...."

"اور رکشا بھاگتا گیا اور اس کے پیچھے نیرو بھاگنے لگی۔ اور نیرو کے پیچھے ننھے ننھے بچے بھاگنے لگے ـــــ اور جب رکشا یکایک ایک تنگ و تاریک گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا اور وہیں دو سو واٹ بلب والے سٹریٹ لائٹ کے نیچے رکشا کی سمت متعین کرنے نیرو ایک لمحہ کے لئے جب رُکی تو تماشائیوں کا حلقہ اس کے چاروں طرف سے سمٹ کر اس طرح تنگ ہونے لگا جیسے "خونخوار پھول" پر تتلی بیٹھ جائے تو اس کی پنکھڑیاں بند ہونے لگتی ہیں اور تتلی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتی ہیں۔"

سناتن کے ہاتھ سے بُرش چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ اسے اُٹھانے کو جھکا تو میں نے ایزل پر نظر ڈالی۔ تیل کے لیبل والی عورت بالکل ننگی تھی اور اس وقت بالکل متحرک سی نظر

آ رہی تھی... لیکن ظاہر ہے یہ تصویر فائنل نہیں تھی۔ یہ سناتن کا مخصوص طریق کار تھا۔ تصویر پر حسب پسند و ضرورت لباس چڑھا دینا تو اس کے برش کا کھیل تھا... برش اٹھا کر وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

"ہاں تو مسٹر و ــــ اس طرح وہ سر بازار آپ کو ننگی گھومتی مل گئی۔ اسے اکثر لوگوں نے کپڑا پہنا پہنا کر آزما لیا ہے... وہ کپڑے کہیں پھینک کر ننگی رہنا ہی پسند کرتی ہے.... بہت کافی دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا نہیں ــــ شاید وہ مر گئی۔"

پھر ذرا چونک کر اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"آپ نے اسے کب دیکھا تھا مسٹر و ــــ؟"

"جی مجھے بھی منٹو بابو.... "ذہن پر زور دیتے ہوئے میں نے جواباً کہا۔" یہی کوئی آٹھ دس مہینے ہوئے ہوں گے"ــــ اور میرے ذہن میں ہوٹل "ہونو لولو" والی مس این ڈی جی ابھر آئی اپنی پوری عریانیت کے ساتھ ــــ جیسے کسی ادبی رسالے کے سرورق پر VENUS اور منیجر کی انگلی میں گھومتا ہوا چابیوں کا چھلا رقص کرنے لگا۔

اسٹوڈیو کی کھڑکی کے پردے کو اڑاتا ہوا ہوا کا جھونکا اندر آیا تو اپنے ساتھ کچھ شور، کچھ ہنگامہ سا لیتا آیا۔ ہم دونوں نے سوالیہ نشان بنتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا پھر سناتن دروازے کی طرف لپکا اور اس کے پیچھے میں.....

باہر سڑک پر ایک ہجوم تھا۔ جب ہم بھیڑ کو چیر کر اندر پہنچنے میں کامیاب ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ نیرو پا داس گپتا اپنی پوری عریانیت سمیت فٹ پاتھ پر لیٹی ہے۔ کسی شدید درد کے احساس سے اس کی ٹانگیں یکے بعد دیگرے مڑتی ہیں اور سیدھی ہو جاتی ہیں۔ کمر سے سینے تک اس کا جسم اعصابی تشنج سے بے حس و حرکت ہے۔ البتہ اکھڑی اکھڑی سانسوں کا تموج اس کے سینے کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ آنکھیں صرف بند نہیں بلکہ بھنچی ہوئی ہیں۔ دانت ایک دوسرے پر جم کر رہ گئے ہیں۔ رخساروں پر کرب و اذیت سے گہرے قوس بن

گئے ہیں۔ اور اس کا معمول سے زیادہ پھولا ہوا پیڑو نئی زندگی کی ایک ننھی سی تصویر اُگل رہا ہے ---

دفعتاً ایمبولنس اور پولیس وین کے آگے پیچھے آ جانے کی وجہ سے بھیڑ منتشر ہونے لگی۔ میٹرنٹی ہاسپٹل کے ایمبولنس والوں نے جس وقت اسٹریچر پر اُٹھا کر نیرو کو گاڑی میں داخل کیا اس وقت تک بچے کا سر باہر آ چکا تھا اور نیرو شاید بے ہوش تھی۔

۳

میں اپنی میز پر بیٹھا ایک نئے افسانے کے آخری حصے کی تکمیل کر رہا تھا کہ میرا سینیٹری ڈیپارٹمنٹ والا سُپروائزر دوست بغل میں کچھ رسالے دبائے آ پہنچا۔ ایک ہفتہ وار " داستان " کا وہ شمارہ تھا جس کے سرورق پر میری تصویر چھپی تھی اور اندر میرے افسانے پر مجھے گولڈ میڈل کے انعام کا اعلان تھا۔ دوسرا " جنس و معاش " کا تازہ پرچہ تھا جس کے سرورق پر نیرو پا کی تصویر تھی۔ نیرو پا کی گود میں اس کی نوزائیدہ بچی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

"ننگی --- پاگل --- حاملہ --- وضع حمل کے بعد دماغی توازن بحال۔ تفصیلات صفحہ، پر صفحہ، پرچہ کا پورا اسی کے لئے وقف تھا۔ نامہ نگار خصوصی نے جن خاص باتوں پر زور دیا تھا وہ یہ تھیں۔

مریضہ کو اپنا نام معلوم نہیں۔ شوہر کا نام کامریڈ منٹو اور بچی کے باپ کا نام ہونو لولو بتاتی ہے۔ بچی کو شانتی کہہ کر پکارتی ہے۔ جب اس کو لیڈی ڈاکٹر چوپڑا نے اپنے کپڑے ٹھیک طرح سے اپنے جسم پر رکھنے کی تاکید کی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا:- "I,ve no spot on my form, Doctor, to coverup. But let this Shanti, this Daughter of Confusion put on blooming

Costumes."

اور اس کے بعد ایک مجنونانہ قہقہے کے ساتھ ہی اس نے لیڈی ڈاکٹر اور نرسوں کو ڈانٹتے ہوئے بتایا کہ اگر جلد سے جلد وہ لوگ اس کی شانتی کے لئے سفید سایا، سُرخ بلاؤز اور نیلی ساڑی کا بندوبست نہ کر دیں گی تو میں ایک تحریک چلادوں گی۔ پھر جلوس نکلیں گے نعرے لگیں گے اور جلسے ہوں گے اور اخبار ایڈیٹوریل لکھیں گے ...."

ڈاکٹر چوپڑا کا یقین ہے کہ مریضہ کا دماغی توازن جلد سے جلد بحال ہو جائیگا بچّی کے رونے پر جس انداز سے وہ اسے کلیجے سے چمٹا لیتی ہے اور " شانتی شانتی" چلا اٹھتی ہے اس میں ایک توانا اور صحت مند ماں کی غیر معمولی مامتا جھلکتی ہے اور یہی ڈاکٹر چوپڑا کے یقین کی بنیاد ہے۔

ویسے بھی " جنس و معاش " کے سرورق پر نیرد پا کی جو تصویر ہے وہ اگرچہ مجھ سے اب بھی پوچھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ؟ How do you like this pose لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت کی بجائے مسرّت کی چمک ہے اور مسکراہٹ میں زہر آلودگی کی جگہ اطمینانِ قلب اور شانتی کے معصوم ہونٹوں پر تو گویا ایک کائنات گیر امن مسکرا رہا ہے۔

یہ شانتی __ ابھی استرے کی دھار کی قاتلانہ خصوصیت سے بے خبر ہے مگر اس کی چمک دمک میں دلچسپی کے سامان پالیتی ہے۔ یہ شانتی __ سُرخ دہکتے انگاروں کو ان کے رنگ کے سبب اپنی ہتھیلی پر لینے کے لئے بے تاب ہے لیکن اسے نہیں معلوم کہ انگارے کروڑوں جھونپڑیاں جلا کر راکھ کر سکتے ہیں۔

یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ نیرد پا نے جس کا نام شانتی رکھا ہے وہ درصل شانتی کی تمنا ہے۔ خدا کرے یہ نونہال سوجھ بوجھ کے لائق ہو کر شانتی کا سندیس بن جائے!

ابوالخطیب

یہ ترقی پسند ادیب

رفعت جمال بے انتہا محنت اور تگ و دَو کے بعد رسالہ "سنگم" کا ڈیکلریشن حاصل کر پایا۔ آج وہ صبح سے کراچی کے مشہور ریستوران "کیفے دی جارج" میں اپنا دیدہ زیب پیڈ (جو اس نے ڈیکلریشن سے پہلے چھپوالیا تھا) لئے بیٹھا شاعروں اور ادیبوں کا انتظار کر رہا تھا۔

گرمی کی شدّت تھی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کے گندمی چہرے پر اس طرح بکھری پڑی تھیں جیسے کسی نے افشاں چھڑک دی ہو۔ سامنے چائے کا ٹرے رکھا تھا۔ دیر تک تنہا بیٹھے بیٹھے وہ اُکتا گیا۔ جب سوچتے سوچتے خیالی الجھنوں میں کوئی اور گرہ پڑتی تو وہ ایک دم سے گردن کو اِدھر اُدھر ہلاکر توجہ کا رُخ دوسری طرف پھیرنا چاہتا لیکن پھر سڑک پر کسی گاڑی یا بس کی ناگوار آواز اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی طرح پڑتی وہ غصہ میں لال پیلا ہو جاتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاکر مڑ مڑ کر گھڑی کو دیکھنے لگتا۔

"ساڑھے دس" گھڑی اسے پہلے ہی نقطے پر جمی نظر آئی۔ الجھن اب زہر کیطرح خون کی گردش کے ساتھ رگ رگ میں پھیلنے لگی۔ انتظار اور اشتیاق کی آمیزش سے

جو نشہ اور کیفیت اس پر طاری تھی وہ بھی اس ختم نہ ہونے والے انتظار کی طوالت سے چھٹنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کے دل میں پھر بیزاری پیدا ہوئی۔ کوٹ کی جیب سے سگریٹ نکالا اسے جلایا اور پھر کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنے لگا۔ جس کے ہاتھ میں گھڑی ہو "کہئے مسٹر! ٹائم کیا ہوا؟" اپنی میز کے پیچھے ہی اُسے ایک ہاتھ ہلتا نظر آیا جس میں ایک خوبصورت گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ وقت پوچھنے کے بعد اس نے پھر پسینہ پونچھا۔ افشاں سب جھڑ گئی۔ گندمی چہرے پر پھر باسی سیب کی سی سُرخی اُبھر آئی۔

"گیارہ"۔ گھڑی والا نوجوان بے توجہی سے جواب دے کر پھر اپنے دوستوں کی گفت گو میں محو ہو گیا۔ یہ بے توجہی رفعت جمال پر ایک اینٹ کی طرح پڑی۔ وہ تلملا گیا۔ بہت غصہ آیا۔ اُسے گھور کر بغور دیکھا تو وہ اسے کچھ بے ڈول مکروہ صورت نظر آیا۔ جس کے دانت کبھی کبھار کے ہنسنے میں باہر نکل پڑتے۔ اس نوجوان کی ناک پر بھی اس نے کچھ پیلی پیلی پکّی پھنسیاں پھیلی محسوس کیں۔ اور بھدّے پن کے اس پورے جائزے سے اس نے ایک قسم کا احساسِ برتری محسوس کیا۔ پھر اپنی شاعرانہ شخصیت ذہن میں آئی۔ جس سے طبیعت میں بڑا پن اور غرور پیدا ہوا۔ اور اس نے پاؤں کو زمین پر آہستہ آہستہ مارتے ہوئے کوئی دل خوش کُن نغمہ چھیڑ دیا۔

"بوائے چائے ــــ نہیں نہیں ومٹو ــــ ومٹو"۔ دل میں حسد اور خود پرستی کی آگ کو بجھانے کے لئے غیر شعوری طور پر پہلے چائے کی طلب محسوس کی۔ لیکن اسے پھر کچھ خیال آیا تو ومٹو کا آرڈر دے دیا۔ تاکہ یہ انتظار اور حالیہ بے توجہی کی آگ جلدی ٹھنڈی ہو۔ جس کی تپش سے اس کے حواس باختہ ہوئے جا رہے تھے۔ آرڈر دینے کے بعد وہ خاموشی سے انتظار کر رہا تھا۔ اور میز کے نیچے سگریٹ کا خالی پیکٹ اس کے جوتے سے ادھر اُدھر ہو رہا تھا۔ اپنی حرکت کے ساتھ اس نے فرش پر رگڑ کی ہلکی آواز بھی سُنی تو اس نے نیچے جھک کر دیکھا۔ اس وقت پیکٹ کا آدھا حصہ اس کے جوتے کی زد میں تھا۔

کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے زور سے اسے رگڑ دیا۔ جوڑ کھل گئے اور وہ ٹوٹ کر بیرے کی طرح فرش پر پھیل گیا۔ پھر وہ بڑبڑایا۔

"سالے اُلو کے پٹھے! آج ابھی تک نہیں آئے۔ روز تو چائے پلانے والے کے انتظار میں گھنٹوں بیٹھ کر جارج کی کرسیاں توڑتے ہیں۔"

بڑبڑانا ختم ہو چکا تھا۔ سگریٹ کا پیکٹ فرش پر چپک سا گیا تھا۔ لیکن اس کے نئے بروگ شو کی ٹھوکر اسے برابر کچوکے دیتی رہی جس سے اسے تسکین محسوس ہوئی۔ نظریں اُوپر اُٹھائیں۔ چائے کی طلب محسوس کی۔ بیرا ابھی تک نہیں آیا۔ یہ اسے اس وقت معلوم ہوا——

"بیرا! ہم نے کتنی دیر ہوئی۔ ایک چائے کا آرڈر دیا تھا۔ بہرا ہے یا کچھ پی لی ہے؟"

اس مرتبہ اس نے زور سے حاکمانہ انداز میں بیرے کو للکارا۔

بھیل بیرا رفعت کی میز کے سامنے کھڑا توس کاٹ رہا تھا۔ ان فقروں کو سنتے ہی اُس نے اپنی بڑی بڑی ڈراؤنی آنکھیں نکالیں، نتھنے پھیلائے اور پھر آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔

رفعت جمال اس سرکتی دیوار کو اپنے اُوپر گرتا دیکھ کر کچھ سٹپٹا یا۔ پسینے کی بوندیں جو کئی بار ماتھے کی شکنوں میں جذب ہو گئی تھیں، اُبھریں، کسمساہٹ سے اس کے دل میں خوف، پشیمانی اور احساسِ توہین کے ملے جُلے جذبات پیدا ہوئے۔ دل بیٹھ گیا۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ اور دل میں یہ جذبہ اُبھرا کہ اس سرکتی دیوار کو گرنے سے روک دے۔ اس کی دلیری کی تعریف کرے۔ ان مونچھوں کی تعریف کرے جو اس وقت سے پہلے کسی بیرے کے چہرے پر بڑی ناگوار اور چوہے کی دم کی طرح چپکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں —— ایک بیرے کے چہرے پر جس کی حیثیت دو کوڑی کی ہے —— صرف اس وجہ سے کہ والد محترم ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر صاحب کی بھی مونچھیں اسی طرح تنی رہتی تھیں، جو

اُن کے رعب اور دبدبہ کے مختلف اسباب میں سے ایک تھیں۔

بیرا رفعت جمال کی میز کے قریب آکر اس طرح ٹھہر گیا۔ جیسے کسی نے اس میں بریک لگا دیا ہو۔" کہو مسٹر! کیا بکتے ہو، کہیں سرافت بھی سیکھی ہے۔ کیا پڑھا لکھا ہے! تمہارا پڑھنا لکھنا تمہیں یہی تہذیب سکھاتا ہے؟ تھو۔ ایسے پڑھنے لکھنے پر جو آدمی کو آدمی نہ رکھے"

رفعت جمال ان ڈانٹوں کو سر اٹھائے بغیر کھاتا رہا۔ وہ ڈرتا تھا کہ اگر اس سے زیادہ گت بن گئی تو کیا ہوگا؟ کہیں دوسرے لوگ یہ سب باتیں سُن تو نہیں رہے؟ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ جیب سے رومال نکالنے لگا۔ اور اس دوران میں اُس نے بے پروائی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب لوگ اُسے اپنی اپنی باتوں میں مصروف نظر آئے۔ چہرے کی تنی لکیریں ڈھیلی پڑیں اور بڑے خوف زدہ انداز میں بات کو ٹالنے کے لئے اس نے پھر بیرے سے کہا۔" اچھا جاؤ۔ جلدی چائے لے آؤ"

بات کے لب و لہجے میں ابھی تک تمکنت تھی۔ اس لئے بیرے کی جوابی بہیمیت رفعت کے لئے اُبھری:" بابو۔ اُٹھئے اُٹھئے۔ یہ ہوٹل ہے چرس خانہ نہیں۔ ہمارا سیٹھ تم لوگ سے ویسا ں ہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں ہمیں چائے نہیں بیچنی۔ ایک چائے پی کر گھنٹہ بھر تم بیٹھا۔ پھر تمہارا کوئی دوسرا شاعر لوگ آیا۔ گھنٹہ بھر وہ بیٹھا۔ پھر تیسرا آگیا۔ گھنٹہ بھر کے لئے وہ بھی بیٹھ گیا۔ تم لوگ تین تین چار چار گھنٹوں تک کئی کئی ٹیبلوں کو گھیرے بیٹھے رہتے ہو۔ تم کیسے پڑھے لکھے لوگ ہو؟"

اس پوری تقریر کے بعد مچھیل بیرے نے گدھ کا تھوک کواڑوں کو پکڑ کر باہر تھوکا جیسے وہ بقیہ ذلت کی ستے اب انسانوں پر نہیں کرنا چاہتا جو درحقیقت رسیتوران میں بیٹھنے والے آج کے ہزاروں شائستہ لوگوں کے غیر انسانی رویّے کا ردِّ عمل تھی۔ تھوکنے کے بعد اس نے پھر اپنے کندھے سے میلی صافی اُتاری اور آس پاس کی میزوں کو صاف کرنے لگا۔

"ارے بھئی چائے لے آؤ۔" رفعت نے اس کا غصہ فرو کرنے کے لئے اس مرتبہ نرم اور احترام آمیز لہجے میں چائے طلب کی۔

"کہہ دیا صاحب۔ چائے فائے نہیں ہے کسی دوسرے ہوٹل کا رستہ لو۔"

ان فقروں کو رفعت جمال نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی اس کے ہاتھ پیر باندھ کر گھوڑوں کے ذریعے ریستوران کے باہر کھنچوا رہا ہو۔ اس نے پھر التجا کی: "بھائی چائے لے آؤ۔ اور معاف کر دو۔"

سامنے دیوار میں کلاک آہستہ آہستہ ٹک ٹک کر رہا تھا۔ اس کی نظر اس پر پڑی۔ دیکھا کہ سوئی اُس نقطے پر آچکی ہے جس کا اُسے انتظار تھا، تو اس نے اطمینان سے آنکھیں جھپکائیں۔ بیرا اس کی بے چارگی کو دیکھ کر بغیر کچھ کہے چپ چاپ چلا گیا۔

کیا وہ اب بھی چائے نہ لائے گا؟ اگر لوگ آجائیں، میں ان کے لئے چائے طلب کروں اور اس نے اگر ایسی حرکت کی تو کیا ہوگا؟

اس خیال کے ذہن میں اُبھرتے ہی ایک جھرجھری سی آئی۔ پھر دل بیٹھنے لگا۔ اس نے جلدی سے کوٹ کی جیب سے پھر سگریٹ نکالا اور جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

"پھر کیا ہوگا۔ میری عزت نہ ہوگی، پھر اس "سنگم" کا کیا کروں گا، یہ تو صرف اس لئے نکال رہا ہوں کہ سوسائٹی میں ایک احترام کا مقام حاصل کر سکوں۔ مارکیٹ ویلیو بن جائے۔ اور پھر دوسرے بڑے رسالے میری نظموں کو تعریفی حاشیوں کے ساتھ شائع کریں۔ اور یہ شاعر اور ادیب مجھے ایڈیٹر سمجھ کر میری خوشامد کریں کہ انہیں اپنے "سنگم" میں جگہ دے دوں۔ انہیں کبھی کبھی "چھاپ" دیا کروں۔ وہ سفارشیں لائیں۔ خوب مجھے ہوٹلوں میں کھانا کھلائیں۔ وہ سب کچھ کریں جو میں نے بڑے پرچوں میں چھپنے کے لئے کیا ہے۔ لیکن پہلے تو میں بے نیازی سے پیش آؤں اور جب وہ زیادہ خوشامد کریں تو پھر انہیں شائع کر دوں۔ بعد کے خیال کے ذہن میں آتے ہی اس میں احساسِ برتری کی گدگدی سی پیدا

ہوئی۔ جیسے بادِ نسیم کا کوئی جھونکا کسی بِن کھلی کلی کو چھو کر یوں ہی گذر جائے۔ لیکن اگر بیرا چائے نہ لایا تو اس کے دل میں پھر پشیمانی اور خوف اُبھرا۔ اس نے پھر ادھر اُدھر دیکھا۔ خوف طاری ہوا اور وہ آبدیدہ ہو گیا۔ اس نے ملتجیانہ انداز میں پھر بیرے سے چائے طلب کی۔ تاکہ جو کچھ ہونا ہے ابھی ہو جائے۔ ان لوگوں کے سامنے کچھ نہ ہو۔

"بھائی چائے لے آؤ۔"

بیرے نے کٹتے ہوئے توس کو چھوڑ کر جواب دیا۔ "لاتا ہے بابا۔ گُل کیوں مچاتا ہے؟" اس مرتبہ اس کے جواب میں انسانی ہمدردی تھی لیکن لہجہ اب تک کرخت تھا۔

رفعت جمال نے اس جواب کی چوٹ بھی محسوس کی لیکن اس خیال سے مطمئن ہو گیا کہ اب یہ مصیبت ختم ہو رہی ہے۔ اور ان لوگوں کے سامنے خیریت رہے گی۔ رفعت کا پہلا سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ اس نے دوسرا نکالا، اُسے جلایا۔ سامنے دروازے پر نظر پڑی، تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ آنکھیں امید سے چمک اُٹھیں۔ وہ اُٹھا اور لپک کر دروازے میں جا پہنچا۔ اور آنے والے کا خیر مقدم کیا۔ مگر اس کا دوست اس کے تپاک کے جواب میں "بے توجہی" سے "ابھی آتا ہوں" کہہ کر اس طرف کو بڑھ گیا جہاں دوسرے فیشن ایبل لوگ بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رفعت کی آنکھیں اس بے توجہی پر ڈبڈبا کر رہ گئیں اور وہ نڈھال ہو کر اپنی کرسی پر یوں گر گیا جیسے خزاں کا مارا ہوا پتہ پیڑ سے گر کر دھرتی کی گود میں آ گرے۔ وہ اتنا نا امید ہو گیا کہ دل میں سوچنے لگا اب میرے پاس کوئی نہیں آئے گا اور برسوں کے ارمان آج بھی پورے نہ ہونگے تو دوستوں کو یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ آج کے دن میں ادارت کا شرف حاصل کر پایا ہوں ——— لوگ کتنے ظالم ہیں۔ کائنات کتنی بے رحم ہے۔ یہ سب بورژوا ہیں" ——— یہ آخری جملے اس کے ذہن میں ایسے آئے جیسے کوئی اور اس پر عکس ڈال رہا ہو۔

چائے کی ایک پیالی اور آ چکی تھی۔ وہ اسی اُداسی کی حالت میں یوں مُنہ سے پینے

کر لئے جھکا جیسے کوئی جانور گردن نہوڑا کر پانی پی رہا ہو ۔۔۔ دھپ ۔۔۔ اس کی پیٹھ پر ایک دھاپ پڑی۔ وہ چونکا اور پریشان سا ہوا. لیکن جوں ہی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں چمک اٹھیں ۔ہیلو جعفری ! تم آ گئے ۔۔۔ میں تمہارا بڑی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔

رفعت جمال بڑے تپاک سے کھڑا ہو گیا۔ دوسری میز کے سامنے سے کرسی کھینچی۔ اور جعفری صاحب کی طرف سرکا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا: "ارے تم نے تکلیف کیوں کی، میں خود لے لیتا۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے جعفری صاحب نے ذرا بڑے پن کے انداز میں کہا۔ اور پھر اپنے اوپری لب پر ہاتھ پھیرنے لگے ۔جہاں مونچھوں کے کھیت کو صاف کیا جا چکا تھا۔

"بھئی کامریڈ. اب تم ایکٹر سے رائٹر بن گئے ۔ اچھا کیا تم نے مونچھیں صاف کرا دیں۔" رفعت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بولئے ! نہیں نہیں مولوی صاحب چائے ۔" رفعت کا پہلا لفظ غیر شعوری طور پر ادا ہوا تھا. لیکن دوسرا لفظ "مولوی صاحب" وقت کی مصلحت سے ،کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں پہلی مصیبت پھر نازل نہ ہو جائے ۔ بیرے کے کانوں میں دونوں لفظ پہنچ گئے۔ انہیں سن کر وہ صرف فتحمندانہ ہنسی ہنسا ۔ اور اندر چلا گیا۔

رفعت کو اپنے اس دانشمندانہ رویئے پر ایک گونہ اطمینان ہوا. جیب سے پیکٹ کا آخری سگریٹ نکالا اور جعفری صاحب کو پیش کیا۔ بعد میں دوسرا رکھا ہوا اجھا ہوا سگریٹ جلانے لگا۔ چائے آ چکی تھی ۔ کامریڈ جعفری خود ہی کیتلی سے چائے نکال کر رنگ کے گہرے پن کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"کیا بتاؤں کامریڈ ۔ آج کھانے سے پہلے کئی مرتبہ بیر پی چکا ہوں ۔اب پھر چائے پی رہا ہوں ۔اس چائے کا رنگ کتنا پیارا ہے جیسے کسی ملا کی پگڑی کا گہرا براؤن

رنگ — خیر چھوڑو ان باتوں کو ۔ بتاؤ تمہارے ڈیکلریشن کا کیا ہوا؟" رفعت نے اس سوال پر ایک قسم کی لطیف مسرت محسوس کی ۔ اور بہت آہستہ سے کوٹ کی جیب سے بغیر کچھ کہے اجازت نامہ نکال کر جعفری صاحب کے سامنے ڈال دیا ۔

" ویل ڈن ! کامریڈ یہ کام بہت خوب ہوا ۔ اب ذرا اس " سنگم " کو ہوشیاری سے چلانا ہے اور اچھا دوسری ضروریات ! ان کا کیا انتظام ؟ "

" کامریڈ ! بنک میں سات ہزار روپیہ پڑا ہے ۔ آخر وہ کس کام آئے گا ۔ اس دنیا میں لوگوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے جانیں دی ہیں تو کیا ۔ اردو ادب میں ترقی پسند اقدار کی پرورش کے لئے اتنے سے روپے بھی قربان نہیں کئے جاسکتے ؟ اس جاہل بیک ورڈ ، مذہب پرست پاکستان میں ہمیں ترقی پسند اقدار کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھنا ہے تاکہ رجعت پسند اسلامی تجدید کا سیلاب رک جائے ۔ اور اس قوم کے سر پر سے مذہب کا بھوت ہٹے ۔ "

اس ساری گفتگو کے دوران میں جعفری صاحب چائے کا پیالہ ختم کر چکے تھے دوسرے پیالے کے لئے پھر کیتلی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہیں سموسے یاد آئے ۔

" ارے بھئی ، صرف خالی چائے ؟ "

" ارے بھئی مولوی صاحب کچھ سموسے لائیے ۔ " رفعت نے سموسوں کا بھی آرڈر دے دیا ۔

چائے کا ایک گرم گرم گھونٹ لے کر سموسہ اٹھاتے ہوئے جعفری صاحب نے جواب دیا ۔ " ہاں کامریڈ ۔ تمہارا خیال بالکل صحیح ہے ۔ ہمیں پاکستان میں ترقی پسند اقدار کی حفاظت ضرور کرنی ہے ۔ "

" ہاں بھئی وہ لونڈیا کیسی ہے جو انجمن کی میٹنگ میں بیٹھی بحث میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہی تھی ؟ " رفعت نے بات کو دوسرے رخ پر ڈال دیا ۔

"ارے بھئی۔ ایسی تو روز ملتی ہیں۔ کس کس کا خیال کروں۔ وہ سالی تو ہر ایک سے مرعوب ہو جاتی ہے۔ جو ذرا بات ڈٹ کر کرے بس اسی کا رُعب اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ یا پھر جس کسی کی غزل، نظم یا افسانہ "نئی راہ" میں چھپ جائے۔"

"کئی کامریڈ اُسے کھا چکے ہیں۔ لیکن میرے ہاتھ ابھی نہیں آئی۔ شاید اُتو کی پٹھی نے میرا تازہ افسانہ ابھی "نئی راہ" میں نہیں پڑھا۔ ورنہ بھاگی گھر آتی۔"

"لیکن ہے رسیلی!"

"نہیں یار گداز!"

"تو پھر چلو اس کی کوٹھی پر۔ "سنگم" کے لئے کچھ مانگو۔ سالی کو چھاپ دیں گے کسی کونے کانے میں!"

"ہاں ہاں۔ کل ہی چلو۔"

"رسالہ "نئی راہ" بھی لئے چلنا۔ جس میں تمہارا افسانہ ہے۔"

"ضرور۔ ضرور۔" ۵

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ "سنگم" کے لئے "میٹر" کیسے حاصل کیا جائے؟" رفعت نے کہا۔

"یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ ارے کل پیدا ہونے والے آنا، سب کو خط لکھ کر میٹر منگا لیا جائے گا اور مقامی لوگوں کے پاس خود ہی چلے جائیں گے۔ اکبر حسین کے پاس کل ہی چلنا!"

"بھئی کامریڈ! اکبر حسین رامپوری تو بک چکا ہے حکومت کے ہاتھوں!"

"نہیں نہیں۔ تم مصلحت کو نہیں سمجھتے۔ آخر سب ہی اپنے کو پارٹی کا ہمدرد ڈیکلیر (Declare) نہیں کیا کرتے۔ سب کو اوپن (Open) نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارے کچھ آدمی گورنمنٹ کی انتظامیہ مشینری میں بھی ہونے چاہئیں۔ یہ سب انقلاب کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔"

رفعت نے پیڈ جیب سے نکال کر جعفری صاحب کے سامنے رکھ دیا۔ اور ستائش طلب نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

"بھئی "سنگم" کا پورا دفتر جیب میں لئے پھرتے ہو؟"

"نہیں نہیں کامریڈ، یونہی ضرورت کی خاطر جیب میں رکھ لایا تھا۔" اس جواب کے بعد رفعت پر کچھ جھینپ سی سوار ہو گئی۔

"اچھا تو پہلا خط فراق گورکھپوری کو لکھو۔ پھر جذبی اور مجاز، سردار جعفری اور احتشام حسین۔"

"ارے کامریڈ۔ اگر ان سب کو ایک ساتھ اور ایک دم سے لے لیا تو "سنگم" پھر پارٹی پرچہ ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس ملک میں اس سے کسی کو دلچسپی نہ ہو گی۔ مناسب یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر مختلف لوگوں سے مضامین لئے جائیں۔ اردو ادب پر پروفیسر طاہر فاروقی، نفسیات پر شیر محمد اختر اور پھر کچھ منٹو، شفیق الرحمان کا بھی ایک ہلکا پھلکا افسانہ لے لو۔ پھر سب اپنا۔ جب کچھ جگہ بچے تو کسی کامریڈ سے نعتیہ نظم لکھوا لو۔ تاکہ یہاں کے جاہلوں کو یہ خیال رہے کہ ہمارے ہاں مذہب کا بھی احترام کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔ مذہب افیون ہے۔ آج یہ سرمایہ داروں کے ہاتھ کا آلہ ہے۔ تم میں یہ رجعت پسندی کب سے آئی؟ اسلام کی آواز کو تو ہمیں کمزور کرنا ہے۔ ترقی پسند تحریکوں کا مذہب سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ پاکستان میں ہم ہر اسکول سے سمجھوتہ کر سکتے ہیں لیکن مذہب سے نہیں۔"

جعفری صاحب اس لمبی تقریر کے بعد کچھ زیادہ سنجیدہ ہو گئے۔ جیسے ان کی آنکھیں کسی طوفان کو دیکھ کر حیران اور پریشان ہوں۔

"چھوڑو کامریڈ مذہب کے اس لاشے کو۔ یہ تو اب دو دھکوں کا اور ہے۔"

رفعت نے جعفری صاحب کے موڈ کو بدلنے کے لئے مذہب پر ایک ہلکا سا چھینٹا پھینکا جیسے ہولی کے سمے کوئی گلال یا رنگ پھینک کر ماحول میں خوشی اور انبساط بکھیر دے۔

جعفری صاحب نے سامنے سے چائے کا پیالہ اُٹھایا اور آہستہ آہستہ کچھ سوچتے ہوئے چائے پیتے رہے۔

"کھٹ" اور ایک دوسرا شاعر اپنی سُرخ ٹائی کو کلی کی طرح مسلتے ہوئے پیچھے سے میز کے قریب آیا۔

"بوائے چائے۔" رفعت نے فوراً چائے کا آرڈر دیا اور خود کھڑے ہوکر اُسے کرسی پر بٹھادیا۔ "کہو بھئی مکیش تمہاری انقلابی شاعری کا کیا حال ہے؟" رفعت نے پوچھا۔

"بھئی میری شاعری کی بات تو بعد میں کرنا، پہلے یہ بتاؤ تمہارے "سنگم" کا ڈیکلریشن کس سٹیج پر ہے؟"

رفعت نے اس سوال پر مکیش کی طرف دیکھا پھر سامنے میز پر پڑے ڈیکلریشن پر نظر ڈالی۔ جو کسی بے قرار کی طرح ہوا سے اُڑ رہا تھا۔

"بھئی مل گیا۔" جعفری صاحب نے مکیش کی سوچی سمجھی بے اعتنائی کو دیکھ کر اجازت نامہ مکیش کے سامنے سرکا دیا۔ رفعت بہت خوش ہوا۔ بڑی ممنون نگاہوں سے مسکراتے ہوئے جعفری صاحب کو دیکھا۔ جواب میں جعفری صاحب بھی ہنس دیئے۔

"خوب۔ بہت خوب!"

مکیش نے میز پر اجازت نامے کے استقبال کے لئے زور زور سے دونوں ہاتھ مارے جیسے خوشی میں وہ تو بیں داغ رہا ہو۔ پھر اپنی پیلی اور شراب کے باسی نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے ہنستے ہوئے رفعت کو دیکھتا رہا۔

"ہیلو کامریڈ!" اب تیسرے افسانہ نگار کا رفعت نے اور خیر مقدم کیا اور

دوسری میز کے سامنے سے کرسی کھینچ کر اپنی میز کی طرف کرلی۔ افسانہ نگار بیٹھ گیا۔
"کہو بھئی الطاف، کوئی افسانہ یا نظم ساتھ لائے ؟"
" ہاں ہاں۔ کیوں نہیں، تمہیں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ؟"
"بیرے ایک کپ چائے اور"۔ رفعت نے چائے کا پھر آرڈر دیا۔

چائے کے پیالوں سے سامنے کی میز بھر چکی تھی۔ رفعت نے اٹھ کر دوسری میز کو ڈرتے ڈرتے سرکا کر اپنی میز سے ملا لیا۔ ڈرتے ڈرتے یوں کہ ریستوران کا ایرانی مالک کل ہی اعلان کر چکا تھا کہ وہ شاعروں اور ادیبوں سے "بیزار" ہے۔ چند چائے کی پیالیوں کی خاطر یہ سب کے سب تین تین گھنٹے تک کرسیوں کو گھیرے پڑے رہتے ہیں۔ میز سرکا کر رفعت کی نگاہیں جیسے ہی ریستوران کے مالک کی طرف اٹھیں تو اس نے دیکھا کہ وہ خونخوار کتے کی طرح آنکھیں نکال کر اس کو گھور رہا ہے۔ رفعت سہم گیا۔ اسے معاً خیال پیدا ہوا کہ کہیں بھری محفل میں یہ کچھ کہہ نہ دے۔ اس نے فوراً اس کے غصّے کو فرو کرنے کے لئے ایک گولڈ فلیک سگریٹ کا آرڈر اور دے دیا۔

"ہیلو ہیلو! آج تو تم سب نے مار ڈالا۔" تھوڑی دیر کے بعد رفعت نے ایک دم چار پانچ ادیبوں کو اور ریسیو (Receive) کیا۔ لیکن انہیں بٹھائے کہاں، انہیں کھڑے دیکھ کر رفعت نے پھر الجھن محسوس کی۔ اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ خالی میزوں کو دیکھا اور پھر سیٹھ کو جو ابھی تک گدی پر بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے بیروں کی طرف دیکھا۔ جو خود خاموش کھڑے کبھی سیٹھ کو دیکھ رہے تھے کبھی اس محفل کو۔ چاروں طرف کی ان نظروں سے اس کی الجھن وحشت میں تبدیل ہوگئی۔ بڑا پریشان ہوا سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اس نے پھر سیٹھ کی طرف دیکھا، اور ایک دم بغیر کچھ سوچے کسی اندرونی دباؤ سے مجبور ہو کر اس نے بائیں طرف کی دونوں میزوں کو سامنے کی میزوں کی قطار میں سرکا کر ملا لیا۔ ایرانی مالک خون کا گھونٹ

پی کر رہ گیا۔ بیرے بھی سیٹھ کو خاموش دیکھ کر چپ چاپ کھڑے رہے۔

"بولئے۔ پانچ چائے۔" رفعت نے پھر پہلا نفسیاتی حربہ استعمال کیا۔

خوبصورت سبز میزوں کی ایک لمبی قطار یوں معلوم ہو رہی تھی، جیسے ہری ہری گھاس کی روش "بچھی ہوئی" ہو۔ اور اس پر یہ تمام فنکار بیٹھے شعر و نغمہ پر بحث و مباحثہ کر رہے ہوں۔ پورے ریستوران میں یہ نشست اپنی قسم کی واحد تھی۔ دوسرے خریدار بیٹھے تعجب کے ساتھ ان فن کاروں کو دیکھ رہے تھے۔ اور کچھ من چلے آپس میں ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔

"ہاں بھئی تو صرف چائے ہی پر ٹرخا دو گے؟ کچھ کھانے کے لئے بھی تو ہو!" محفل میں سے ایک فرمائش اٹھی۔

"اچھا بوائے۔ نہیں، مولوی صاحب ایک درجن —"

میزوں کی اس اخضری روش پر پھر چائے کے کھنکتے پیالوں میں شعر و نغمہ کے زیر و بم آہستہ آہستہ سرمئی دھوئیں کی طرح اٹھنے لگے۔ ہوا تیز تھی۔ "سنگم" کا اجازت نامہ اس مشغولیت میں میز پر سے اڑ کر نیچے آ گرا۔ اور انجم کے جوتے کے نیچے دب گیا اور ہوا سے پھڑ پھڑانے لگا۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ اور چٹپٹے سموسوں اور شعروں کے مزے میں سب کھو گئے۔ رفعت دیر تک اس بے توجہی پر طرح طرح کے گمان کرتا رہا لیکن اس کی نظر جب میز سے پھسلتی ہوئی "سنگم" کے اجازت نامے کی تلاش میں نیچے فرش پر پڑی تو اس نے ایک کرب محسوس کیا اور اسے اسوقت ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا کلیجہ کوئی پکڑ کر چیر رہا ہو۔ اس اذیت میں اس نے اپنے دل سے سوال کیا۔

"اس تقریب کا مقصد کیا ہے؟ کیا انہیں اس کا خیال نہیں؟" اس خیال کے آتے

ہی وہ غصے سے کانپنے لگا۔

سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔ مہمانوں میں سے بعض نے محبت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ دل کی بھی ان نگاہوں کے پڑتے ہی پھر سرد پڑ گئی۔ میز بانی پھر شہ پاکر جاگی۔ اس نے پھر ایک گولڈ فلیک سگریٹ کے پیکٹ کا آرڈر دے دیا۔ محفل میں پھر چائے کے کھنکتے پیالوں کے ساتھ شعر و نغمہ دھیرے دھیرے اُٹھنے لگا۔ اس بے توجہی نے دوبارہ اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ دل میں جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی کچھ کرنے کے لئے اس بے تابی میں اس کی نظر پھر اجازت نامے پر پڑی۔ جو ابھی تک مُرغِ بسمل کی طرح انجم کے جوتے کے نیچے پڑا دب رہا تھا۔ وہ بھڑک اُٹھا اور اس کا جی چاہا کہ ان سب کو فوراً بھگا دے لیکن پھر کچھ سوچ کے رہ گیا۔ بڑے ضبط کے بعد ذرا شکوے کے لہجے میں کہا۔ "انجم صاحب! اجازت نامہ تمہارے قدموں میں عرصہ دراز سے پڑا ہوا ہے۔ ذرا اس کا بھی خیال کر لو۔"

انجم نے رفعت کی طرف دیکھا۔ اور پھر اپنے پیروں کی طرف۔ جلدی سے اجازت نامے کو اُٹھایا اور ہاتھ سے جھاڑ کر بغیر کچھ کہے میز پر رکھ کر پھر شعروں میں ڈوب گیا۔ رفعت اس مسلسل بے توجہی پر جھنجھلا کر گھبرا اُٹھا۔ ذہن شل ہو گیا اور طبیعت اُداس۔ اب اس کا جی چاہا کہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں سے بھاگ جائے کہیں ایسی جگہ چلا جائے جہاں ایسے انسان نہ ہوں جو اس کی طرف دیکھیں تک نہیں۔ اس نے پھر اسی حالت میں محفل کو ایک مرتبہ اور دیکھا اور پھر گردن نیچے ڈال دی۔ اجازت نامہ پھر میز پر سے اُڑ کر مکیش کے جوتوں سے لگ گیا۔ اور کسی جاندار شعر پر مکیش داد کے لئے اُچھلا تو اس کا جوتا اجازت نامے کو داب کر آگے پھسل گیا۔

"سر سر" کاغذ کے کسی چیز سے رگڑنے کی آواز پیدا ہوئی۔ رفعت پھر بیقرار ہوا۔ پہلے میز کو دیکھا۔ اجازت نامہ نہ ملا تو نیچے فرش پر نظر ڈالی اجازت نامہ

جوتے کی کئی رگڑوں سے مسل کر کہیں کہیں سے پھٹ چکا تھا۔ رفعت نے اس مرتبہ بڑی شدید چوٹ محسوس کی۔ جیسے اس کے کلیجے کو کسی نے زنبور سے پکڑ کر کھینچ لیا ہو۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔ وہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ اور اس کیفیت میں اس نے جھنجھلا کر کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"چلتا ہوں!" اس غیر متوقع آواز کے کانوں میں پڑتے ہی سب چونک پڑے۔ جیسے انہیں بہت دور جاتے ہوئے کسی نے روک دیا ہو۔ ان سب نے رفعت کو دیکھا۔ رفعت کے چہرے پر وحشت، اداسی، بے چارگی اور بھاگ جانے کی طلب پسینے کی بوندوں کی طرح پھیلی پڑی تھی۔ محفل پر خاموشی چھاگئی کسی نے کچھ بھی نہ کہا۔ میزوں پر بکھرے پیالے، گولڈ فلیک کے خالی ڈبے تقریباً سبھی کی نظریں کھٹکے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیسے پوچھ رہے ہوں کہ "اب کیا ہوگا یہ کیا ہوا؟"

"بھئی اتنی جلدی کہاں؟ بیٹھو۔ ذرا محفل کا یہ موڈ ختم ہو جائے تو پھر تمہارا معاملہ لیتے ہیں۔" جعفری نے اس سکوت کو توڑا۔

رفعت نے نفرت اور ہیبت کے ملے جلے انداز میں صرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو "تم لوگ روز صرف ایسے بارونق ریستورانوں میں اس لئے بیٹھے رہا کرتے ہو کہ ان شریف ادب دوست انسانوں کو لوٹو جو تمہاری ذرا سی بھی عزت کرتے ہیں تم جونک کی طرح کسی بدنصیب سے چمٹ جاتے ہو۔ اور پھر تم میں اتنی بھی انسانی غیرت نہیں، کہ ان تہذیبی مراسم کا خیال کرسکو۔ جو لاکھوں برس کی انسانی تہذیب نے ہمیں دئے ہیں۔ تمہیں تو صرف حشرات الارض کی طرح اپنے کھانے پینے اور رینگنے سے مطلب اور پھر تم تہذیب، انسانیت، انصاف اور مساوات کی بات کرتے ہو!"

رفعت کچھ دیر کھڑے رہ کر جعفری صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سارا زہر ٹپکاتا رہا۔ جعفری صاحب اس زہر کی بوندوں کی زیادہ دیر تک تاب نہ

لا سکے۔ نظریں نیچی کر لیں اور پھر خجالت کے انداز میں رفعت کو مخاطب کیا " تو واقعی جا رہے ہو ؟ "

" ہاں " رفعت نے پتلون کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر تن کر کہا۔

جعفری صاحب نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے بعد آدھا جملہ ادا کیا۔

" تو بل ؟ "

" ہاں میں جا رہا ہوں " رفعت نے پھر کرخت لہجے میں کہا۔ اور کاؤنٹر پر نو روپے چھ آنے کا بل ادا کر کے گھر چلا آیا۔

ڈیکلریشن کوٹ کی اوپری جیب میں پڑا جھانک رہا تھا جیسے وہ پھر کودنا چاہتا ہو۔ رفعت نے پھر ایک ارمان بھری نظر سے اسے دیکھا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں۔

ایس۔ ایچ واتسائن

بے دول

لیفٹیننٹ ساگر نے اپنا کیچڑ میں لت پت چمڑے کا دستانہ اُتار کر ٹرک کے دروازے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔ "گرنگ۔ تم گاڑی کے ساتھ ٹھہرو۔ ہم کچھ بندوبست کرے گا۔"

گرنگ سڑک سے جوتوں کی ایڑیاں چٹکا کر بولا۔ "ٹھیک اے صاب!"

شام ہو رہی تھی۔ موسلا دھار بارش کی وجہ سے تین دن تک نو گاؤں میں رُکے رہنے کے بعد دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے مطلع صاف ہوا تو لیفٹیننٹ ساگر نے مزید تاخیر مناسب نہ سمجھی۔ مناسب کیا، وہ آگے جانے کے لئے اتنا بے چین تھا کہ اس نے لوگوں کی تنبیہہ کو غیر ضروری احتیاط سمجھا اور یہ سوچ کر کہ وہ کم از کم شو ساگر تو جا ہی رہے گا رات تک، وہ چل پڑا تھا۔ شام تو جورہاٹ پہنچنے تک ہی ہو گئی تھی۔ لیکن شو ساگر کا مندر دیکھنے کا اشتیاق اس قدر زبردست تھا کہ وہ رُکا نہیں۔ اور جلدی جلدی چائے پی کر آگے چل پڑا۔ رات جورہاٹ میں رہے تو سویرے سیدھے چل کر ڈبرو گڑھ جانا پڑے گا اور رات شو ساگر پہنچ کر وہ سویرے مندر اور تالاب دیکھ

سکتا تھا۔ شو ساگر، اُدر ساگر، جے ساگر.... کیسے خوبصورت نام ہیں... ساگر کہلاتے ہیں تو بڑے بڑے تالاب ہوں گے... اور ہر ایک کے کنارے پر بنا ہوا مندر کسقدر خوبصورت نظر آتا ہوگا.... آسامی لوگ ہیں بھی بڑے صاف ستھرے۔ ان کے گاؤں اتنے ستھرے ہوتے ہیں۔ مندروں کا تو کہنا ہی کیا.... شو دول، اُدر دول، جے دول ساگر نٹ کے مندر کو دول کہنا کیسا شاعرانہ خیال ہے۔ سچ مچ جب تالاب کے پانی میں ہلکے ہلکے بہہ رہی ہوا سے چونکتی چاندنی میں مندر کا عکس لہراتا ہوگا تب مندر سچ مچ میں ہنڈولہ ہی معلوم ہوتا ہوگا.... اسی کشش سے وہ بڑھتا جا رہا تھا۔ تیس پینتیس میل کا کیا ہے گھنٹہ بھر کی بات ہے۔

لیکن قریب سات میل باقی تھے کہ گاڑی کچی سڑک کی کیچڑ میں دھنس گئی۔ پہلے تو سٹیرنگ ایسا مکھن کی مانند نرم چلا جیسے گاڑی نہیں کشتی کی پتوار ہو۔ اور کشتی بڑے سے بھنور میں ہچکولے کھاتی جھوم رہی ہو۔ پھر لیفٹیننٹ کے سامنے سنبھالتے سنبھالتے گاڑی آہستہ ہوکر رک گئی۔ اگرچہ پہیوں کے گھومتے رہ کر کیچڑ اچھالنے کی آواز پھر بھی آتی رہی۔

ٹرک عموماً اس کے لئے تیار ہوکر ہی چلتے تھے۔ فوراً بیلچہ نکالا گیا۔ کیچڑ صاف کرنے کی کوشش ہوئی۔ لیکن کیچڑ گہرا اور ریتلا تھا۔ بیلچے کا نہیں پمپ کا کام تھا۔ پھر ٹائروں پر لوہے کی زنجیریں چڑھائی گئیں۔ پہیئے گھومنے پر کہیں پکڑنے کو کچھ ملے تو گاڑی آگے ہلے مگر چلانے کی کوشش پر لکیر گہری کٹتی گئی اور ٹرک دھنستا گیا۔ حتیٰ کہ نیچے کا گیئر بکس بھی کیچڑ میں ڈوبنے کو ہو گیا۔ جیسے اتنا کافی نہ تھا۔ تب انجن نے دو چار بار پھٹ پھٹ پھڑ کی آواز کی اور چپ ہو گیا.... پھر سٹارٹ ہی نہ ہوا....

اندھیرے میں گرنگ کا منہ نظر نہیں آتا تھا۔ لیفٹیننٹ نے دل ہی دل میں تسلی کر لی کہ گرنگ کو بھی اس کا منہ نظر نہیں آتا ہوگا۔ گرنگ گورکھا تھا اور فوجی

گورکھوں کی زبان کم سے کم احساس کے لحاظ سے گونگی ہوتی ہے لیکن آنکھیں یا چہرے کی جھرّیاں ہر وقت گونگی نہیں ہوتیں اور اس وقت اگر ان میں لیفٹیننٹ صاب کی طفلانہ جلد بازی پر طنز کا کوئی نشان بھی نظر آ گیا تو دونوں میں خاموش بد دلی کی ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی ....

تبھی ساگر نے دستانے پھینک کر کہا" ہم کچھ بندوبست کرے گا:" اور بیچ بیچ کیچڑ میں جما جما کر بوٹ رکھتا ہوا آگے چلا۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا مگر بندوبست کیا کرے گا رات کے وقت؟ بادل پھر گھرنے لگے۔ شو ساگر سات میل ہے تو دوسرے ساگر بھی تو تین چار میل ہوں گے اور نہ جانے وہاں کوئی بستی بھی ہو گی یا نہیں۔ اور جے ساگر تو بڑے سنسان میدان میں ہے .... اس نے پڑھا تھا کہ اس میدان میں ہی رانی جے متی کو اذیتیں دے دے کر اس کے شوہر کا پتہ پوچھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پانچ لاکھ آدمی اسے دیکھنے کیلئے اکٹھے ہوئے تھے۔ اور کئی دنوں تک رانی کو ان کے سامنے ستایا اور بے عزت کیا گیا تھا۔

ایک بات ہو سکتی ہے کہ پیدل ہی شو ساگر چلا جائے مگر اس کیچڑ میں بیچ بیچ سات میل۔ اسی میں صبح ہو جائے گی اور پھر فوراً گاڑی کے لئے واپس جانا پڑیگا ... پھر نہیں۔ وہ بیکار ہے۔ دوسری صورت .... رات گاڑی میں ہی سویا جا سکتا ہے۔ لیکن گرنگ؟ وہ بھوکا ہی ہوگا.... کچّی رسد تو ہو گی لیکن بنائے گا کیسے ہساگر نے تو ناشتہ کافی کر لیا تھا۔ اس کے پاس بسکٹ وغیرہ بھی تھے اور افسری کا بڑا قاعدہ ہے کہ اپنے ماتحت کو کم سے کم کھانا تو ٹھیک کھلائے .... ممکن ہے آس پاس کوئی گاؤں ہو ____

کیچڑ میں کچھ پتہ نہ لگتا تھا کہ سڑک کتنی ہے۔ اور آس پاس کا میدان کتنا۔

پہلے تو دو چار درخت بھی کنارے کنارے تھے مگر اب وہ بھی نہیں .... دونوں طرف سپاٹ سنسان میدان تھا اور دُور کے درخت بھی اس قدر دُھندلے نظر آتے تھے کہ شک ہو جاتا تھا کہ کہیں یہ چشمے پر بنی کی کرامات ہی تو نہیں ... اب راستہ معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا۔ جہاں کیچڑ کم گہرا ہو وہی سڑک۔ اِدھر اُدھر ہٹتے ہی پنڈلیاں تک پانی میں ڈوب جاتی تھیں، اس پر وہ پھر آہستہ آہستہ ٹٹول کر درمیان میں آجاتا تھا۔

یہ کیا ہے؟ ہاں پُل سا ہے۔ یہ جنگلا ہے مگر دو پُل ہیں، مساوی الاضلاع مثلث بناتے ہوئے... کیا دو راستے ہیں؟ کس کو پکڑے؟

ایک کچھ اونچی زمین کی جانب جاتا معلوم دیتا تھا۔ اونچائی میں کیچڑ کم ہو گا۔ اس بات کی ہی کافی کشش تھی۔ پھر اونچائی سے کچھ دکھائی دینے کی امید بھی ہو سکتی تھی۔ ساگر اسی طرف کو چل پڑا۔ پُل کے پار ہی سڑک ایک اونچی اُٹھی ہوئی پٹڑی سی بن گئی کچھ آگے بڑھ کر کئی موڑ آئے۔ پھر جیسے دھان کے کھیتوں میں کہیں کہیں کئی ایک چھوٹے چھوٹے کیارے ایک ساتھ ہونے پر اُن کی منڈیر ایک دم کئی اطراف کو جاتی معلوم پڑتی۔ ساگر جیسے ایک نقطے پر کھڑا ہے۔ جہاں سے مختلف اطراف کو مختلف راستے ہیں ہر ایک کے دونوں طرف پانی ... جیسے اتھاہ سمندر میں پٹڑیاں بچھا دی گئی ہوں۔

ساگر نے ایک بار چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سنسان .... اس نے آنکھوں کی پُتلیاں پھیلائیں اور نہایت غور سے دیکھا تو لمبے بادلوں کی لکیر میں ایک اور لکیر کچھ زیادہ گھنی بھی معلوم پڑی۔ بادل کے کونے اس طرح صاف نہیں ہو سکتے۔ نہیں۔ یہ عمارت ہے... ساگر اسی کی جانب بڑھنے لگا۔ روشنی تو دکھائی نہیں دیتی۔ مگر شاید اندر کوئی ہو۔

پھر جیسے جیسے وہ نزدیک ہوتا گیا اس کی امید دھندلی پڑتی گئی۔ وہ آسامی گھر

نہیں ہو سکتا.... اتنے بڑے گھر اب کہاں ہیں — پھر یہاں، جہاں بانس کے اور پھونس کے جھونپڑے ہی ہو سکتے ہیں اور اینٹ کے گھر نہیں — ارے یہ تو کوئی بڑی عمارت ہے — کیا ہو سکتی ہے؟

شاید اس کے سوال کے جواب میں ہی اچانک آسمان میں بادل کچھ پھیکا پڑا اور اچانک ہی دھندلا سا چاند بھی جھلک گیا. اس کی ادھوری روشنی میں ساگر نے دیکھا — ایک بڑی سی اوپر سے چپٹی سی عمارت — دو منزلی بارہ دری کی مانند... برآمدے سے جن میں کئی ایک محرابیں.... ایک میں سے تو شاید آسمان جھانک پڑا....

ساگر ٹھٹھک کر لمحہ بھر اُسے دیکھتا رہا. اچانک اس کے اندر کچھ جاگا جس نے عمارت کو پہچان لیا. یہ تو اہوم راجاؤں کا کھیل کا میدان ہے. کیا نام ہے؟ رنگ محل. نہیں ہوا محل. نہیں. ٹھیک یاد نہیں آتا. پر یہ اسی بڑی سطح مرتفع کے کنارے ہے جس میں... بے متی....

یکا یک ہوا سنسنا اُٹھی. آس پاس کے پانی میں جگہ بہ جگہ نرسل کے جھنڈ تھے، وہ سب جھک کر پھسپھسا اُٹھے. جیسے راجا کی آمد پر گھر کے نوکروں میں افراتفری پھیل جائے. پھر یہ محسوس کر کے کہ چاند چھپا جا رہا ہے ساگر نے یکا یک پیٹھ موڑ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ سڑک کس طرف ہے اور کتنی دور ہے لیکن وہ ابھی اتنا بھی طے نہ کر پایا تھا کہ افق کس جگہ سطح مرتفع سے ملتا ہے اور اوپر آسمان کہاں ہے، کہ چاند چھپ گیا. اس نے اگر دھندلے خطوط کو اچھی طرح پہچان نہ رکھا ہوتا تو رنگ محل یا ہوا محل بھی کھو جاتا....

محل میں چھت ہوگی، وہاں خشکی ہوگی، وہاں آگ بھی جل سکتی ہے. شاید بستر لاکر سویا بھی جا سکتا ہے. ٹرک سے تو یہی اچھا رہے گا. گاڑی کو تو کوئی خطرہ نہیں....

ساگر جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا.

رنگ محل بہت بڑا ہو گیا تھا اس کی کرسی ہی اتنی اونچی تھی کہ آسامی گھر اس

کے پیچھے چھپ جائے۔ پکّے فرش پر پاؤں پڑتے ہی ساگر نے اندازہ لگایا تیں پینتیس سیڑھیاں ہوں گی.... سیڑھیاں چڑھ کر وہ اصل ڈیوڑھی پر پہنچے گا۔

اوپر چڑھتے چڑھتے ہوا چیخ اُٹھی۔ اس نے کئی محرابوں سے غرّا کر کہا "کون ہو تم اتنی رات گئے میری تنہائی کو توڑنے والے؟" مخالفت کی پھنکار کا یہ تھپیڑا ایسا حقیقی تھا کہ ساگر پھسپھسا ہی اُٹھا "میں۔ ساگر۔ آسرا ڈھونڈتا ہوں۔ رین بسیرا۔۔۔"

پوپلے مُنہ والا بوڑھا جیسے کھکھیا کر ہنسے ویسے ہی ہوا ہنس اُٹھی۔ ہی۔ ہی۔ ہی۔۔۔ کھی۔ کھی۔ کھی۔ یہ ہوا محل ہے ہوا محل۔ اہوم راجہ کا عشرت محل۔ اہوم راجہ کا عیش۔ عیّاش۔ جو اس مسند سے زندگی کی سڑی ہوئی بوٹی سے چھ کے چھ رسوں کو چوس کر اسے جھنجھوڑ کر پھینک دینے والے ظالم عیّاشوں کا۔۔۔ یہاں آسرا۔۔۔ یہاں بسیرا۔۔۔ ہی ہی کھی کھی۔

سیڑھیوں کی چوٹی سے محرابوں کے تلے کھڑے ساگر نے نیچے اور باہر کی جانب دیکھا سنسان، گہرا سنسان۔ بادلوں سے، بادلوں میں بسی نمی اور آگ سے، قیامت اور بجلی سے بھرا ہوا سنسان! کیا ہوا میں اسی کی غرّاہٹ ہے یا کہ نیچے پھیلی ننگی سطح مرتفع کی جس کے سینے پر دن بھر سڑ سڑ پانی کے کوڑوں کی بوچھار پڑتی رہی ہے؟ اسی سطح مرتفع کی نفرت سسکن اور کراہٹ!

اسی جگہ، اسی محراب کے نیچے کھڑے کبھی ادھ ننگے اہوم راجہ نے اپنے گٹھیلے جسم کو اکڑا کر ستار کی کھونٹی کی طرح امیٹھ کر بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو کمر بند میں اٹکا کر سیڑھیوں پر کھڑے ہوئے زخمی جسم والے راجکماروں کو اس طرح دیکھا ہوگا جیسے کوئی سانڈ خصی بیلوں کے جھنڈ کو دیکھتا ہے۔ بعد ازاں بائیں ہاتھ کی ترجنی انگلی کو اُٹھا کر دائیں بھنوں ذرا سکوڑ کر اشارے سے ہدایت کی ہوگی کہ ایذا کو ذرا سخت کیا جائے۔

لیفٹیننٹ ساگر کی ٹانگیں جیسے کمزور سی پڑ گئیں، وہ سیڑھی پر بیٹھ گیا، پاؤں نیچے کو لٹکا لئے اور پیٹھ محراب کے نچلے حصّے سے ٹیک دی۔ دن بھر سٹیرنگ پر بیٹھے بیٹھے

اس کا جسم تھک گیا تھا۔ اور پونے دو سو میل لمبی کیچڑ کی سڑک پر بنی لکیروں پر آنکھیں جمائے رکھنے کی وجہ سے آنکھیں بھی کچھ ایسے چبھنا رہی تھیں جیسے ان میں باریک پسی ہوئی ریت ڈال دی گئی ہو — وہ آنکھیں بند بھی کرنا چاہے اور بند کرنے میں تکلیف بھی ہو — وہ آنکھیں کھلی رکھ کر ہی کسی طرح نگاہ کو سمیٹ لے یا بند کر کے بھی دیکھتا رہ سکے تو۔

اہوم راجہ چولک پھا .... راجہ میں خدائی طاقت ہوتی ہے۔ اس بات پر یقین کرنے والی اہوم قوم کے لئے یہ دور از قیاس نہ تھا کہ غیر شکستہ جسم والا شخص ہی راجہ ہو سکتا ہے۔ جس کے جسم میں کوئی حصہ شکستہ ہے اس میں خدائی نور کیسے رہ سکتا ہے؟ — خدائی نور اور شکستہ؟ ناممکن! خدائی نور غیر شکستہ ہوتا ہے اور راجہ کا جسم بھی غیر شکستہ۔

اہوم روایت کے مطابق چولک پھا بھی تخت شاہی تک اپنے خاندان کے افراد کے خون کے چشمے کو عبور کر کے پہنچا تھا۔ لیکن وہ چشمہ ہمیشہ کھلا نہ رہے۔ اس کا اس نے ایک نہایت سنگدلانہ علاج سوچا۔ غیر شکستہ جسم والے شہزادے ہی راجہ ہو سکتے ہیں، لہذا ایسے جسم والے سبھی شہزادے اس کے دشمن اور ممکن قاتل ہو سکتے ہیں، ان کا علاج صرف یہ ہے کہ ان سب کا ایک ایک کان یا چھنگنی انگلی کاٹ لی جائے۔ قتل بھی نہ کرنا پڑے اور راستے کے روڑے بھی ہٹ جائیں۔ لاٹھی ٹوٹے نہ، سانپ مرے نہیں لیکن اس کے زہر آلود دانت اکھڑ جائیں۔ شکستہ جسم والے، کان کٹے یا انگلی کٹے شہزادے راجہ ہو ہی نہیں سکتے، اس لئے انہیں راجہ کو قتل کرنے کا لالچ ہی پیدا نہیں ہوگا۔

چولک پھا نے سپہ سالار کو بلا کر خفیہ حکم دیا کہ رات کو چپ چاپ شاہی خاندان کے ہر فرد کے کان یا چھگنی انگلی کاٹ کر علی الصبح راجہ کے چرنوں میں پیش کرے۔

اور صبح وہیں رنگ محل کی سیڑھیوں پر اس کے چرنوں پر وہ خوفناک بھینٹ چڑھائی گئی ہوگی اور اس نے اسی تکبر آمیز ڈھنگ سے ہونٹوں کے تار کی مانند تنے مہین خط کو ذرا موڑ کر کہا ہوگا، ہوں، اور خون بھرے تھال کو ذرا سی ٹھوکر لگا دی

ہوگی۔

چولک پھا، بے مخالف راجہ! لیکن نہیں۔ یہ تیر سا کیسا نکل گیا۔ ایک شہزادہ بھاگ گیا۔ مکمل جسم لے کر!

لیفٹیننٹ ساگر کو چولک پھا کی چیخ صاف سنائی دی ـــ مکمل۔ صاف بھاگ گیا۔ وہاں سامنے ـــ لیفٹیننٹ نے پھر آنکھوں کو کس کر بادلوں کی دیوار کو چیرنے کی کوشش کی ـــ وہاں سامنے۔ وہیں ناگا سلسلہ کوہ ہے۔ جلاوطن بہادر ناگا اقوام سے اہوم راجاؤں کی کبھی صلح صفائی نہیں رہی ـــ وہ اپنے پہاڑوں کے ننگے رام تھے۔ یہ اپنی ہموار زمین کے گھاس کے کپڑے پہن کر بھی ادھ ننگے رہنے والے مہاراجہ۔ کئی نسلوں تک جنگ کرتے رہنے کے بعد دونوں نے اپنی اپنی حدود مقرر کرلی تھیں۔ اب کوئی کسی سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا تھا۔ صرف نمک کی سرحدی جھیلوں کے لئے جنگ ہوتی تھی۔ کیونکہ نمک کی دونوں کو ضرورت تھی۔ پر اہوم کا غدار ناگا اقوام کے سردار کے پاس پناہ گزیں ہونا ناقابل برداشت ہے، ناقابل برداشت!

ہوا نے سائیں سائیں کرکے آواز ملائی ... ناقابل برداشت۔ اب تو جیسے چولک پھا کے بے بس غصّے کی لمبی سانس ساگر کے جسم کو چھو گئی ـــ یہیں کھڑے ہوکر تو اس نے لمبی سانس کھینچی ہوگی۔ اس محراب کی ہی اینٹ اینٹ میں تو اس کے سلگتے ہوئے غصے کے ذرّات ہوں گے؟

لیکن جائے گا کہاں؟ اس کی بیوی تو ہے؟ وہ جانتی ہوگی کہ اس کا شوہر کہاں ہے؟ اس کو جاننا پڑے گا۔ جے متی۔ اہوم سلطنت کی لاثانی حسینہ ـــ عوام کی لاڈلی ـــ ہونے دو۔ چولک پھا راجہ ہے۔ وہ بے دشمن، بے کھٹک راجہ بننا چاہتا ہے۔ جے متی کو اپنے شوہر کا پتہ بتانا پڑے گا ـــ چولک پھا اس کی جان نہیں چاہتا، اس کا صرف ایک کان چاہتا ہے یا پھر ایک چھنگنی۔ چاہے بائیں ہاتھ کی ہی ہو۔ کیوں نہیں بتائے گی

جے متی؟ وہ رعایا ہے اور رعایا کی ہڈی بوٹی پر بھی راجہ کا حق ہے۔

نہایت ہی مختصر ایک لمحے کے لئے چاند جھلک گیا۔ ساگر نے دیکھا سامنے کھلی، بے حد، بے طرف، بے انداز وسعت جس میں نرسلوں کی سائیں سائیں، ہوا کا لاتعداد کراہٹوں کے ساتھ رونا، اسے گھیرے ہوئے محرابوں کی غصہ بھرے سانپوں کی پھنکاریں چاند پھر چھپ گیا اور پانی کی نئی بوچھار کے ساتھ ساگر نے آنکھیں بند کر لیں۔ لاتعداد سہمی ہوئی کراہیں ــــ پانی کی مار ایسے پڑ رہی تھی جیسے ننگے چوتڑوں پر صوبہ صدیہ کے لچکیلے بیتوں کی سڑاک سڑاک۔ صدیہ یعنی شو۔ دیا۔ کب کس کا شو (لاش) کہاں ملتا تھا یاد نہیں آتا۔ مگر شو تھا ضرور ــــ کس کا شو ....

نہیں۔ جے متی کا نہیں۔ وہ تو ــــ وہ تو ان پانچ لاکھ بے بس دیکھنے والوں کے سامنے ایک لکڑی کے سٹیج پر کھڑی ہے۔ اپنی ہی اچھوتی سنرم میں، ناقابل تسخیر خاموشی میں، عزم راسخ میں لپٹی ہوئی، سات دن کی بھوکی پیاسی، مٹی اور خون کے کیچڑ میں لتھ پتھ۔ لیکن شیش ناگ کی پیشانی پر لگی ہوئی کیل کی طرح ثابت قدم اور آسمان کو چھونے والی صبح کی لو کی طرح غیر متزلزل ....

لیکن یہ کیا؟ ــــ ساگر تلملا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس کو ایسے محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں بجلی کی طرح دکھائی دینے والی لاکھوں کی بھیڑ بھی کانپ کر بھرسا کن ہو گئی ہو۔ جے متی کے گلے سے ایک تیز اور دلخراش چیخ نکل کر بوجھل کرۂ ہوائی کو چیر گئی۔ جیسے کسی تھل تھل کرتے بچھوے کے پیٹ کو مچھیرے کی برچھی .... ساگر نے بڑے زور سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ کیا جے متی ٹوٹ گئی؟ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ نرسلوں کی طرح بنا ریڑھ کے گرتی پڑتی اس پانچ لاکھ کی بھیڑ کے اندر وہی تو دیوار کی طرح اکیلی تنی کھڑی ہے۔ انسانیت کی مشعل!

اچانک عقب سے ایک متکبر، خشک اور بے غیرتی بھری ہنسی سے پیتل کی طرح

جھنجھناتی ہوئی آواز آئی "میں راجہ ہوں۔"

ساگر چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا بسنہرا ریشمی لباس، ریشمی لبادہ، سونے کی کنٹھی، اور بڑے بڑے غیر تراشیدہ جواہرات کی مالا پہنے ہونے کے باوجود ادھ ننگا سا ایک شخص اس کی طرف ایسی رحم آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی راستے میں پڑے کیڑے مکوڑے کو دیکھے۔ اس کا گٹھیلا سڈول جسم، چھینی سے تراشے ہوئے چکنے پٹھے، نکیلے نتھنے، تیل سے چمک رہے تھے۔ آنکھوں کی کور پر لالی تھی جو اپنی الگ بات کہتی تھی — میں مے بھی ہو سکتی ہوں، غرور بھی، غصہ بھی، تعیش پسندی بھی اور محض انسانی خون کی بے رحم پیاس بھی!

ساگر اس کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتا رہ گیا۔ نہ اٹھ سکا، نہ ہل سکا۔ وہ شخص پھر بولا۔

"جے متی۔ ہونہہ جے متی!" انگوٹھے اور ترجنی انگلی کی چٹکی بنا کر اس نے جھٹک دی، جیسے کوئی ہاتھ کا میل مسل کر پھینک دے۔ بغیر نعل کے بھی نقرہ بامعنی ہوتا ہے — کم سے کم راجہ کا نقرہ.....

ساگر نے کہنا چاہا "بے رحم راکشش!" لیکن اس کی آنکھوں کی لالی میں ایک مجبور کر دینے والا جادو تھا۔ ساگر نے اس کی نگاہ کے پیچھے چلتے ہوئے دیکھا۔ جے متی سچ مچ لڑکھڑا گئی تھی۔ چیخنے کے بعد اس کا جسم ڈھیلا ہو کر لٹک گیا تھا۔ کوڑوں کی مار رک گئی تھی۔ جنتا سانس روکے سن رہی تھی.....

ساگر نے بھی سانس روک لی۔ تب اس خاموشی میں اسے زیادہ صاف دکھائی دینے لگا۔ جے متی کے سامنے ایک ناگا نوجوان کھڑا تھا۔ سر پر کلغی، گلے میں لکڑی کے سروں کی مالا، منہ میں رنگ کے شکاریوں جیسے خطوط، کمر میں گھاس کی چٹائی کی کوپین، ہاتھ میں برچھی اور وہ جے متی سے کچھ کہہ رہا تھا۔

ساگر کے پیچھے سے ایک کڑکتی ہوئی آواز پھر آئی۔ "چولک پھا کے آئین میں دست اندازی کرنے والا یہ گستاخ ناگا کون ہے؟" پھر جلد ہی اس ننگے شخص کی آواز سنائی

دینے لگی اور سب خاموش ہو گئے....

"جے متی ۔ تمہارا حوصلہ قابل تعریف ہے ۔ جنتا تمہیں دیوی سمجھتی ہے مگر تم مزید بے عزتی کیوں برداشت کرو۔ راجہ کی طاقت بے پناہ ہے ۔ شہزادے کا پتہ بتا دو۔ اور چھٹکارا پاؤ ۔"

اب کی بار رانی چیخی نہیں، اس کا جسم کمزور تھا اور وہ کراہ کر رہ گئی۔

ناگا نوجوان پھر بولا ۔ "چولک پھا صرف اپنی حفاظت چاہتا ہے، شہزادے کی جان نہیں، ایک کان دے دینے میں کیا ہے، کان نہیں تو چھنگنی سہی، اتنا نقصان تو کبھی کھیل میں، یا کشتی میں بھی ہو سکتا ہے ۔"

رانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"چولک پھا ڈرپوک ہے ۔ ڈر بے رحم ہوتا ہے لیکن تم شہزادے کا پتہ بتا کر اپنی عزت اور اپنے شوہر کی جان بچا سکتی ہو ۔"

ساگر نے پیچھے سے سنا: "ہونہہ!" اور مڑ کر دیکھا اس شخص کے چہرے پر ایک سنگدل اور مکار مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔

ساگر نے جوش میں آ کر کہا ۔ "ہونہہ کیا؟"

یہ شخص تن کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر ساگر کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ اسے کیا جواب دے ۔ پھر اور بھی مکارانہ انداز سے بولا ۔ "میں چولک پھا، ڈرپوک ابھی جان لے گا لیکن ابھی تو میرے مطلب کی کہہ رہا ہے ۔"

ناگا نوجوان جے متی کے اور نزدیک جا کر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگا ۔ چولک پھا نے بھویں سکوڑ کر کہا۔

"کیا کھسپھسا رہا ہے؟"

ساگر نے آگے جھک کر سن لیا۔

"جے متی، کمار تو اپنے دوست ناگا سردار کے پاس محفوظ ہے۔ چولک پھا تو اُسے پکڑ ہی نہیں سکتا۔ تم پتہ بتا کر اپنی حفاظت کیوں نہ کرو۔ دیکھو تمہارا یہ نازک بدن..."

جوش میں آکر ساگر کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ اس نازک بدن میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ اس نے تن کر ناگا نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بزدل، نامرد — تم ناگ کیسے ہو، کمار تو امر ہے۔ کیڑا چولک پھا انہیں کیسے چھوئے گا۔ مگر لوگ کیا کہیں گے کہ کمار کی رانی جے متی نے جسمانی اذیتوں سے گھبرا کر اس کا پتہ بتا دیا۔ ہٹ جاؤ اور اپنا کلنکنی منہ میرے سامنے سے دور کر لو۔"

لوگوں میں حیرانی کی ایک لہر بجلی کی مانند دوڑ گئی۔ نرسل بڑے زور سے کانپ اُٹھے۔ گدلے پانی میں ایک ہلچل اُٹھی جس کے لہراتے ہوئے دائرے پھیلے اور پھیلتے ہی گئے۔ ہوا پھپھکار اُٹھی۔ بڑے زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ بادل اور کالے ہو گئے۔ یہ رات ہے یا قیامت کی رات، عذاب کی رات — ساتویں رات کہ نویں رات، اور جے متی کیا اب بول بھی سکتی ہے۔ یہ اس کے مصمم ارادے کی خاموشی ہے یا ضعف کی؟ اور یہ بھیڑ وہی ہے یا اور۔ وہی ناگا نوجوان ہے یا کوئی دوسرا، یا بھیڑ میں کئی ناگا بکھرے ہوئے ہیں....

چولک پھا نے تلخ لہجے میں کہا: "پھر آیا وہ ناگا؟"

ناگا نوجوان نے پکار کر کہا: "جے متی! رانی جے متی!"

رانی ہلی جُلی نہیں۔

بہادر پھر بولا "رانی میں اُسی ناگا سردار کا ایلچی ہوں جس کے پاس کمار نے پناہ لی ہے۔ میری بات سنو۔"

رانی کا جسم کانپ اُٹھا۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کچھ بولی نہیں بول سکی ہی نہیں۔

"تم کمار کا پتہ دے دو۔ سردار اس کی حفاظت کریں گے وہ محفوظ ہیں ۔"

رانی کی آنکھیں کچھ گہری ہوگئیں۔ بڑے عذاب سے اس نے کہا: "نیچ" اس نے ایک بار ہونٹوں پر زبان پھیری اور کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

چولک بھا نے وہیں سے حکم دیا۔" پانی دو اسے۔ بولنے دو۔"

کسی نے رانی کے ہونٹوں کی طرف پانی بڑھایا۔ وہ تھوڑی دیر مٹی کے کٹورے کی طرف تشنگی آمیز نگاہوں سے دیکھتی رہی، پھر اس نے ناگا نوجوان کو آنکھ بھر کر دیکھا۔ پھر ایک گھونٹ پی لیا۔ اسی وقت چولک بھا نے کہا: "بس ایک گھونٹ، زیادہ نہیں۔"

رانی نے ایک بار نگاہ پھر اس لاکھوں کے مجمع پر دوڑائی۔ پھر ناگا نوجوان پر آنکھیں گاڑ کر بولی۔" کمار محفوظ ہے اور کمار کی یہ پانچ لاکھ رعایا، جو اُن کے لئے آنکھیں بچھائے ہوئے ہے، ایک رہنما کے لئے جس کے پیچھے چل کر ظالم کا تختہ اُلٹ سکے۔ جو ایک آدرش مانگتی ہے ___ میں اس کی امید توڑ دوں ___ اسے ہرا دوں، کمار کو شکست دے دوں!"

وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوئی۔ چولک بھا نے ایک بار نظر دوڑا کر تمام رعایا کو دیکھ لیا۔ اس کی آنکھ کہیں جمی نہیں۔ جیسے اس بھیڑ میں اسے جمنے کے لائق کچھ ملا نہیں، جیسے رینگتے کیڑوں پر نگاہ نہیں جمتی۔

ناگا نے کہا:" رعایا تو راجہ چولک بھا کی ہے نا؟"

رانی نے پھر اسے نظریں ٹکا کر دیکھا پھر آہستہ آہستہ کہا:" چولک" اور پھر کچھ اس طرح نام ادھورا چھوڑ دیا کہ اس کے لینے سے منہ بھرشٹ ہو جائے گا۔ پھر کہا:" یہ رعایا کمار کی ہے ___ جا کر ناگا سردار سے کہنا کہ کمار ___" وہ پھر رُک گئی۔" پر تو ___ تو تو ناگا نہیں ہے۔ تو تو اس ___ اس گدھ کی رعایا ہے ___ جا اس کے گندے پنجے کو چاٹ!"

رانی کی آنکھیں چولک بھا کی جانب گھومیں۔ مگر اس کی نگاہ نے اسے چھوا نہیں، جیسے کسی لجلجی چیز کی طرف آنکھیں چڑھانے میں بھی نفرت ہوتی ہے۔

ناگا نے مسکرا کر کہا :" کہاں ہے میرا راجہ ؟"

چولک پھا نے وہیں سے پکار کر کہا :" میں یہاں ہوں ، اہوم سلطنت کا مطلق العنان حکمران !"

ناگا نوجوان فوراً اس کے پاس چلا آیا۔

ساگر نے دیکھا کہ بھیڑ کا رنگ بدل گیا ہے۔ ویسا ہی اندھیرا ، ویسی ہی بے پناہ وسعت لیکن اس میں بھی ایک نظم و نسق۔ بھیڑ میں ناگا تماشائی جگہ بجگہ بکھرے ہونے کے باوجود ایک تنظیم میں بندھے معلوم ہوتے تھے۔

ناگا نے قریب سے کہا :" میرے راجہ !"

یکایک بڑے زور کی گڑگڑاہٹ ہوئی۔ ساگر کھڑا ہو گیا اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ناگا نوجوان فوراً برچھی کے سہارے کئی ایک سیڑھیاں پھاند کر چولک پھا کے پاس پہنچ گیا ہے۔ برچھی سیڑھی کی اینٹوں کی دراڑ میں پھنسی رہ گئی ہے لیکن ناگا چولک پھا کو دھکے سے گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ گیا ہے۔ ادھر مجمع میں بجلی سی کڑک گئی ہے ـــ "کمار کی جے !" کسی نے اچھل کر سٹیج پر سے کوڑے مارنے والے جلادوں کو گرا دیا ہے۔ کسی نے اپنے جسم سے کپڑا اتار کر جے متی پر ڈال دیا ہے اور کوئی اس کے بندھن کی رسی ٹٹول رہا ہے....

مگر چولک پھا اور ناگا ـــ ساگر مسحور سا کھڑا تھا۔ اس کی نظر چولک پھا پر جا جمی تھی.... اچانک اس نے دیکھا کہ ناگا تو نہتا ہے لیکن نیچے پڑے چولک پھا کے ہاتھ میں ایک چاند نما سا کھنڈا ہے۔ جس سے وہ ناگا کے کان کا نشانہ کر رہا ہے۔ ناگا بے دھیان ہے۔ مگر چولک پھا کی آنکھوں میں پہچان ہے کہ ناگا اور کوئی نہیں خود کمار ہے ، اور وہ کھنڈے سے نشانہ باندھ رہا ہے۔

کمار چھاتی پر ہے لیکن مر جائے گا.... یا اگر زخمی بھی ہو گیا تو.... چولک پھا ہی

مر گیا تو بھی اگر کمار زخمی ہو گیا تو ۔۔۔ ساگر اچھلا ۔۔۔۔ وہ چولک پھا کا ہاتھ پکڑ لے گا۔ اس سے کھنڈا چھین لے گا۔

لیکن وہ بے احتیاطی میں اچھلا تھا۔ اس کا کیچڑ بھرا بوٹ سیڑھی پر پھسل گیا اور وہ لڑھکتا لڑھکتا نیچے جا گرا۔

اب ؟ چولک پھا نے نشانہ باندھ لیا ہے۔ کھنڈے پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی ہے اب ۔۔۔

لیفٹیننٹ ساگر نے وہیں پڑے پڑے کمر سے ریوالور کھینچا اور شست لے کر داغ دیا ....." دھائیں ! "

دھواں ہو گیا، ہٹے گا تو دکھائی دے گا۔ مگر دھواں ہٹتا کیوں نہیں ؟ آگ لگ گئی رنگ محل جل رہا ہے۔ لپٹیں ادھر ادھر دوڑ رہی ہیں۔ کیا چولک پھا جل گیا ۔۔۔ اور کمار ۔۔۔ کیا یہ کمار کی فتح کے نعرے ہیں ؟ ۔۔۔ یا جے متی کی ؟ ۔۔۔ یہ انوکھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی گونج جس میں وہ ایک طرح سے ڈوبا جا رہا ہے۔ ڈوبا جا رہا ہے ۔۔۔۔ نہیں اسے سنبھلنا ہو گا۔

لیفٹیننٹ ساگر اچانک جاگ کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ہکا بکا ہو کر ایک بار چاروں طرف دیکھا، پھر اس کے منتشر خیالات سنبھل گئے۔ دور سے دو ٹرکوں کی دو جوڑی بتیاں پوری روشنی سے جگمگا رہی تھیں، اور لمحہ بہ لمحہ سرچ لائٹ اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی رنگ محل کی سیڑھیوں کو اس طرح چمکا رہی تھی جیسے بادلوں سے زمین تک کسی دیوتا کے اترنے کا راستہ کھل جاتا ہو۔ دونوں ٹرکوں کے ہارن پورے زور سے بجائے جا رہے تھے۔

بوچھار سے بھیگا ہوا جسم جھاڑ کر لیفٹیننٹ ساگر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا وہ رنگ محل کی سیڑھیوں پر ہی سو گیا تھا ؟ ایک بار آنکھیں دوڑا کر اس نے محراب کو دیکھا۔ چاند نکل آیا

تھا۔ محراب کی اینٹ دکھائی دے رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔

نیچے سے آواز آئی۔ "صاب دوسرا گارڈی آ گیا۔ ٹوکر کے لے جائے گا۔"

ساگر نے منہ اُٹھا کر سامنے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ دور چوکور تالاب چمک رہا تھا، جس کے کنارے پر مندر بھاگتے بادلوں کے درمیان کانپتا ہوا ایسے لگ رہا تھا جیسے روپہلی چاندنی سے ڈھکا ہوا ہنڈولہ — کیا ایک رانی کے ابھیمان کا نشان جس نے راجہ کو بچایا۔ یا ایک ناری کے حوصلے کا، جس نے مرد کی رہنمائی کی، یا کہ تمام انسانیت کی آزادی کی، نہ مٹنے والی خواہش کا نڈر، ناقابلِ تسخیر جے دول؟

جے گوپال

سات پتّیاں اور ایک پھول

نئی دہلی میں اب تو رونق سارا برس بنی رہتی ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی شملہ جانے والی بات پرانی ہو گئی ہے۔ اور مغربی پنجاب سے آئے ہوئے درمیانی طبقہ کے لوگوں نے سرکاری ملازمین کی دلی کو بارونق بنانے کی کوششوں کو آسان کر دیا ہے۔ کسی سوشل فنکشن میں کبھی کبھی لاہور کا ذکر آ جاتا ہے۔ لاہور کالجوں کا شہر تھا۔ فیشن کا گڑھ تھا۔ اخباروں کا شہر تھا، پنجابی کلچر کا مرکز تھا۔ پر جھٹ ہی ایسی بات کرنے والے کو جھٹک کر ساتھ والا کافی ہاؤس میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے بولو کس بات میں کمی ہے۔

دسمبر جنوری کے دنوں میں دلی کروٹ سی لیتی محسوس ہوتی ہے۔ یوں معلوم دیتا ہے کہ سیر و تفریح اور نمائش کے دلدادہ لوگ گئے برس کی سٹاک ٹیکنگ کے ساتھ ساتھ نئے برس کی آمد کو لبیک کہنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ کناٹ پلیس اور چاندنی چوک میں کلیرنس سیل اور پرائس کٹ جہاں بیوپاریوں کی خاصی آمدنی کا موجب بنتے ہیں وہاں خریداروں کو اپنی قوتِ خرید آزمانے

اور خود نمائشی کا ایک اچھا موقعہ بھی مہیا کر دیتے ہیں۔

راجدھانی میں کنسرٹ، ورائٹی شو، ڈرامے اور آرٹ اور کلچر کی نمائشوں اور ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے میچوں کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ انہیں دنوں سنیما والے بہترین، بیش بہا اور گراں قدر پیش کشوں کو پردہ سیمیں پر پیش کرتے ہیں۔ اگر پانچ شو صرف اتوار کو ہی ہوں تو چار شو روز کی بات رہتی ہے۔ ان دنوں میں سیاسی پارٹیوں میں بھی کافی جوش آجاتا ہے۔ سیاستداں اپنی تحریکوں میں اکٹھا میٹھا پھینکتے ہیں۔ اور کوئی نہ کوئی سیاسی مجمع جما لیتے ہیں، اور اپنے بہترین مداریوں کی آمد کے بڑے بڑے اشتہار چاروں طرف چپکا دیتے ہیں۔

وہ دونوں پہلی بار دلی آئے تھے۔ دہلی کی چھب سے لطف اندوز ہونے کے لئے وہ ہر محفل میں پہنچتے۔ بے طرح ہنستے۔ بے اندازہ کھاتے اور سیر کا مزہ لینے کے لئے اپنی ٹانگوں پر ہی سوار رہتے۔ کسی منظر پر آنکھیں گاڑ دیتے تو اٹھانے کا نام نہ لیتے۔

سوموار کا دن تھا۔ اب انہوں نے باہر سے دلی بہت کچھ دیکھ لی تھی۔ دوسرا راؤنڈ دلی کے اندر سے دیکھنے کا تھا۔ جو اب شروع ہوا۔ دوپہر بعد وہ پارلیمنٹ میں پہنچے۔ وزیٹرس گیلری تقریباً بھری ہوئی تھی۔ کچھ دیر تو وہ سرکاری بنچوں پر بیٹھی موریتوں کو مختلف ناموں سے منسوب کرتے رہے۔ جب ممبروں اور وزیروں کو دیکھ چکے تو ان کی نگاہیں قدرتی طور پر وزیٹر گیلری پر گئیں۔ ایک منٹ بعد دونوں نے نگاہیں ادھر سے واپس کر کے آپس میں ملائیں اور مسکرا دئے۔ کسی کو بھی یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ کیوں مسکرائے ہیں۔ یا وہ مسکرائے بھی ہیں کہ نہیں۔ اس طرف ان کی نگاہیں جب پھر ادھر گئیں تو پُر معنی ہو کر واپس لوٹیں۔ "آخر ہے کون؟" ایک نے دھیرے سے کہا۔ دوسرے نے کسی قدر اونچی آواز میں مگر صرف اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "سات پتیاں اور ایک پھول"۔

ایک دوشیزہ پیچھے کی لائنوں میں ان کی دائیں طرف بیٹھی تھی۔ گول چہرہ، نمایاں ٹھوڑی۔ موٹی موٹی آنکھیں اور دل میں کھب جانے والی ادائیں۔ وہ ہر وزیٹر کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور اس کی وجہ تھی سنوارے ہوئے گیسو اور ان میں بائیں جانب گڑا ہوا ایک موٹا سا گلاب کا سفید پھول۔ اور اس کے گرد با ترتیب دائرہ میں سات سبز پتیاں۔ اور پھر اس کا ہر وقت کچھ نہ کچھ حرکت کرنا۔ کبھی اس کا سر دائیں جانب تھوڑا سا جھک جاتا۔ کبھی اس کی آنکھیں ایک خاص زاویہ میں آ کر رُک جاتیں اور کبھی اس کے لطیف ہونٹوں کی پنکھڑیاں آدھی کھِل کر اٹک جاتیں اور وہ سیٹ پر سے تھوڑی سی اونچی ہوتی اور گردن کو تھوڑا گھما کر نیچے ممبران کی طرف دیکھتی۔ لیکن اس کی نظریں سرکاری بنچوں کی طرف نہیں تھیں۔ وہ اپوزیشن کی طرف بے قراری سے کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔" وہ شاید اس مہربان کو دیکھ رہی ہے جس نے اسے پاس دلایا ہے" اور یہ بات بہت حد تک ٹھیک تھی۔ کیونکہ جب اپوزیشن میں سے ایک سانولا سا ناٹے قد کا ممبر اپنے پاؤں پر تیزی سے کھڑا ہوا تو اس نے اپنے سر کو ترنم سے کئی بار ہلایا اور پاس بیٹھے ساتھی کی طرف دیکھا جو پہلے ہی سے اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ مانو خاموش تائید کر رہا ہو۔ اور اس نے اسے انگلی کے اشارے سے نیچے بول رہے ممبر کی طرف متوجہ کیا۔

"کیا دلفریب تھا سفید گلاب کا پھول اس سردی کے موسم میں؟" اپنے ساتھی کے چٹکی بھرتے ہوئے اس نے کہا: "ایک پھول اور سات پتیاں، سات پتیاں اور ایک پھول"

منگلوار کی شام ہارڈنگ گراؤنڈ میں ہاکی کا فائنل میچ تھا۔ کوئی باہر کی ٹیم تھی بہت زیادہ لوگ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ جب یہ دونوں پہنچے تو میچ شروع ہو چکا تھا اور لان چاروں طرف سے انسانی سروں سے گھرا تھا۔ انہیں کچھ منٹ تو ٹیموں اور کھلاڑیوں کی ترتیب سمجھنے میں لگے۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو سیٹ کر لیا تو سامنے قنات کے پیچھے میز پر پڑی چاندی کی ٹرافی پر ان کی نظر گئی۔ دونوں طرف قطاروں میں کچھ فوجی افسر

اور پولیس کے افسر بیٹھے تھے۔ عورتیں کم تھیں۔ کھیل کافی دلچسپ تھا۔ اس لئے بک اپ بک اپ کی آوازیں اور تالیاں پیٹنے کی آوازیں چاروں طرف سے آتی تھیں۔ سنیٹر میں بولی ہوئی اور آن کی آن میں بال باہر سے آئی ہوئی ٹیم کے گول کے پاس پہنچ گئی۔ بے انداز شور برپا ہوا اور کارنر دیا گیا۔ اب یہ نظر آرہا تھا کہ گول ہو کر رہے گا۔ ہجوم پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ وسل ہوئی اور کارنر مارا گیا اور گول ہو ہی گیا۔ سب طرف سے شور اور تالیاں سنائی دیں۔ سامنے کرسیوں پر بیٹھی قطار میں سے اب کوئی بھی اپنی کرسی پر نہیں بیٹھا تھا۔ جب منور کا دھیان اس طرف گیا تو اس نے چرن کو کندھے سے ہلا کر کہا۔ "یار سات پتیاں اور ایک پھول یہاں بھی۔" اس نے سر کو جھٹک کر پوچھا۔ "کدھر؟"

سامنے کرسی کے ساتھ ہاتھ میں اخبار پکڑے کھڑی ہوئی عورت کی طرف اس نے اشارہ کیا۔

"نہیں۔ وہ کوئی اور ہے۔ دیکھو کل والا آدمی بھی اس کے ساتھ نہیں۔"

"واہ یار تم بھی خوب پہچانتے ہو۔ دیکھو بال اسی طرح کے ہیں۔ اور تم نیلا پھول اور سات پتیاں بھی نہیں دیکھتے؟"

اور وہ ہنستی ہنستی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور ساتھ والے کی طرف رُخ کر کے باتیں کرنے لگی تو چرن نے دیکھا ٹھیک کل والی جگہ آج ایک نیلا پھول لگا تھا۔ اس کی بھی سات پتیاں تھیں۔

"یار بڑی ٹیسٹ والی ہے۔ نیلا بلاؤز اور نیلا پھول۔"

جب میچ ختم ہوا تو اس طرف پہنچنے تک وہ موٹر رکشا پر جا چکے تھے۔ اور منور اور چرن میں اب بھی بحث ہو رہی تھی۔ شاید وہ نہ بھی ہو۔

بدھ وار دتی میں انہیں اور کوئی خاص دلچسپی اخبار کی انگیجمنٹ کے کالم میں نہ ملی تو انہوں نے ریوالی میں ایک انگریزی پکچر کے لئے شام کے شو میں سیٹیں ریزرو کرالیں۔

اب منوّر کے کہنے پر فرسٹ کلاس میں سیٹیں ریزرو کرائی گئیں کیونکہ منوّر رات کئی بار کہہ چکا تھا۔ اگر کباڑیوں کی طرح آٹھ آنے کی ٹکٹ لے کر گھاس پر نہ جا بیٹھتے تو ہاکی کا لطف جہاں لیتے وہاں سات پتّیوں کی حقیقت تو جان سکتے۔ ہالی وڈ کے اس کھیل کی بہت دھوم تھی اور ہال تماشائیوں سے بھرا تھا۔ ایک مدھم لطیف سی مہک ہال پر چھائی ہوئی تھی۔ انٹرول میں ان کی پراشتیاق نگاہیں چاروں طرف گھوم گئیں پیچھے ڈریس سرکل میں ان کی نظریں جب ایک نوجوان اور اس کے حسین ساتھی پر پڑیں تو دبے الفاظ میں دونوں کے منہ سے ساتھ ساتھ نکل گیا۔ "سات پتّیاں اور ایک پھول۔" واقعی وہی چنچل نگاہوں والی حسینہ تھی اور اس کے ساتھ والا نوجوان کوئی نیا ہی تھا۔ اس کے پاس ایک چمڑے کا بیگ تھا جس میں بہت سے کاغذ پڑے ہوئے تھے۔ یہ بیگ کی ابھری ہوئی توند سے ظاہر تھا۔ نوجوان نے بیگ کھولا اور اس حسینہ نے ہاتھ والی انگریزی میگزین اس میں پھینک دی۔ اور اس میں سے ایک باتصویر موٹی سی میگزین نکال لی۔ اس کے ہونٹوں پر جو پھیکی سی ہنسی کھیل رہی تھی وہ انٹرول میں قائم رہی۔ بالوں کے جھرمٹ میں پھول مع پتّیوں کے ڈٹا ہوا تھا۔ پھول کا پیلاپن یا تو لائٹ کی وجہ سے تھا یا پھول تھا ہی پیلا۔ لیکن اس کے سینے پر ابھرا ہوا فٹ سوئٹر اون کے زرد رنگ کو نمایاں کر رہا تھا۔

"یار۔ سوسائٹی تو بہت ہے۔" منوّر کڑواہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ "لیکن پرس بھاری ہونا چاہیئے۔"

اگلے روز تمام پارٹیوں کی طرف سے ساؤتھ افریقہ میں ہندوستانیوں پر ظلم کے خلاف ساؤتھ افریقہ ڈے منایا جا رہا تھا۔ کناٹ پلیس میں کانگریس، پرجا سوشلسٹ پارٹی۔ جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا کی طرف سے ایک مشترکہ جلسہ تھا۔ رونق کے دیوانے یہاں بھی پہنچ گئے۔ انہیں جلسہ سننے سے زیادہ مطلب نہیں تھا۔ جتنا لوگ اور سوسائٹی دیکھنے سے اس لیئے وہ اہل جلسہ کے دائرہ کے گرد گھومتے، کھڑے ہو جاتے، بھیڑ کی نگاہوں

سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ پارک میں ایک طرف انہیں دو آدمی ایک بنچ پر بیٹھے نظر آئے۔ وہ دونوں سر جھکائے منہ سے کچھ کہہ بھی رہے تھے اور کچھ لکھ بھی رہے تھے۔ چرن جب اُدھر جانے لگا۔ تو منور نے اسے بازو سے کھینچ لیا اور کہا "سی آئی ڈی کے رپورٹر ہیں۔ ادھر مت جا۔"

"اسے دماغ درست کراؤ۔ ایک عورت بھی بیٹھی ہے۔ کسی جلسہ میں دیکھا عورت رپورٹر کو؟" اور وہ بازو چھڑا بنچ کے پاس پہنچ گیا۔

بیٹھنے والوں نے اپنی نوٹ بکیں بند کر دیں اور دونوں جلسہ گاہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اوہ۔ یہ تو یہاں بھی پہنچ گئی۔"

"کون؟"

"سات پتّیاں اور ایک پھول۔"

وہ اپنے سر کو اس طرح ہلا رہی تھی جس طرح ہوا کے جھونکے نرگس کے پھولوں کو مضطرب کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بالوں میں چھوٹا سا نرگسی پھول سات پتیوں کے ساتھ براجمان تھا۔ سردی زیادہ تھی اس لئے بلاؤز کے اوپر اس نے ایک کشمیری گرم چادر اوڑھ رکھی تھی۔ آج والے اس کے ساتھی کے گال، بال اور نگاہیں خشک تھیں۔

"لٹس پُور" اس نے کہا اور یہ نرگسی وجود کے لئے چلنے کا اشارہ تھا۔ اور وہ چل پڑے۔

شکروار کے پروگرام کے متعلق چرن اور منور میں کوئی اختلاف نہیں تھا کیونکہ رات کے جلسہ میں ہی بتایا گیا تھا کہ "ساؤتھ افریقہ کے مظلوموں کی امداد کے لئے وائی ایم سی اے ہال میں ایک ورائٹی کنسرٹ ہو گا۔ انہیں یقین تھا کہ سات پتیاں مع پھول کے وہاں ضرور پہنچے گی۔ وقت مقررہ سے پہلے وہ وہاں پہنچے۔ اس بار انہوں نے کوئی

رسک نہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اور سیدھے بکنگ ونڈو پر جا کر دس دس روپے کے دو نوٹ رکھ دئیے۔ جب وہ ٹکٹ لے کر آئے تو انہیں برآمدہ میں ایک جگہ کچھ نوجوان مرد اور عورتیں کھڑے کچھ بحث میں الجھے نظر آئے۔ درمیان میں وہ کھڑی تھی۔ آج اس نے سیاہ رنگ کا دھاری دار کوٹ پہنا ہوا تھا۔ بالوں کی لٹکتی ہوئی سیاہ ناگنوں نے اپنے پھن کوٹ کی گردن میں چھپا لئے تھے۔ آج کا پھول چاکلیٹ رنگ کا بند کنول سا نظر آرہا تھا وہ دو چار بار فراڈ۔ ان ڈیموکریٹک اور بورژوا شو الفاظ وغیرہ سُن پائے تھے، کہ گھنٹی بج اُٹھی۔ آج انہیں یقین تھا کہ ہماری سیٹیں ریزرو ہیں اور اندازہ بھی ٹھیک بیٹھا اب واقفیت تو ضرور ہی ہو جائے گی۔ ہال کے اندر وہ منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔ آنے والوں کو دیکھتے رہے لیکن جن کا انہیں انتظار تھا وہ نہ آئے۔ جب پہلی آئٹم ختم ہو گئی تو منور باہر گیا۔ اب باہر کوئی نہیں تھا۔ جہاں وہ بحث کر رہے تھے وہاں بھی گیا۔ لیکن کوئی بھی نظر نہ آیا سوائے اندھیرے کے۔ جب وہ مایوس لوٹ کر اندر آیا تو اس نے کہا۔ "بیس روپے مفت میں گئے۔"

سنیچر کی شام کو یونیورسٹی ہال میں ہونے والی بحث میں دلّی کے تمام ترقی پسند لوگ پہنچے تھے۔ بحث کا موضوع ہی ایسا تھا۔ "آچاریہ ونوبا کا بھومی دان زرعی مسئلہ کا حل نہیں"۔ دونوں طرف سے بولنے والوں میں کئی ایم پی تھے۔ بحث نے بجائے علمی رہنے کے سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ کئی بار طلباء زور زور سے تالیاں پیٹتے اور قہقہے بلند ہوتے۔ چرن اور منور چونکہ دیر سے پہنچے تھے اس لئے کاری ڈور میں ہی کھڑے رہے انہیں یقین تھا کہ وہ سات پتیاں اور ایک پھول کو ڈھونڈ لیں گے۔ اور انہوں نے پُر ہجوم ہال میں اسے ڈھونڈ نکالا۔ سروں کے کالے سمندر میں خبر دار کھڑا گلاب کا پھول اپنی پنکھڑیوں سے سات پتیوں کو دبا رہا تھا۔ جب بھی مخالف بولنے والا آچاریہ ونوبا بھاوے کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ بتاتا اور انقلاب کو ہی واحد حل کہتا تو وہ

نہ صرف زور سے تالیاں بجاتی بلکہ سیٹ سے اُچھل اُچھل کر ہیر ہیر کہتی۔

آج بھی ان کی اس سے دو باتیں کرنے کی تمنا دل میں ہی رہی۔ کیونکہ وہ پھر اپنے ساتھیوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔

"یار یہ تو رائیڈر ہیگرڈ کے "شی" سے بھی زیادہ پُراسرار ہے۔" کہتے ہوئے وہ یونیورسٹی ہال سے باہر نکلے۔

اتوار کے دن کناٹ پلیس جمائیاں لیتا نظر آتا ہے۔ راجدھانی کے دل کی بے رونقی کی یہ کیفیت انہیں معلوم نہیں تھی۔ تھک کر وہ آخر انڈیا کافی ہاؤس میں آ داخل ہوئے۔ ابھی کافی ہاؤس پر جوبن نہیں آیا تھا۔ ایک دو ٹیبل ہی مشغول تھے۔ جب نیم اندھیارے سے ان کی نظریں مانوس ہو گئیں، تو انہوں نے دیکھا کہ ایک کونے کے ٹیبل پر دو آدمی اور ایک عورت بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی تو وہ تھا جو پہلے روز انہوں نے پارلیمنٹ کی وزیٹرس گیلری میں "سات پتیاں اور ایک پھول" کے پاس بیٹھے دیکھا تھا۔ اور دوسرا اس کا سنیما والے دن کا ساتھی تھا۔ جب بھی کافی ہاؤس کا دروازہ کھلتا تو وہ اس طرف دیکھتے۔ ظاہر تھا کہ وہ کسی انتظار میں ہیں۔

سات پتیاں اور ایک پھول نے آج گہرے سُرخ رنگ کا بند گلے کا فل سلیو کوٹ نما سوئٹر پہنا ہوا تھا۔ اس کے بالوں میں ایک بہت بڑا سُرخ رنگ کا گلاب کا پھول تھا جس کے گرد سات پتیاں بدستور سابق تھیں۔ آج وہ بہت زیادہ خوش اور چُست نظر آ رہی تھی۔ اپنی توجہ وہ دونوں ساتھیوں میں برابر بانٹ رہی تھی۔ ایک ساتھی نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور سگریٹ کو ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا: "کمبخت ابھی تک نہیں آئے۔" لڑکی نے بڑے اطمینان سے پیالیوں میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا: "ابھی ٹائم کافی ہے۔"

چرن اور منور کافی پر ٹوٹ پڑے آدھے گھنٹے کے بعد دروازہ کھلا اور پانچ

آدمی اندر داخل ہوئے۔

منوّر اور چرن کے لئے یہ چہرے جانے پہچانے تھے۔ پچھلے پانچ دنوں میں انہوں نے ہر ایک کو ایک نہ ایک دن "سات پتّیاں اور ایک پھول" کے ساتھ دیکھا تھا کرسیاں کھینچ کر وہ ایک ہی ٹیبل کے گرد ہوگئے۔ کافی کا ایک دور جلدی جلدی چلا۔ آنے والوں میں سے ہر ایک نے پھول والی حسینہ کو مبارکباد دی۔ عینکوں والے ایک آدمی نے کہا۔

"سو شارٹ ٹائم یو ہیو ٹیکن!"

اب جب وہ باہر نکلے تو انہوں نے اپنے اپنے تھیلے اور چمڑے کے بیگ سنبھال لئے۔ سینماؤں کا میٹنی شو شروع ہونے والا تھا۔ وہ اوڈین کے پاس کھڑے ہوگئے۔ ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ اشتہار اور چھوٹے کتابچے اپنے تھیلوں سے نکال لئے اور سُرخ پھول حسینہ نے سفید کاغذوں کا ایک رول نکالا۔ اور ہر آنے والے کے پاس پہنچنے لگی۔ ساتوں ساتھی اس کے اردگرد کھڑے ہو جاتے۔ اور مجمع آسانی سے لگ جاتا۔ منوّر اور چرن کچھ دور سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ یہ گروپ اب پلازہ کے پاس پہنچ گیا ـــــ اور اب ریگل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک آدمی سے کچھ تکرار ہوگئی۔ عینکوں والا آگے بڑھ کر کہہ رہا تھا۔

"کیا آپ امن نہیں چاہتے؟ تو آپ جنگ باز ہیں۔"

اب منوّر اور چرن کے لئے موقع تھا۔ وہ ان کے قریب پہنچ گئے۔

جھگڑے والا معاملہ تو رفع دفع ہوگیا۔ اب کاغذ کا شیٹ ہاتھ میں لئے وہ چرن کے قریب پہنچ گئی "آپ دستخط کردیں۔ عالمی امن کی اپیل ہے۔ یہ امن کی ناخت ہے۔" چرن گھبرا گیا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور وہ منوّر کو ڈھونڈنے لگا۔ عینک والا آگے بڑھا اور گلا صاف کر کے کہنے لگا۔

"گھبرائیے نہیں، دستخط کر دیں۔ یہ بے ضرر چیز ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کی بات نہیں۔"

چرن نے منور کو ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ "پھول اور پتیوں والی حسینہ کی پچھلی طرف کھڑا تھا اور بغور اس کے بالوں کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اب وہ چرن کی مدد کو آیا۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف کھینچ لیا اور جمگھٹے کی طرف رُخ کر کے زور سے کہا "خود تو بدامنی پیدا کرتی ہے اور لوگوں کو امن کا درس دیتی ہے۔"

وہ چرن کو ایک طرف کھینچ لے گیا۔ چرن نے پوچھا "جب تم نے اتنا غصّہ ظاہر کیا ہے تو اس کے قریب اتنی دیر کیوں کھڑے رہے؟"

منوّر نے آہستہ آہستہ لفظوں کو چبا چبا کر جواب دیا "میں پھول دیکھ رہا تھا کہ اتنا بڑا اور سُرخ کیونکر ہے؟" پھر ذرا رُک کر اور ہونٹ دبا کر بولا "پھول بناوٹی ہے اور خوشبو کا نام نہیں۔"

پرمتھ ناتھ وشی

انوکھا مکالمہ

(شری رام چندر اور رشی جاوالی کے درمیان)

جاوالی: رام چندر! بھرت، وششٹ وغیرہ چلے گئے اب میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

رام چندر: بولئے رشی مہاراج!

جاوالی: رام چندر! تم پورے گدھے ہو۔

رام چندر: پورے کیا پربھو؟

جاوالی: پورے گدھے۔

رام چندر: گدھا کیوں؟ رشی مہاراج! اس قسم کی بات تو کسی نے کبھی نہیں کہی۔

جاوالی: اسی لئے تو تم مرے۔

رام چندر: آپ نے مجھے اس حیران کرنے والے خطاب کا اہل کیوں سمجھا پربھو؟

جاوالی: میں تمہیں لازمی ہی گدھا کہوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ گدھا بے سود ہی بوجھ ڈھوتا ہے گدھا بے سمجھ ہے۔ گدھا اپنی آتما کی رکشا نہیں کر سکتا۔ گدھا دوسرے کے حکم پر چلتا ہے۔

رام چندر: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ سب وصف میرے کردار میں موجود ہیں؟

جاوالی: کیا تم خود یہ محسوس نہیں کرتے؟

رام چندر: میں ایک عام آدمی ہوں لیکن اتنا ہیچ ہرگز نہیں ہوں۔

جاوالی: اچھا تو اس پر بحث کی جائے۔ تم بن میں کیوں جا رہے ہو؟

رام چندر: آپ تو خوب جانتے ہیں مہاراج۔ پتا کے حکم کی تعمیل اور سچائی کی رکشا کرنے کے لئے۔

جاوالی: پتا کے حکم کی! اچھی بات ہے۔ اب اس بات پر وچار کیا جائے۔ کہ پتا کون ہے۔ اور سچائی کیا ہے؟

رام چندر: پتا جنم داتا ہے۔

جاوالی: اور سچائی؟

رام چندر: کسی چیز یا صورت حال کی داخلی یا حقیقی شکل۔

جاوالی: ہر جاندار کا کوئی نہ کوئی جنم داتا ہوتا ہے۔ یہ تو ایک قدرتی اصول ہے لیکن جنم داتا اور جنم پانے والے کے درمیان تم جس تعلق کا تصور کر رہے ہو وہ صرف ایک بھرم ہے۔

رام چندر: سنسار میں اٹل سچائی ہے ہی کتنی؟ زیادہ تو تصور ہی ہے۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی ہے اور صرف ایک چوتھائی حصہ ٹھوس زمین۔ یہی تناسب اٹل سچائی اور تصور کا ہے۔

جاوالی: لیکن تم اس بات کو کیوں بھول جاتے ہو کہ وہ ایک چوتھائی حصہ ہی آدمی کے رہنے کا ٹھکانہ ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کا مطلب ہی سمندر کے پیٹ سے دنیا کا پیدا ہونا ہے۔

رام چندر: اس لئے سمندر کو صرف مایا تو نہیں کہا جا سکتا۔

جاوالی: مایا کون کہتا ہے میں تو صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ اس مایا کا حقیقی پن صرف رہنے کے

قابل دھرتی کو دان کرنے میں ہی ہے۔ ناممکن سے ممکن اور تصور سے حقیقت کا جنم ہوتا ہے۔ تم اسی حقیقت کو ماننے سے انکار کرتے ہو۔

رام چندر: کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں تصور اور خیال کو نہ مانوں؟

جاوالی: میں چاہتا ہوں کہ تم حقیقت کی اتنی قدر کرو جس کی وہ مستحق ہے:

رام چندر: یعنی؟

جاوالی: مطلب یہ کہ اگر جنم داتا کو پتا ماننے ہو تو مانو لیکن ان کے لئے احترام اور عقیدت کا مظاہرہ کرنے کے لئے گھر چھوڑ کر بن جانا ضروری نہیں۔

رام چندر: لیکن سچائی کی رکشا؟

جاوالی: گدھا اور کسے کہتے ہیں؟ جو ہے ہی نہیں اس کی رکشا کیسے کرو گے؟

رام چندر: سچائی نہیں ہے؟ سچائی کے پرستاروں نے تو کہا ہے کہ سچائی ہی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔

جاوالی: اچھا! کیا سچائی کے پرستار یہ نہیں کہتے کہ دنیا دائمی نہیں؟

رام چندر: کہتے تو ہیں۔

جاوالی: دنیا اگر ہمیشہ نہ رہنے والی اور تغیر پیشہ ہو تو تمہاری سچائی بھی تبدیل ہونے والی چیز ہوئی۔ اس چیز کو تم سچائی کیسے کہہ سکتے ہو؟

رام چندر: دنیا اگرچہ تغیر پیشہ ہے لیکن سچائی اس سے الگ ہے۔

جاوالی: مطلب یہ کہ تمہاری سچائی تبدیلی سے دور ہے۔

رام چندر: یہ بات ویدوں کے مطابق ہے۔ دنیا ایک پھول اور سچائی اس کی جڑ۔

جاوالی: خوب! کلی پھول بنتی ہے۔ پھول پھل میں تبدیل ہوتا اور پھل مرجھا کر گر پڑتا ہے۔ اس تسلسل کو ہی تبدیلی کہتے ہیں۔ تبدیلی اور کیا ہے؟

رام چندر: آپ نے ٹھیک کہا ہے۔

جا والی : لیکن جناب کوئی ایسی جڑ تو دکھاؤ جو بہت پرانی ہو، نئی نظر آتی اور تبدیلی سے دور ہو۔

رام چندر : کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سچائی بھی تبدیلی کے اصول کی پابند ہے؟

جا والی : اس کا انحصار تمہارے سچائی کے تصور پر ہے لیکن اگر سچائی کو اس دنیا میں رہنا ہے تو اسے اس دنیا کے اصول ماننے ہی پڑیں گے۔

رام چندر : مان لیجئے کہ سچائی دنیا سے الگ ہو۔

جا والی : تب اس سچائی کا نہ کوئی مطلب ہے نہ کوئی ثبوت۔

رام چندر : اور اگر سچائی دنیا کے اصولوں کی پابند ہو؟

جا والی : تب سچائی کی تشریح میں تبدیلی ضرور ہوگی۔ دنیا تغیر پیشہ ہے اور سچائی بھی تغیر پیشہ ہے جیسے جسم کے ساتھ سایہ۔

رام چندر : مہربانی سے اس کی وضاحت کر دیجئے۔

جا والی : مثال کے طور پر تمہارے پتا نے تمہاری سوتیلی ماں سے ایک وقت دو مطالبے پورا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس دن اس وقت وہ سچ تھا لیکن اس کے بعد جو وقت گذرا اس میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ آج تم کس بھوت کی بیگار کاٹنے کے لئے بن میں جا رہے ہو؟

رام چندر : رشی مہاراج! آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی بات مان کر اجودھیا واپس چلا جاؤں گا تو یہ آپ کی غلطی ہے۔

جا والی : میں نے گدھا کس لئے کہا؟

رام چندر : پتا کی حکم عدولی کر کے میں نرک کا مستحق بن جاؤں گا۔

جا والی : ہاں۔ اگر پرلوک ہوا تو...

رام چندر : پرلوک نہیں ہے؟ تب لوگ یگیہ، دان، تپسیا وغیرہ کیوں کرتے ہیں؟

جاوالی : لوگ اندھیرے میں رسّی کو دیکھ کر چلا کیوں اٹھتے ہیں ؟

رام چندر : اس خوف کی تہ میں سانپ کا وہم موجود ہوتا ہے۔

جاوالی : یہاں بھی سب کھیل تصور کا ہے۔

رام چندر : یہ کیا ؟

جاوالی : اپنی فطرت پر بے سود پابندیاں لگانے کی تمنّا۔

رام چندر : مہربانی سے کچھ اور وضاحت کر دیجئے۔

جاوالی : ایک دم گدھے ہو ! اچھا سنو۔ جو اس دنیا میں پیٹ بھر کھانا حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ باپ کا شرادھ کرنے پر اسے پرلوک میں پیٹ بھر کھانا مل جائے گا جو اس دنیا میں عیش و عشرت نہیں کر سکتا وہ یہ سوچتا ہے کہ یہاں برہم چریہ کا پالن کر کے وہاں اروشی، رمبھا اور دوسری اپسراؤں کے ساتھ عیش کر سکے گا۔ اسی طرح وہم کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

رام چندر : اس وہم کا باعث ہے بے وجہ اپنی فطرت پر پابندیاں لگانے کا خیال ؟

جاوالی : اس کے ماسوا اور کچھ نہیں۔ انسانی جسم کے اعضا زندگی کو ٹھوس حقیقت سے آشنا کرنے کا قیمتی ذریعہ ہیں لیکن آدمی اتنا بے وقوف ہے کہ ان کا استعمال کرنا نہیں چاہتا۔ آخر موت کے وقت وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے قابل قدر اعضا میں زنگ لگ گیا ہے۔

رام چندر : تب زندگی کا مقصد کیا ہے ؟

جاوالی : یہ بحث اور کسی دن ہوگی ابھی اتنا ہی سمجھ لو کہ اگر زندگی کا کوئی مقصد ہے تو وہ زندگی کے اندر ہی پنہاں ہے۔ کسی خیالی پرلوک کی ٹہنی پر وہ نہیں لٹک رہا۔

رام چندر : تب دان، دھیان، یگیہ وغیرہ سب بے سود ہیں ؟

جاوالی : ان میں ایک طرح کی دنیاوی بھلائی ہو سکتی ہے۔

رام چندر: کیسے؟

جاوالی: یہ سب دولت میں حصہ داری کے طریقے ہیں۔ مثال کے طور پر تمہارے شہر کے گوالے کافی مقدار میں گھی پیدا کرتے ہیں اور تمہارے پاس کافی دولت ہے۔ تم نے یگیہ کے موقعے پر وہ گھی خرید لیا۔ گوالوں کو دام مل گئے۔ برہمنوں کو یگیہ کے بہانے کچھ گھی مل گیا اور تمہیں بھی اس کے مطابق شانتی مل گئی۔ گھی، دودھ، دہی، برتن، کپڑے وغیرہ دان کے طریقے تقریباً تمام شاستروں میں موجود ہیں۔ یہ سب دولت کی تقسیم کے طریقے ہیں۔ اب اگر تم کافی مقدار میں گھی نہیں خریدو گے، تو گوالے اسے پیدا نہیں کریں گے۔ گھی کی پیداوار بند ہو جانے سے گوؤں کا احترام باقی نہیں رہے گا۔ گوؤں کا احترام نہ ہونے سے کاشتکاری کا زوال شروع ہو جائے گا کیونکہ ہمارا سماج بنیادی طور پر کاشتکار سماج ہے اس لئے گائے اور دودھ گھی وغیرہ کو شاستروں کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ اب سمجھے بات کو؟ یگیہ کے ساتھ پرلوک (دوسری دنیا) کا تعلق صرف خیالی ہے۔ اس میں جو حقیقت اصل اور نظر آنے والی ہے وہ صرف تاریخی ارتقا ہے۔

رام چندر: آپ کی بات میں کچھ نیا پن تو ضرور ہے۔ آپ کے مطابق نہ پتا ہے، نہ سچائی، نہ پرلوک، تب ہے کیا؟

جاوالی: تم ہو، میں ہوں، جو سامنے ہے وہ حقیقی ہے اور جسے چھوا جا سکتا ہے، وہی سچ ہے۔

رام چندر: میں نے ابھی ابھی پتا کا شرادھ کیا ہے کیا وہ بے سود ہے؟

جاوالی: بالکل! مری ہوئی گائے بھی کبھی گھاس کھاتی ہے؟

رام چندر: شاستر؟

جاوالی: چالاک برہمنوں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے انہیں تیار کیا تھا۔

رام چندر: وید؟

جاوالی: سوم رس پینے والوں کی بیکار قسم کی باتیں ہیں۔

رام چندر: ایشور؟

جاوالی: اب ہنسی آرہی ہے۔ شاستر، سچائی، وید، پرلوک، دان، دھیان، تپسیا، یگیہ وغیرہ پر ایشور کے وجود کا انحصار ہے۔ اگر بنیاد ہی جھوٹ ہے تو اس پر کھڑی ہوئی عمارت کا وجود کس طرح ممکن ہے۔

رام چندر: آپ ویدوں کے دشمن اور ناستک ہیں۔

جاوالی: ہو سکتا ہے۔ لیکن تم گدھے ہو۔ نہیں تو مرے ہوئے پتا کو انگوٹھا دکھا کر، سوتیلی ماں کو تیاگ کر اور بھرت کو جیل میں ڈال کر بے فکر ہو کر راج گدی پر بیٹھتے۔

رام چندر: اس قسم کی پاپ سے بھری ہوئی باتیں سننا بھی پاپ ہے۔

جاوالی: پاپ پُن کی تعریف کیا ہے؟ پُن کیا ہے بھلا بتاؤ تو۔

رام چندر: جو دھرم کے مطابق ہے وہ پُن ہے۔

جاوالی: جب وید نہیں ہے تو دھرم کیسے ہوا؟

رام چندر: اچھا! جو اصول کے مطابق ہے وہ پُن ہے۔

جاوالی: ایک کا اصول دوسرے کے اصول سے الگ ہو سکتا ہے۔ دیکھو نہ تمہارا اصول کہتا ہے کہ بن جا کر سوکھ سوکھ کر مرنا ہی اچھا ہے۔ لیکن میرا اصول کہتا ہے کہ بوڑھے کھوسٹ دسرتھ نے نفسانی خواہش کا غلام بن کر بیوی کو جو وچن دیئے تھے وہ ایک دم جذباتی پن ہیں۔ اب کس کے اصول کا کہنا مانو گے؟

رام چندر: دنیا کے سلسلے میں آپ کے خیالات کیا ہیں؟ اس کی وضاحت کیجئے۔

جاوالی: اچھا سنو۔ دنیا کے اندر جو کچھ دوامی اور مستقل رہ سکتا ہے عموماً اسی کو تم لوگ سچائی مان لیتے ہو۔ یہ خیال ان نیم خوابیدہ لوگوں کا قائم کیا ہوا ہے جو یہ فرض

کر چکے تھے کہ دنیا کی تخلیق دائمی طور پر غیر متغیر شکل میں ہوئی ہے۔ اگر کار گاہِ حیات واقعی مستقل ہو تو اس میں دائمی اور مستقل ارتقار ناممکن نہیں لیکن جب یہ دنیا خود ہی لمحہ بہ لمحہ مائلِ تغیر ہے اور اضافی نوعیت رکھتی ہے تو اس میں استقلال کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے؟ جب چشمہ ہی متحرک ہو گا تو اس پر بہنے والا تنکا بھی لازمی طور پر متحرک رہے گا۔

رام چندر: لیکن چشمے کے متحرک ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ندی بھی متحرک ہو۔ اسوقت ایک چلو آبِ رواں کی تیزی میں غائب ہوتا نظر آتا ہے لیکن ندی تو اس کے پیچھے پیچھے نہیں بھاگتی۔ آج ندی جس جگہ پر ہے برسوں بعد بھی وہ وہیں رہے گی کیا مہاراج اکشواکو کے وقت سرجو ندی کہیں اور تھی؟

جاوالی: یہ درست ہے کہ ندی کہیں اور نہیں گئی۔ لیکن اس کے وقوع نسبتی میں تبدیلی ضرور واقع ہو گئی ہے۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ایک چلتے ہوئے شخص کے جسم کا تل اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتا۔ مگر جب جسم جگہ تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی جگہ بھی خود بخود بدل جاتی ہے۔

رام چندر: آپ کیا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تغیر ہی قانونِ کائنات ہے؟

جاوالی: یہ کہنا تو کم ہو گا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ دنیا نام ہے ایک بے بنیاد تیوہار کا، ایک بے مقصد تغیر کا۔ اب اس قسم کی جگہ میں سچائی نام کی اگر کوئی چیز ہے تو وہ بھی تبدیل ہونے پر مجبور ہے۔ صرف یہی نہیں۔ جس طرح دنیا تغیر پذیر ہے ویسے ہی سچائی بھی بدلتی رہتی ہے اور جس طرح دنیا ہر لمحہ ترقی پذیر ہو کر اظہار تکمیل کی طرف بڑھتی ہے ویسے ہی سچائی بھی درجہ بدرجہ ترقی کر کے تکمیل کو پہنچنا چاہتی ہے اب اس قسم کی موصوف سچائی کو دائمی کہا جا سکتا ہے یا نہیں یہ تمہارے خیال پر منحصر ہے۔

رام چندر: آپ نے جو کہا وہ درست ہے میری سچائی ازلی اور ابدی ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں، نقص نہیں، وہ تبدیلی کی جویا نہیں۔ اور اپنے آپ میں مکمل ہے۔

جاوالی: ازلی اور ابدی کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

رام چندر: لیکن آپ نے ابھی ابھی اس کے وجود کا اقرار کیا تھا۔

جاوالی: کیسے؟

رام چندر: آپ نے فرمایا کہ دنیا کا خاصہ روانی ہے اور اس کا تیوہار بے مقصد ہے۔ ٹھیک۔ اب اگر دنیا کی روانی کا کوئی مقصد یعنی کوئی منزل نہیں تو اس کی روانی کا بھی کوئی اختتام نہیں ہو سکتا۔ یہیں تو اصول ابدیت کارفرما ہوتا ہے اور ابدیت کو قبول کرنے کے بعد ازلیت کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر ازلیت اور ابدیت کے اقرار سے بچنے کی خاطر آپ یہ مان لیں کہ کار جہاں با مقصد ہے تو حقیقتِ حال کی کیا شکل بنتی ہے؟ جس چیز کا کوئی مقصد ہے وہ محدود بھی ہوگی اور جو محدود ہے اس کا مکمل ہونا لازمی ہے۔ کار جہاں کو اگر بے مقصد مانتے ہیں تو اس کے ساتھ ازلیت اور ابدیت کا اصول آ جاتا ہے اور ساتھ ہی سچائی بھی۔ اور اگر اسے با مقصد مانتے ہیں تو اصول تکمیل آ جاتا ہے اور اس کے ہمراہ سچائی۔ مختصر یہ کہ آپ کوئی بھی راستہ اختیار کریں کسی نہ کسی وقت سچائی کا سامنا ہوگا ہی۔ دنیا کے اندر جو چیز سب سے زیادہ یقینی ہے آپ اس سے بچ کیسے سکیں گے؟

جاوالی: گدھے۔ میرا سچائی سے پالا پڑے نہ پڑے لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جنگل میں تم ضرور کسی راکشش کے پیچھے پڑو گے۔ دنیا میں یقینی کیا ہے یہ تو میں نہیں جانتا مگر جنگل میں سب سے یقینی چیز درندے اور راکشش ہیں۔ کسی روز کوئی بھوکا باگھ تمہیں مار کھائے گا۔ اور کسی روز کوئی چالاک راکشش سیتا کو اغوا کرے گا تب نوجوان عورت کو چھوڑنے والا لکشمن جو ادھر بیٹھا ہے مجھے کوس

بھیا کہاں؟ بھابی کہاں؟" کہتا ہوا روتا چلّاتا گھومے گا۔ یہی ہوگا۔ یہی ہوگا تمہاری تیجانی کی حفاظت کا انجام!

رام چندر: اگر ایسا ہی ہو تو بھی تاریخ میں میرا نام روشن ہوگا۔

جاوالی: بیوقوف کسے کہتے ہیں؟ چند سوکھے بھوج پتروں پر سیاہی سے اپنا نام کھولنے کی امید میں ناحق جنگلوں کی خاک چھاننے جا رہا ہے!

رام چندر: یہ امید ناحق کیوں ہے؟

جاوالی: یہ تمہیں کیونکر معلوم ہوا کہ تاریخ کے اوراق میں تمہیں جگہ ضرور ملے گی؟

رام چندر: تاریخ میں میرا نام نہیں آئے گا۔ اس قسم کا خوف دماغ میں لانے کے لئے بھی تو کوئی وجہ نہیں۔

جاوالی: ترقی پذیر دنیا کی تاریخ بھی ترقی پذیر طریقے سے ہی لکھی جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ ترقی پذیر طریقہ تمہارے موافق نہ ہو۔

رام چندر: تاریخ لکھنے میں یہ ترقی پذیر طریقہ کون سا ہے؟

جاوالی: معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تمام باتیں شروع سے ہی سمجھانی پڑیں گی۔ بچپن میں سکول نہیں دیکھا کیا؟ کیا اسکول کا وقت گلی ڈنڈے میں گنوایا تھا؟ غور سے سنو۔ یہ ایک نہایت گہری بات ہے۔ سرجو ندی کی مثال لے کر ہی تجزیہ کیا جائے۔ سرجو ندی کے منبع کا رُخ جنوب کو ہے لیکن ندی کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے موڑ ہیں جن کا رُخ دوسری طرف ہو جاتا ہے لیکن ان کے الٹے رُخ کی وجہ سے کیا ندی کا رُخ بدل جاتا ہے؟ یا موڑ ہی دائمی بن جاتے ہیں؟ ندی جس طرح چل رہی تھی ویسے ہی چل رہی ہے موڑ لمحے بھر کے لئے ترقی کی مخالفت کر کے بلبلے کی طرح غائب ہو جاتے ہیں۔ یہی بات ہے نا۔ تاریخ میں بھی تم کئی ایسے کارنامے دیکھ سکتے ہو جو ترقی کے مخالف تھے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ جو شخص تاریخ

لکھنے بیٹھے گا یعنی اصلی رَو کا ذکر کرنا چاہے گا اس کا فرض کیا ہوگا؟ تاریخ نویسی کا حقیقی راز تو یہی ہے کہ ترقی کے مخالف عناصر کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دے۔ جو شخص یہ کام بخوبی کر سکے گا۔ وہی اعلیٰ تاریخ نویس کہلائے گا۔

رام چندر: براہ کرم دو چار ترقی مخالف واقعات کی مثالیں دیجیے جن کو تاریخ میں کوئی جگہ نہیں ملے گی۔

جاوالی: ٹھیک ہے تم ہی سے شروع کیا جائے۔ تمہارا یہ کارنامہ جسے تم قابلِ فخر بات سمجھتے ہو تاریخ سے الگ کر دیا جائے گا۔ لیکن تمہاری آئندہ زندگی کی کچھ باتیں ضرور قلمبند کر دی جائیں گی۔

رام چندر: وہ کون سی باتیں ہیں؟

جاوالی: بالی کو مارنا، شمبھوک کو مارنا، سیتا کی اگنی پریکشا وغیرہ۔ یہ واقعات تمہاری زندگی میں ابھی نہیں ہوئے لیکن جلد ہی ظہور پذیر ہوں گے۔ اس کے علاوہ دواپر یگ میں یدھشٹر کی مذہب پرستی رجعت پسندانہ کام ہوگا۔ اس کے قائم رہنے کا بھی کوئی امکان نہیں لیکن ان کی ہاتھی والی کہانی تاریخ کے اوراق پر روشن رہے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں اور رد کیجیو کل یگ میں بدھ کا عدم تشدد خلاف تاریخ ہوگا۔ اس کو پانی میں کھینچی گئی لکیر ہی سمجھو۔ اس دور میں شہرت حاصل ہوگی بدھ کے بھائی دیودت کو جو بدھ کو قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔

رام چندر: فرض کیجیے آپ جس رَو کی بات کر رہے ہیں اس میں کوئی تبدیلی آ جاتی ہے، تو پھر تاریخی کتب میں بھی تبدیلی کرنی پڑے گی۔

جاوالی: میں نے جس رو کی بات کی ہے اس میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں لیکن اگر ایسا ہو تو واقعی تاریخ کی کتابوں میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ حسنِ انتخاب اسی کا نام ہے۔

رام چندر: کیا میں جان سکتا ہوں کہ آپ کی مفروضہ رو میں تبدیلی کیوں ممکن نہیں ؟

جاوالی: وہ سائنس کا ایک لازمی قانون ہے۔

رام چندر: تو بھی خوب ہے کہ اس روز روز تبدیل ہونے والی دنیا میں کچھ تو غیر مبدل ہے۔

جاوالی: میں نے غیر مبدل نہیں کہا لازمی کہا ہے۔

رام چندر: ایک ہی بات ہوئی۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے؟

جاوالی: کیا کہتے ہو بیٹے؟ نام ہی تو سب کچھ ہے۔ نام ہی کے لئے بہت سے انسان گدھے ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سے گدھے انسان۔

رام چندر: کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا پرست اور دہریئے میں محض نام کا ہی فرق ہے اصلی فرق کوئی نہیں؟

جاوالی: بالکل نہیں۔

رام چندر: شاید اسی لئے آپ نے میرے پتا جی کو وید، شاستر اور خدا پرستی کے مطابق اپدیش دیا تھا۔ اور نام بدل کر اب مجھے غیر شاسترانہ قابل نفریں اپدیش دے رہے ہیں —— دھوکا ہے!

جاوالی: رام! تم نے غلط سمجھا۔ میں نہ خدا پرست ہوں نہ دہریہ۔ نہ وید کو مانتا ہوں، نہ اس کا مخالف ہوں۔ نہ میں پاکھنڈی نہ مذہب پرست۔ شاستروں سے بھی نہ مجھے محبت ہے نہ نفرت!

رام چندر: تو پھر آپ کیا ہیں؟

جاوالی: میں آسانی پرست ہوں۔ وقت دیکھ کر میں خدا پرست اور دہریہ بن جاتا ہوں۔

رام چندر: اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک آپ نے جو غیر معزز باتیں کیں وہ سب جھوٹ تھیں۔

جاوالی: جھوٹ کو قبول کرنے پر سچائی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ ایک کا دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

رام چندر: تب کیا آپ سچ جھوٹ کسی کو قبول نہیں کرتے؟

جاوالی: میں نے ابھی بتایا ناکہ میں آسانی پرست ہوں۔ آسانی ہو تو کچھ بھی قبول نہیں کرتا۔

رام چندر: وہ کون سا فلسفہ ہے؟

جاوالی: وہ ہے فلسفہ خودی جو تمام فلسفوں سے برتر ہے۔

رام چندر: تب تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ روح اور خدا کو مانتے ہیں۔

جاوالی: اسی میں آسانی ہو تو مان لیتا ہوں۔

رام چندر: انا الحق پر بھی یقین رکھتے ہیں؟

جاوالی: ضرور یقین رکھتا ہوں۔ لیکن میرے 'وہ' اور آپ کے 'وہ' میں فرق ہے۔

رام چندر: 'وہ' بھی کیا دو ہوتے ہیں؟

جاوالی: میری نگاہ میں ایک ہی ہیں۔

رام چندر: کیا وہ 'پربرہم' ہے؟

جاوالی: میرے خیال میں عین وہی ہے۔

رام چندر: اس کے متعلق کچھ اور کہیے۔

جاوالی: وہ پاس بھی ہے اور دور بھی ہے۔ وہ ازلی بھی ہے اور ابدی بھی۔ وہ ایٹم سے حقیر تر اور عظیم سے عظیم تر ہے۔ اسی کے خوف سے سورج، چاند، روح، مادہ، انسان، قدرت، حتیٰ کہ موت بھی قانون میں بندھی ہوئی ہے۔

رام چندر: یہی تو وہ پربرہم ہے جس کا ذکر ویدوں میں ہے۔

جاوالی: تب یہی مان کر خوش ہو لو۔

رام چندر: مہاراج! آپ ایک بار صاف صاف کہیے کہ آپ کون ہیں؟

جاوالی: امیر آدمیوں کے محلوں پر دھات کی بنی کبوتر کی مورتی دیکھی ہے؟

رام چندر : جی ہاں ۔

جاوالی : میں محل پر بنی وہی کپوت کی مورتی ہوں جو مصوّر کی فن کاری کے باعث جاندار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں بے جان ہے ۔ میں بے جان ہونے کے باوجود غیر متحرک نہیں ہوں ۔ میرے پھیلے ہوئے پر آسانی پرستی کی نرم ہوائی لہریں پکڑ لیتے ہیں ۔ یہ قانون یقینی اور غیر مبدل ہے ۔ میں کبھی شمال رو ، کبھی جنوب رو کبھی مغرب رو ہو جاتا ہوں ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔ میں دراصل خود رو ہوں ۔ اس وقت میں جس آواز سے بولتا ہوں ، اگلے ہی لمحے اسے بدل کر دوسری آواز اپنا لینے میں مجھے ذرہ برابر اعتراض نہیں ہوتا ۔ بلکہ یہی میری فطرت ہے ۔ کیونکہ میرا مذہب آسانی پرستی ہے ۔ اسی لئے میرا ملک نہیں ، مذہب نہیں ، دوست نہیں ، شاستر نہیں ۔ پالیسی نہیں ادراک نہیں ۔ حتیٰ کہ میرے پاؤں تلے جو زمین ہے وہ بھی صاف نہیں ۔

رام چندر : تب آپ کھڑے کس چیز پر ہیں ؟

جاوالی : اپنے سر پر ۔ اسی لئے تو مجھے تمام دنیا اُلٹی معلوم ہوتی ہے ۔

رام چندر : آپ کی یہ حالت کب تک رہے گی ؟ دوسروں کی بات تو چھوڑیئے ۔ خود آپ کو بھی تو اس میں تکلیف ہوگی ۔

جاوالی : آسانی پرستی کی ہوا کے پہلے جھونکے میں ہی سب کچھ بدل دوں گا ۔ کیونکہ تبدیلی ہی زندگی کی خاصیت ہے ۔

رام چندر : اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب جیسا موقعہ دیکھا ویسا ہی رُخ اختیار کر لیا ۔

جاوالی : اس کے سوا اور ہے ہی کیا ؟ اسی لئے تخت پر بیٹھے دشرتھ کو ایک قسم کا اپدیش دیا اور لنگوٹی پہنے اس کے بیٹے کو دوسری قسم کا ۔ ہم حالات کی پرستش کرتے ہیں ۔ اجسام کی نہیں ۔ تم کو بن جاتے دیکھ کر اور اپنا سمجھ کر ہی تمہیں حالات کے مطابق

اُپدیش دیا تھا۔ لیکن تمہاری باتیں سُن کر تمہاری انسانیت کو بھانپ لیا! اسی لئے اب انسان کے قابل اپدیش دے رہا ہوں۔

رام چندر: آپ نے تو ہر طرح مجھے جان لیا۔ لیکن آپ کو کس شکل میں سمجھوں۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

جاوالی: ابھی تمہیں بتایا نا کہ میں دھات کا کپوت ہوں۔ اگر اور بھی سننا چاہتے ہو تو سنو میں اس دور کا ترشنکو ہوں۔ بہشت اور دارِ فانی کے درمیان جو خلا ہے۔ میں اس میں ایک سوالیہ نشان کی طرح لٹک رہا ہوں۔ پیاسی زبان کی طرح میں خود بے چین ہوں۔

رام چندر: اس قسم کے ترشنکو سے تو ایک معصوم گدھے کی حالت بدرجہا بہتر ہے۔

جاوالی: یقیناً۔ اور جب گدھے کو اس بات کا احساس نہیں کہ وہ انسانی جسم میں دیوتا ہے۔ رام! شریف آدمی! حسد کی وجہ سے ہی تمہیں گدھا کہا تھا۔ تمہیں بُرا کہنے کی میری کبھی منشا نہیں تھی۔

رام چندر: تو پھر آشیرباد دیجئے کہ میں اپنی شخصیت کے لامحدود دائرے میں زندگی بھر گدھے کی مانند گھومتا ہوا مروں۔

جاوالی: اس سے بھی بڑا آشیرباد دیتا ہوں کہ تم اپنی بھوک کی خوراک، اپنی پیاس کا پانی بھی اپنی شخصیت کے لامحدود دائرے میں ہی حاصل کر سکو۔ میری طرح تمہیں خلا میں خاموش نہ رہنا پڑے۔ میں اپنے دل، زبان اور عمل سے تمہیں یہی آشیرباد دیتا ہوں۔

شمس صدیقی (جمشید پور)

پھیلے ہوئے ہاتھ

فٹ پاتھ پر کھڑے ہی کھڑے اس نے گلی کا ایک جائزہ لیا۔ محمڈن لین کالے سانپ کی طرح لہراتی ہوئی گوشت کی دکان تک جاکر ختم ہوگئی تھی۔ اتنی بڑی لین میں اس کو آج ایک ٹکڑا روٹی کا نہ مل سکا تھا۔ محمڈن لین میں اگرچہ مزدور طبقہ کے لوگ رہتے تھے مگر پھر بھی اس کو اتنا ضرور مل جاتا تھا کہ وہ اس سے اپنا اور اپنے دوست کالو کا پیٹ بھر سکے۔ اور بعض اوقات تو وہ کچھ بیچ بھی دیا کرتا تھا جس سے اس کی دوسری ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

اس وقت رات کے قریب دس بج رہے تھے اور محمڈن لین کے چھپر پوش مکانوں کے پیچھے والی گلی بالکل تاریک تھی۔ اور بالکل قبرستان کی طرح سنسان ــــ وہ پریشان سا سوچ رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے کہ آج اس کو کچھ مل نہیں رہا ہے ــ وہ اسی سوچ میں غوطہ زن تھا کہ اچانک اس کی پیٹ کی گہرائیوں میں بھوک کی جلن نے کروٹ لے کر اس کی انتڑیوں کو دبا دیا اور وہ تلملا کر چیخ اٹھا ــــ "بابا ایک ٹکڑا روٹی"

اس کی آواز فضا کے دوش پر لہراتی ہوئی لین کے دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔ اور بڑبڑاتے ہوئے اس کے قریب ہی کے دروازے نے اپنا منہ کھولا۔۔۔ وہ چونک کر دروازے کے قریب ہوگیا اور اس کے ہاتھ پھیل گئے۔ دروازے نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر ایک ٹکڑا روٹی کا اُگلتے ہوئے نسوانی آواز میں کہا: "کہاں مرگیا تھا آج۔۔۔ حرامی نہیں تو۔۔۔ دس بجے آیا ہے۔۔۔ سب تو اس لڑکی کو دے دیا۔ آدھی رات کو آکر چلاتا ہے۔" اور دروازے کے کھلے ہوئے ہونٹ بڑبڑاکر پیوست ہوگئے۔

"سب اس لڑکی کو دے دیا۔" بے اختیار اس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے بہت زور سے اس کے پیٹ میں گھونسہ مار دیا ہو۔ اور وہ صرف تلملا کر رہ گیا۔۔۔ ساری کائنات سے الگ ہٹ کر وہ صرف اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کبھی اس کی مٹھیاں بندھ جاتیں تو کبھی وہ اپنا گلا آپ ہی دبانے لگ جاتا۔ کافی دیر تک اس کے پنجے سکڑتے اور پھیلتے رہے۔۔۔ قریب ہی لین سے ملی ہوئی سٹریٹ ماُل روڈ پر دو کتے گوشت کی دکان سے لائی ہوئی ہڈی کے بٹوارے پر جھگڑنے لگے۔۔۔ اور وہ چونک کر پھر اپنی کائنات میں آگیا۔ اس کے پیر بسنت ٹاکیز کی طرف بڑھنے لگے۔

بسنت ٹاکیز کے پیچھے ایک چھوٹے سے میدان کے ایک کونے میں ٹاٹا کمپنی کے مکانوں کی دیوار سے لگا ہوا ایک چیتھڑوں کا کھنڈر اس کی کل کائنات تھی۔ اور وہی اس کا شبستان تھا۔

جاڑا اور گرمی تو وہ وہیں گذار دیتا تھا مگر برسات کے موسم میں اکثر وہ سحر تہ دفنت خوب جی بھر کر گالیاں دیتا۔۔۔ نہ جانے کس کو۔ بہت سے خوش پوش بابو

اس کی گالیاں سُن کر نفرت سے مُنہ پھیر لیتے تھے۔ اور محض اس کو دیوانہ کہہ کر اپنے دل کو خوش کر لیتے تھے۔ مگر قریب ہی کا پان والا بہت حسّاس تھا۔ وہ اس کی گالیوں کا وزن اچھی طرح سمجھ لیتا ــــ اور اس کو گالیاں دیتا ہوا کہتا ــــ ابے ــــ سالے دیکھ دکان بند کئے جاتا ہوں، یہ چھاؤنی گرانا نہیں۔ اسی میں سو رہنا مگر بیٹا چھاؤنی غائب نہ ہونے پائے۔"

اس کے ساتھ اس کا دوست کالو ضرور ہوتا تھا۔ اگر انسانوں کی اس طویل و عریض آبادی میں اس کا کوئی دوست تھا تو وہ صرف کالو ہی تھا ــــ کالو ہی کی طرح وہ بھی اپنے ماں باپ کو نہ جانتا تھا کہ وہ کیا ہیں اور کون ہیں؟

ایک دن بھوک کی شدّت میں منہ لبسورتے ہوئے اس نے اپنی بوڑھی ماں سے کھانا مانگا تھا۔ تو اس کو کھانے کو دو سر چکرا دینے والے طمانچے اور پینے کیلئے ڈانٹ ملی تھی اور دانت پیستے ہوئے اس کی ماں نے کہا تھا "کمینہ ــــ کھانا، کھانا، کھانا، ــــ دیکھتا نہیں تیرے بزدل اور نامرد باپ نے نہ جانے کہاں منہ کالا کیا ہے، حالانکہ آج سے تیس سال قبل میرے مہندی کے رنگے ہوئے ہاتھوں کو چومتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"آج سے میرا اور تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ خوشی اور شادمانی کی رنگینیوں میں بھی، اور رنج و مصیبت کی تلخیوں میں بھی۔"

مگر وہ جھوٹا مسرت اور شادمانی کے بیس سال ساتھ گذارنے کے بعد رنج و مصیبت کی گھڑیوں میں مجھے تنہا چھوڑ کر نہ جانے کہاں جا مرا۔ اور تو اس کا جنا میرا کلیجہ نوچ کر کھا جانا چاہتا ہے۔"

لیکن جب سے اس کی دوستی کالو سے ہوئی تھی۔ مسرت ہو یا رنج، سکون ہو یا سیلاب۔ ہر حال میں کالو اس کے ساتھ رہا۔

ایک لڑکی نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سے شادی کرلے گی اور زندگی بھر اس کا ساتھ دے گی۔ اور وہ زندگی کے حسین ترین خواب دیکھنے لگا تھا۔ مگر شادی سے پہلے ہی وہ ایک سفید پوش بابو کی چکنی چکنی باتوں پر اور چہکتی مہکتی زندگی میں اس طرح گم ہوگئی جیسے اجلے کپڑے پر پانی کی بوند دو لمحوں میں اس طرح جذب ہو جاتی ہے۔ جیسے فیکٹری کی چمنی سے نکلتا ہوا کالا دھواں آسمان کی نیلاہٹوں میں کھو جاتا ہے۔

اور وہ جہاں کا تہاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے حسین خواب کے تانے بانے اُلجھ کر ٹوٹ چکے تھے۔

لیکن کالو نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہ زندگی بھر ساتھ دینے کا، نہ میٹھی میٹھی باتوں سے اس کا دل بہلانے کا۔ تاہم اس کی پُرخلوص محبت اور دوستی سے وہ حقیقی وفاداری خود بخود چھلکتی۔ جسے دنیا بھر کے شاعر کائنات کی بیکراں وسعتوں میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ اور نہ جانے کب تک تلاش کرتے رہیں گے۔

وفاداری جو دو ہستیوں کے درمیان ایسا ربط بن جاتی ہے جس پر اگر انگلی رکھ دی جائے تو محسوس ہو گویا ایک آہنی شکنجہ شہ رگ کو جلد باندھے جانے والی کتاب کی طرح اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔ جس وفاداری کے بارے میں غالب نے کہا تھا، کہ اگر برہمن بُت خانے میں مر جائے تو اس کو کعبہ میں دفن کرنا چاہیئے۔

کسی عہد و پیمان کے بغیر کالو اس کی زندگی میں داخل ہو گیا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مستقبل قریب و بعید کے طویل و عریض پھیلاؤ میں اس کی زندگی کا تصور کالو کے بغیر ناممکن تھا۔ کالو سے اس کی محبت کے تقاضے وہ نہیں تھے جو محبوبہ کی محبت کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ محبت محبوبہ کی محبت سے زیادہ گہری، زیادہ پُرخلوص، کہیں زیادہ رنگین اور رنگین سے بھی زیادہ سادہ تھی۔

انسانوں کی اس بے پناہ آبادی میں اس کو معلوم تھا کہ جب وہ مر جائے گا، تو

ایک کالو کو چھوڑ کر کسی کو خبر تک نہ ہوگی کہ ایک انسان موت کی آغوش میں سو گیا ہے اور دو پھیلی ہوئی ہتھیلیاں بھینچ کر گھونسے کی طرح تن گئی ہیں، جیسے انسان کے بنائے ہوئے اس نظامِ ریا و فریب کا سر توڑ دیں گی۔

وہ صرف کالو ہی تھا جسے وہ "اپنا" کہہ سکتا تھا۔

اس کی زندگی ایک چھوٹا سا دائرہ بن کر رہ گئی تھی۔ صبح سنہرے سورج کی کرنیں جب اس کے گرد آلود چہرہ کا بوسہ لیتی تھیں تو وہ کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھتا ــــ اس کا دوست کالو چپ چاپ اس کے سرہانے بیٹھا ہوتا ــــ اور وہ اس کو چھیڑ دیتا ــــ کیوں بے کالو ــــ کیا رات للی سے جھگڑا ہو گیا ہے صبح ہی صبح منہ پھلائے بیٹھا ہے ــــ اور کالو مسکرا کر سر جھکائے ہوئے اس کے بالکل قریب کھڑا ہو جاتا۔

اور وہ اُٹھ کر آنکھیں ملتا ہوا گرم نالے کی طرف چل دیتا جہاں وہ حوائج ضروری سے فارغ ہو کر سیدھا اپنے دوست کالو کے ساتھ "سی ٹاؤن" کے کوارٹروں کی تنگ قطاروں میں گم ہو جاتا ــــ اس کے دوست کالو کی للی کا گھر اسی طرف تھا ــــ کالو تو ایک تنگ گلی میں جا کر پیار محبت کرنے لگتا اور وہ "سی ٹاؤن" کے سینکڑوں کوارٹروں کے دروازے بھیک مانگتا ہوتا۔ جہاں سے اس کو کچھ خشک اور کچھ گیلے دانے مل جاتے تھے۔

قریب بارہ بجے مکانوں کی تنگ قطاروں سے نکل کر وہ لسبنت ٹاکیز کے پیچھے اپنے اڈے پر پہنچ جاتا، جہاں اس کا دوست اس کا منتظر ہوتا۔ گیلے دانوں کو کھانے کے بعد وہ خشک دانے لے کر "پٹیل صاحب کی بھٹی" میں پہنچ جاتا ــــ پٹیل صاحب کی بھٹی سے بھی اس کو ایک بے نام الفت سی تھی۔ کیونکہ اس کو وہاں سے ایسی چیز مل جاتی تھی جو کہ اس کو رنج و غم سے لبریز زندگی سے الگ کچھ دیر کیلئے سکون کے جھولے جھلاتی تھی۔

بھٹی کا مالک جسے "صاحب" کہا جاتا تھا وہ بھی اس پر کافی مہربان تھا۔ جب وہ وہاں پہنچتا تو صاحب اپنی مخصوص بولی میں بول اُٹھتا۔ "کیوں بیٹا قادر، آج کتنا لائے ہو؟"

اور قادر اپنی میلی سی تھیلی بغیر کچھ کہے صرف مسکرا کر اس کے آگے پھیلا دیتا، اور عجیب پیاسی پیاسی نظروں سے صاحب کو دیکھنے لگتا۔

"بس بیٹا اتنا ہی۔ اب اس کے بدلے تو ایک گلاس بھی نہیں ملے گا۔" اور پھر فوراً ہی داموں کو رکھتے ہوئے کہتا۔ "دیکھ قادر تو میرا بہت پُرانا گاہک ہے اور میں تیرے کو بیٹے سمان مانتا ہوں۔ اسی واسطے تیرے کو دیئے دیتا ہوں۔ نہیں تو کسی سالے کی بہن آجائے اور رات سے بھور کر دے تب بھی ایک گلاس مانگے تو ایک بوند تو ہرگیس نہ دوں ... سمجھا کہ نہیں۔ بس تیرا خیال کرتا ہوں میں۔"

اور صاحب ایک گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھا دیتا جسے وہ ایک ہی سانس میں چڑھا جاتا اور صاحب مسکرا کر کہتا۔ "ابے قادر، ایک سانس میں مت پیا کر۔ سالے! اپنے تو مرے گا ہی میرے کو بھی لال گھر دکھائے گا۔" اور قادر مسکراتا ہوا تھیلی جھاڑ کر لڑکھڑاتا ہوا بھٹی کے باہر نکل جاتا۔ اور بوڑھے برگد کی ڈاڑھیوں کے سائے میں آکر لیٹ جاتا —— وہ ہمیشہ پی کر چپ چاپ سو جاتا تھا۔ اس کو پی کر سونے کی عادت سی ہو گئی تھی —— وہ دوسرے شرابیوں سے بالکل مختلف تھا۔

وہ شہر کے کسی بھی حصے میں ہوتا، بسنت ٹاکیز کے تینوں شو کے افتتاح اور اختتام پر وہاں ضرور پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ پھیلے ہوتے اور وہ چپ چاپ کھڑا ہوتا کبھی تو اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر کئی پیسے آجاتے اور کبھی اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ آہستہ آہستہ اُٹھتے اور اس کے منہ پر طمانچے کی طرح جا پڑتے۔

"ایک ٹکڑا مل جائے غریب کو بابا۔" سرخ سرخ کھپریلوں والی محمڈن لین کے

پیچھے والی گلی کے شمالی موڑ والے مکان کے سامنے پہنچ کر اس نے آواز لگائی، اور اس نے سُنا "کچھ بچا کھچا کھانا ہو تو مل جائے بابا"۔ یقیناً یہ اس کی لگائی ہوئی صدا کی آواز بازگشت نہیں تھی، یہ ایک جوان نسوانی آواز تھی۔ اس کے کان اپنے دوست کالو کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اس کے دماغ میں کل والے جُملے بھی ابھر آگئے "حرامی نہیں تو ___ دس بجے آیا ہے ___ سب تو اس لڑکی کو دے دیا ___ اب آکر چلّاتا ہے"۔ اور جیسے اس کے پیٹ میں گھونسے کی چوٹ اُبھر آئی۔

آسمان پر بدلی ہونے کی وجہ سے چاند اور ستارے غائب تھے اور لین بالکل تاریک۔ ماسٹر بیٹ مائل روڈ کے دور اُفتادہ چالیس واٹ بلبوں کی روشنی وہاں تک پہنچنے میں ہمیشہ ناکام ہی رہتی تھی۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جیسے اس کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کے قطرے ٹپکنے لگے ___ " بھلا ___ ہو ___ گا ___ با ___ با"۔

اس نے اندازہ لگایا، لڑکی لین کے بیچ میں ہے۔ وہ تیزی سے اسکی طرف لپکا۔ کئی جگہ پر ٹھوکریں کھانے کے باوجود بھی وہ بڑھتا گیا۔ کچھ دور ایک سایہ اس کو ہلتا ہوا نظر آیا۔ وہ اور تیزی سے بڑھا۔ سایہ لڑکی میں تبدیل ہونے لگا۔ لڑکی نے اسے مڑ کر دیکھا اور وہ سہم گئی۔ لیکن وہ سہمی سہمی سی بڑھتی رہی۔ قریب پہنچ کر اس نے دیکھا لڑکی واقعی جوان ہے۔ جسم سڈول اور گورا ہے لیکن ان سب کے باوجود بھی وہ تڑپ کر بولا ___ " سالی اس وقت ادھر کاہے کو مانگنے آتی ہے۔ جانتی نہیں اس میں تیرا باپ ___ میں مانگنے آتا ہوں"۔ لڑکی اور بھی سہم کر ٹھہر گئی۔ ایک نظر لڑکی نے اوپر سے نیچے تک اس کو دیکھا اور چلتے چلتے بولنے لگی۔

" تم سالا آتا ہے تو کیا ___ تیرا باپ کا لین ہے۔ سالا ہم کو جہاں ملے گا، وہاں جائے گا۔ تیرے باپ کا کیا جاتا ہے"۔ اور سنیما کے فیڈ آؤٹ ہوتے ہوئے منظر

کی طرح پھر سلئے میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اور وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ تاریکی میں وہ خود اپنے کو بھی ایک سایہ محسوس کر رہا تھا۔ "میں کون ہوں اس کو منع کرنے والا۔" وہ لیکا یک بڑبڑا اٹھا۔ "میرے باپ کا لین تھوڑے ہی ہے۔" پھر اچانک اس کے پیٹ نے کہا "اگر وہ لڑکی یونہی روز آتی رہی تو مجھ کو روز بھوکا مرنا پڑے گا۔" اور اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ لڑکی لین کے کونے والے مکان پر آواز لگا رہی تھی۔ وہ پھر تیزی سے بڑھا اس کا گھونسا تنا ہوا تھا، دانت ایک دوسرے سے جکڑے گئے تھے۔ اس شدت سے پیدا شدہ اعصابی تناؤ کا تقاضا تھا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس کی روح کو اس کے جسم سے اس طرح نکال کر پھینک دے جیسے گیلا کپڑا نچوڑنے سے اس میں سے پانی نکل جاتا ہے۔ تاکہ وہ پھر اس کے حصے کی بھیک نہ لے جا سکے۔ اس کے پنجے سکڑتے اور پھیلتے رہے۔ اور وہ اس سائے کی طرف بڑھتا رہا۔ دور بستیوں کے اس پار ٹاٹا کمپنی کے ڈمپنگ یارڈ میں سرخ سرخ لوہے کا میل لاوے کی طرح دہک اٹھا اور اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ لڑکی سرٹیٹ مائل روڈ کی طرف بڑھ رہی ہے اور روڈ پر پہنچ کر برقی روشنی میں سایہ پھر لڑکی میں تبدیل ہو گیا۔ کئی آدمی لڑکی کے قریب سے گزر گئے۔ اور وہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اندھیرے ہی میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا ـــ اور ڈمپنگ یارڈ میں ٹھنڈے ہوتے ہوئے لاوے کی طرح اس کا قتل کا ارادہ بھی ٹھنڈا ہونے لگا۔ سڑک پر ایک چمکتی ہوئی کار ہوا کی رفتار میں گزری۔ وہ چونک پڑا اس نے ہتھیلی کو ٹٹولا۔ اس میں صرف ایک ہی ٹکڑا روٹی کا تھا، جو اس کی بھوک کی آگ پر پانی ڈالنے کے لئے ناکافی تھا۔ اس نے بڑی امید سے پھر لین کا ایک چکر لگایا اور اس کو اپنے اور اپنے دوست کالو کے پیٹ بھرنے کے لئے کچھ مل ہی گیا۔

کھانا پا کر وہ کچھ دیر کے لئے اس لڑکی کو بھول گیا اور ایک عارضی اطمینان کے ساتھ وہ بسنت ٹاکیز کی طرف بڑھنے لگا۔ آج کئی روز کے بعد پھر محمڈن لین کے

مکانوں سے اس کو پیٹ بھرنے کو مل گیا تھا۔ یہ ہنگامی کامیابی اس کی اُجاڑ، سنسان، اور ناکام زندگی میں ایک غیر معمولی واقعہ سے کم نہ تھی، ابھی وہ سنبھل کر بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کا دوست کالو آموجود ہوا۔ اس نے مسکرا کر اپنے دوست کو دیکھا، اور اس کا دوست اپنی لمبی زبان سے ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے اپنے پیروں پر بیٹھ گیا۔

"یار کالو! آج کھانے کو ضرور ملے گا۔ کئی دن سے تم کو شکایت ہو رہی تھی کہ سب سالے کو ہم ہی کھا جاتا ہے تم کو بہت ذرا سا دیتا ہے ــــ دیکھ کالو، بات یہ تھی کہ وہ گانجا دکان کے سامنے والی اپنی محمڈن لین ہے نا۔ ارے جہاں تیری سفید بالوں والی محبوبہ رہتی ہے وہاں سے سالی ایک لڑکی مجھ سے پہلے ہی پہنچ کر میرے حصے کا سب کھانا اُڑا لے جاتی تھی اور ہم تم بھوکے رہ جاتے تھے۔ مگر آج سالی کو میں نے جب دیکھ لیا تو جلدی جلدی بھاگنے لگی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سڑک پر پہنچ گئی۔ نہیں تو آج مار ہی ڈالتا سالی کو۔" وہ تھیلی سے کھانا نکالتا جا رہا تھا اور کالو سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ کالو کی آنکھیں معمول سے زیادہ چمک رہی تھیں اور کھانے پر جمی ہوئی تھیں۔

"لے بڑا بھوکا معلوم ہوتا ہے۔" اس نے ایک روٹی کے کئی ٹکڑے کر کے اپنے دوست کی طرف بڑھا دئے۔ اور خود بھی کھانے لگ گیا۔

کھانا ختم ہو ہی چکا تھا کہ قادر نے دیکھا کہ کالو کی سی ٹاؤن والی محبوبہ بلی سیٹھ مگن لال جی کے لاڈلے کے ساتھ بھاگی جا رہی ہے اور قادر قہقہہ لگاتے ہوئے چلّا اُٹھا: "ابے بھاگ بے کالو بھاگ ــــ سالے تیری محبوبہ کو دیکھ سیٹھ کا لاڈلا بھگائے لئے جا رہا ہے۔" اور کالو نے کان کھڑے کر کے دیکھا اور دُم جھاڑ کر غراتا ہوا تیزی سے شیر کی طرح لپکا۔ اور قادر مسکراتا ہوا اپنی تھیلی جھاڑ بسنت ٹاکیز کے بارہ آنے والے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ خوانچے والے جمع ہو چکے تھے جس سے اس نے سمجھ لیا کہ بس اب "انٹرویل" ہونے ہی والا ہے۔ وہ سکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ قریب ہی سنیما کے

آخری شو کے ٹکٹ کے لئے لوگ لائن سے لگے ہوئے تھے۔ وہ لائن میں لگے ہوئے خوش پوش بابوؤں کو بڑی حسرت سے تک رہا تھا کہ اچانک اس کی نظریں ایک خستہ حال جوان لڑکی پر جم کر رہ گئیں۔ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ اور خود ہی بڑبڑا اٹھا "سالی یہاں بھی پہنچ گئی۔ حرامزادی کو کوئی اور جگہ نہیں ملتی ہے۔ جہاں میں جاتا ہوں وہیں مرنے کو آجاتی ہے سالی۔ اس کا جی چاہا کہ لپک کر اس کی گردن دبوچ لے اور اتنا دبائے اتنا دبائے کہ سالی کی زبان اور آنکھیں باہر نکل پڑیں۔ مگر خوش پوش بابوؤں کے مجمع میں ایک جوان لڑکی کو دبوچ لینے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔ وہ اپنا گرم گرم کھولتا ہوا خون پی کر رہ گیا۔ مگر ایک چنگاری اس کے سینے میں دبی رہ گئی۔ جو اس کے دل کو جلائے ڈال رہی تھی۔ اور وہ چپ چاپ اندر ہی اندر جل رہا تھا۔ اس کی غصے اور رقابت سے لبریز نظر لڑکی پر جمی ہوئی تھی۔ لڑکی لائن میں لگے ہوئے نوجوان بابوؤں سے بھیک مانگتے جا رہی تھی۔ وہ نیم برہنہ حالت میں ان لوگوں کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی ساڑی اس کے پورے جسم کو چھپانے کے لئے ناکافی تھی۔ اس کی بوسیدہ ساڑی اس کی ران اور کمر سے ہوتی ہوئی اپنے پیچھے اس کی جوان چھاتیوں کو چھپاتی ہوئی اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ اس کی ساڑی کے پھٹے ہوئے کئی حصوں سے اس کا جوان جسم جھانک رہا تھا۔ کم بخت اس کی جوان چھاتیاں بھی کبھی کبھی جھانک لیا کرتی تھیں اور نوجوانوں کی نظریں اس کے جسم پر پھسل پھسل جا رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں اس طرح اس کے جسم کے اُتار چڑھاؤ پر گھوم رہی تھیں جیسے وہ اپنی نگاہوں ہی نگاہوں میں اس کی ساڑی کو اُتار رہے ہیں۔ اور اس کے جسم کے ہر جوان رگ و ریشہ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور جب وہ لڑکی کسی سے ناامید ہو کر آگے بڑھ جاتی تو وہ اپنے ساتھی کے کندھے کو زور سے دبا کر کہتا "یار ہے سالی مزیدار۔ مگر نئی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا دیر میں پھنسے گی سالی۔" اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری لائن میں اس کے بھرے بھرے جسم اور اُبھرے ہوئے سینے کے متعلق کھسر پھسر ہونے لگی۔

قریب ہی ایک نوجوان اس کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی بڑبڑا کر آگے بڑھ گئی۔ اور نوجوان کی نظریں سامنے دیوار پر لگے ہوئے پوسٹر پر جم گئیں۔ جہاں ککو اپنی تپلی کمر کو خمدار بنائے اور ٹانگیں پھیلائے ہنس رہی تھی نوجوان مسکرا کر بڑبڑا اٹھا۔ "سالی ایک ٹانگ پھیلا کر چاندی کے سکے مانگتی ہے، تو دوسری، ہاتھ پھیلا کر صرف تانبے کے پیسے مانگتی ہے۔" بے چارہ کوئی جدید ادیب معلوم ہوتا تھا اسی لئے تو یہ مقابلہ کر رہا تھا۔

"اے صاحب۔ ٹکٹ لینا ہے تو لیجئے نہیں تو آگے بڑھئے۔" بکنگ آفس کے سامنے کھڑے ہوئے ایک تیس سالہ بابو کو ایک نے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ بابو لڑکی کے جسمانی اُتار چڑھاؤ میں ایسا کھو گیا تھا کہ وہ ٹکٹ لینا بھی بھول گیا۔ جس کے واسطے وہ بسوٹو پور سے ساچی آیا تھا۔

بابو نے بڑھ کر ٹکٹ گھر میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کے دل نے کہا: "چلو آج کی بارہ آنے کی تفریح مہنگی نہیں پڑے گی۔"

ایک نوجوان قادر کے قریب ہی کھڑا اپنے دوست سے اس لڑکی کو پھانسنے کی صلاح کر رہا تھا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے قادر کو اس لڑکی سے ہمدردی سی ہونے لگی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا جیسے تمام نوجوان ایک ساتھ مل کر اس لڑکی کو سر بازار ننگا کر رہے ہیں۔ ان کی بے حیائی پر قادر کو بہت غصہ آیا۔ وہ دانت پیس کر بڑبڑا اُٹھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ سالوں کے گھروں میں ابھرے ہوئے سینوں اور بھرے ہوئے گورے گورے جسموں والی ماں بہنیں نہیں ہیں شاید —— اگر ہوں گی بھی تو یہ سالے ان کے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہوں گے اور نہ جانے کیا کیا کرتے ہوں گے۔ خدا جانے کہاں تک ننگا کیا کرتے ہوں گے اپنی ماں بہنوں کو۔" قادر کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے لڑکی کو پکڑ کر دور، بہت دور لے کر بھاگ جائے جہاں ایسے لوگ نہ ہوں۔ جو اس کے اُبھرے ہوئے سینے اور بھرے ہوئے گورے گورے جسم کو ناپاک نگاہوں سے ننگا کیا کریں۔ مگر وہ

ایسا نہ کرسکا۔ وہ خود ہی اُٹھ کر وہاں سے کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ تاکہ ان کی ناپاک باتیں نہ سُن سکے ورنہ خواہ مخواہ اس کو تاؤ آئے گا۔

اچانک دروازوں پر سے پردے ہٹنے لگے۔ اور لوگوں کا ہجوم باہر نکلنے لگا ــــ خوانچے والے چیخنے لگے اور قادر بھی گیٹ سے لگ کر ہاتھ پھیلائے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ گیٹ کے دوسری طرف وہ لڑکی کھڑی صدائیں لگا رہی تھی ــــ ہر آدمی ــــ جوان ، معمّر ــــ سب ہی صرف مسکرا کر اس کے بہت قریب سے اس کے پھٹے ہوئے کپڑے سے جھانکتے ہوئے جوان سینے کو گھورتا ہوا گذر جاتا تھا اور کئی ایک تو اپنے جسم کو اس سے رگڑتے ہوئے گذر گئے۔

لوگوں کی بھیڑ واپس ہال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ خوانچے والوں کی آوازیں تھم پڑتی جا رہی تھیں۔ قادر کے پھیلے ہوئے ہاتھ اب تک خالی تھے۔ لیکن اس لڑکی کے ہاتھ پر دو ایک پیسے چمک رہے تھے ــــ قادر کا خون گرم ہونے لگا۔ " سالی یہ نہ آتی تو ــــ یہ پیسے مجھی کو مل جاتے "۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کی ہتھیلی پر سے وہ پیسے لے کر بھاگ جائے۔ مگر فوراً ہی اس کو خیال آیا کہ کچھ دیر پہلے اس کو ننگا کیا جا رہا تھا ــــ یہ اس کا معاوضہ ہی تو ہے۔

بھیڑ غائب ہو چکی تھی ، خوانچے والے جا چکے تھے۔ قادر بسنت ٹاکیز کے پیچھے بڑھنے لگا۔ لڑکی کالی ماٹی روڈ پر کچھ آگے بڑھ کر گم ہو گئی۔

رات کے تقریب گیارہ بج رہے تھے اور قادر اپنی پھٹی ہوئی پینٹ جانگ تک اُٹھائے ہوئے بہت سنبھل سنبھل کر بڑھ رہا تھا ــــ ذرا سی بارش ہو جانے کی وجہ سے محمڈن لین کے پیچھے والی گلی میں کافی کیچڑ ہو گئی تھی۔ " بھلا ہو گا بابا ــــ غریب پر دیا کرو بابا "۔ اچانک یہ آوازیں قادر کے کانوں میں تیر بن کے گھُس گئیں۔ وہ بڑبڑا اُٹھا۔

" آ گئی سالی۔ آج جائے گی کہاں بچ کر "۔

اور قادر نے دانت پیستے ہوئے اپنی میلی تھیلی کو اپنی پینٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اور ہاتھ جھاڑ کر جلدی سے دوڑ کر قریب ہی ایک گرتے ہوئے مکان کی گری ہوئی دیوار کے ڈھیر کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔

"بھلا ہو گا بابا!" آواز قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔

"بھلا ہو گا بابا!"

"دَیا کرو بابا!"

"غریب کو ایک ٹکڑا بابا!"

"بھلا ہو گا بابا!"

آواز بالکل قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اور ہر آواز پر اس کے خون کا کھولنا بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی مٹھیاں کھلتی اور بند ہوتی جا رہی تھیں۔

"بھلا ہو گا بابا!" قادر نے محسوس کیا کہ لڑکی اب اس سے بالکل قریب آ چکی ہے اس نے گردن لمبی کر کے دیکھا۔ لڑکی آہستہ آہستہ کیچڑ سے بچتی ہوئی آ رہی تھی۔ کیچڑ سے بچنے کی خاطر اس نے اپنی بوسیدہ اور میلی ساڑی کو اپنی گوری اور موٹی موٹی رانوں تک اُٹھا رکھا تھا ——

اس کی رانیں اندھیرے میں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے قریب ہی ٹاٹا کمپنی کے ڈمپنگ یارڈ میں گندمی رنگ کے دھوئیں کی دو موٹی موٹی لہریں لہرا رہی ہوں ——

مگر قادر کی نگاہیں اس کے گلے پر جمی ہوئی تھیں، جہاں سے وہ آواز نکل رہی تھی۔ وہ اس کے گلے کو دبوچ لینا چاہتا تھا تاکہ پھر اس میں سے بھیک کے لئے آواز نہ نکل سکے۔ لڑکی قریب دس گز کے فاصلے پر پہنچی ہو گی کہ قادر آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ اتنی آہستگی سے کھڑا ہوا کہ لڑکی اس کو دیکھ نہ سکی۔ قادر اس کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن لڑکی اس کو اندھیرے میں دیکھ نہیں رہی تھی۔ وہ بالکل قادر کے سامنے پہنچی ہی تھی اور قادر نے چاہا ہی تھا کہ لپک کر

اس کی گردن کو دبوچ لے اور اس چکتی ہوئی گردن کو اتنا دبائے کہ اس کی زبان اور آنکھیں دونوں ہی باہر نکل پڑیں۔ مگر دوسرے ہی لمحہ کسی نے پیچھے سے آواز دی "اے لے روبی" اور پھر طویل خاموشی۔ روبی کا نام سنتے ہی لڑکی ہڑبڑا کر مسکرا پڑی۔ اور جلدی سے ساڑی اٹھائے ہوئے آواز کی طرف لپکی۔ اور قادر کے پھیلے ہوئے پنجے سکڑ کر رہ گئے۔ وہ آواز کے سنتے ہی چونک پڑا تھا۔ کیونکہ وہ ایک مردانہ آواز تھی۔ اور اس سے پہلے کسی بھی مرد نے گھر کے پچھلے دروازے سے بھیک نہیں دی تھی۔ خاص کر لین کے پیچھے والی گلی میں تو دن اور رات صرف عورتوں ہی کا راج رہتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ لڑکی دروازے کے قریب پہنچ کر سائے میں تبدیل ہو گئی تھی ــــ مگر اس کی تیز نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی ــــ

سایہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور پھر ذرا سی کھسر پھسر کے بعد سایہ جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ قادر گھبرا کر دو چار قدم آگے بڑھ گیا۔ گردن کو اور لمبی کر کے غور سے دیکھنے لگا ــــ "چھوڑ بابو ــــ چھوڑ مجھے ــــ مجھے چھوڑ دے بابو۔ یہ کیا کرتا ہے۔ شریف لوگ تو ایسا نہیں کرتے ہیں بابو۔"

قادر نے محسوس کیا کہ لڑکی بڑی مشکل سے آوازیں اپنے منہ سے نکال رہی ہے۔ اس کو بات کی تہ تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ ہوئی۔ اس کا وہ جذبۂ خیر جاگ اٹھا جو ہر انسان کی روح میں ازل سے موجود ہے اور جس کی طاقت سے دنیا کے عظیم ترین معرکے سر ہوئے ہیں۔ وہ تڑپ کر تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس کے پیروں کی چھپ چھپ چھاچ چھپ سن کر سایہ کئی بار تڑپا اور جب قادر دروازے کے قریب پہنچا، تو سایہ غائب ہو چکا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ لین تاریک اور خاموش تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے یہاں برسوں سے کوئی نہیں رہ رہا ہے۔ ایک طرف کی دیوار ذرا گری ہوئی تھی۔ مکان کے کھپرے بھی ذرا الٹے پلٹے پڑے تھے۔

دروازہ کافی بوسیدہ حالت میں تھا۔ اس کے لمبے لمبے شگافوں سے روشنی کی کرنیں نکل کر تاریک لین کو دو حصوں میں بانٹنے کے لئے کوشاں تھیں۔ قادر نے لپک کر شگافوں سے آنکھ لگادی اور اس کی نظریں کچے آنگن سے ہوتی ہوئی برآمدے سے گذر کر کمرے میں پہنچ گئیں۔ کیونکہ کمرہ بغیر دروازے کے تھا۔ قادر نے جو کچھ دیکھا اس سے اس کے خون کی روانی میں دوگنا اضافہ ہوگیا۔

قادر نے آج پہلی بار شرافت کی آڑ میں شیطنت کا ننگا ناچ دیکھا تھا۔ اس منظر کی تاب نہ لاکر قادر چیخ اٹھا "بابو۔ بابو دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو بابو" لیکن بابو پر اس کے چیخنے کا بالکل اثر نہ ہوا۔ اور قادر زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔ مگر پھر بھی دروازہ کھلتا نہ دیکھ کر اس نے دیوار کے ٹوٹے ہوئے حصے سے چھلانگ لگادی اور دھم سے آنگن میں کود پڑا۔ اور بھوکے شیر کی طرح دوڑ کر بابو پر ٹوٹ پڑا ــــ ایک ہی دو جھٹکوں میں اس نے لڑکی کو بابو کی گرفت سے آزاد کرادیا لیکن قادر نے دیکھا کہ لڑکی کوشش کے باوجود بھی نہ اٹھ سکی۔ اس کا خون اور بھی کھول گیا۔ بابو سہما ہوا ایک کونے میں کھڑا تھا۔ قادر گرجا۔ "تم شریف آدمی ــــ ایک لڑکی کی عصمت لوٹتے ہوئے تم کو شرم نہ آئی۔ دیکھتا نہیں وہ تو بالکل تیری لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ سالے بڈھے ہونے کو چلے اور حرامی پن سے باز نہیں آتے ہیں" اور یکایک قادر کے گال پر ایک مضبوط گھونسا لگا۔ جس نے اس کے دماغ کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا۔ اور قادر نے ایک خوفناک جست لگا کر اپنے آہنی پنجے بابو کی گردن پر جمادئے اور وہ اس کی گردن کے گرد چھوٹے سے چھوٹا حلقہ بناتے چلے گئے۔ اور آخر بابو کی گردن لٹک کر ایک طرف رہ گئی اور قادر کے چھوڑتے ہی بابو ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح کچے فرش پر گر گیا۔

لڑکی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی اور اپنی ساڑی لپیٹنے میں مشغول تھی۔ بڑی مشکل سے کھڑی ہوکر اس نے اپنی ساڑی پوری طرح پہنی اور قادر اس کو سہارا دے کر باہر لایا۔

اور دانت پیستے ہوئے کہا: "سالی! بھیک مانگنے سے پہلے اپنی عزت بچانا تو سیکھ لے پھر بھیک مانگنا۔ عزت بچانی تو آتی نہیں ہے۔ چلی ہے بھیک مانگنے۔"

لڑکی ابھی تک ہانپ رہی تھی اور اپنی ساڑی ٹھیک کئے جا رہی تھی۔ قادر نے تاؤ میں اسے بھی ایک طمانچہ رسید کر دیا اور لڑکی کو سٹریٹ مائی روڈ کی طرف دھکیل کر اسے ڈانٹتے ہوئے بولا: "بھاگ جلدی یہاں سے سور کی جنی۔"

لیکن لڑکی نے دو قدم بڑھ کر اپنی کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مگر ابھی تو مجھے ایک ٹکڑا ابھی روٹی کا نہیں ملا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی اور بوڑھی ماں بہت بھوکی ہوگی۔"

اور قادر نے کھسیا کر اپنی پینٹ کی چور جیب سے ایک چونی نکال کر اس کی ہتھیلی پر دھنساتے ہوئے کہا: "چل بھاگ سالی۔ دیکھ وہ "نانا ہوٹل" کھلا ہے۔ پکوڑی لے کر بھاگ جا۔ نہیں تو سوّر کی جنی تجھے بھی مار ڈالوں گا۔"

قادر کی آنکھیں اس وقت خون سے بھی زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔

اور آدھ گھنٹے بعد پوری لین میں کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ لالٹین اور ٹارچ لے کر نکل پڑے — اور سبھوں نے دیکھا کہ لین کی گیلی زمین اور کیچڑ پر کسی دوڑتے ہوئے مرد کے پاؤں کے نشان لین کے آخری سرے تک جا کر گھاس کے وسیع میدان میں گم ہو گئے تھے۔ اور کوئی نہ سمجھ سکا کہ جن ہاتھوں نے منشی "زیتون خاں" کا گلا دبوچ کر ہلاک کر دیا تھا وہ ہاتھ اس سے پہلے جب کبھی اٹھے تھے تو صرف بھیک لینے کو اٹھے تھے — گلا گھونٹنے والے یہ ہاتھ اس سے پہلے تک صرف پھیلے ہوئے ہاتھ تھے۔

مہدی عبّاس حسینی

تِنکا

(ایک ریڈیائی ڈراما)

کردار:۔۔۔۔

۱- رنجن - عمر ۳۰ سال۔ دنیا کو ایک غریب پریشان حال نوجوان دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

۲- عورت - وہ عورت جو کبھی رنجن کی محبوبہ تھی اور اب دوسرے کی بیوی ہے۔

۳- مرد - ایک کامیاب اور دولت مند انسان جو عورت کا مالک ہے لیکن دل کا بُرا نہیں۔

۴- رانی ماں - رنجن کی سوتیلی ماں۔

۵- بیرا - اور دوسری آوازیں۔

نوٹ: عورت رانی ماں کا پارٹ بھی ادا کر سکتی ہے۔

(کیبرے میوزک، چھری کانٹوں اور چمچوں کی آواز سے کسی ہوٹل کا پتہ چلتا ہے)

مرد: لو وہ پھر دکھائی پڑا۔

عورت۔ بے چارہ (ہنس کر) کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بال الجھے، کالر پھٹا۔ آستین کچی ہوئی۔
ذرا مکھن تو بڑھانا ڈیر۔

مرد: یہ لو۔ سنا ہے آج کل گانے کا شوق چرایا ہے۔

عورت: سنکی ہے۔

مرد: تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ تم تو ساتھ پڑھ چکی ہو۔

عورت: ہٹاؤ بھی۔ کب کی باتیں لے بیٹھے۔ ایک ٹوسٹ پر جیم (JAM) تو لگانا۔ لو! ادھر
کتنی بھوکی نگاہ ڈالی۔ ہائیں ہائیں کیا غضب کر رہے ہو۔ اسے اشارہ کیوں کر دیا۔

مرد: آنے دو۔ ذرا لطف رہے گا۔ پھر ایک زمانے میں تو تمہاری اس کی محبت کے
چرچے تھے۔

عورت: اونہہ بور (BORE) ہلو۔ رنجن۔

رنجن: (افسردہ دلی اور گھبراہٹ کے ساتھ) مجھے... مجھے زیادہ فرصت نہیں۔ بس ایک پیالی
چائے پینے آیا تھا۔

مرد: بیٹھو بھی یار۔ کہو آج کل کیسی گذر رہی ہے؟

عورت: ان کی ہمیشہ مزے سے گذری۔ آرٹسٹ جو ٹھہرے۔ یہ ہماری تمہاری طرح معمولی
انسان نہیں۔ ان کے پاس اصول ہیں۔ آئیڈیل (Ideal) ہیں۔ (لہجے میں کچھ
تلخی آجاتی ہے)

رنجن: (سوالیہ لہجے میں) اصول؟ آئیڈیل؟ (گھبرائی ہوئی ہنسی ہنستا ہے) نہیں نہیں میں
تو ایک معمولی انسان ہوں۔

مرد: (بنانے والے لہجے میں) تم ایک معمولی انسان کیسے ہو سکتے ہو؟ تم نے دنیا میں کیا
کام نہیں کیا۔ لاکھوں کے مجمع میں تقریریں تم نے کیں۔ روزنامہ اخبار تم نے نکالا۔
تمہاری ایکٹنگ کی دور دور تک دھومیں رہیں۔ تمہاری بنائی ہوئی تصویروں

کی نمائش کی گئی۔ اور اب سُنا ہے موسیقی میں اضافہ کر رہے ہو۔

عورت: (طنزیہ لہجے میں ہنس کر) تمہارا مطلب ہے Master of all

رنجن: (کڑواہٹ سے) تمہارا مطلب ہے Master of none۔

عورت: چھوڑو بھی ان باتوں کو۔ اچھا بتاؤ تم نے شادی کیوں نہیں کی۔ اب تک تمہارے دماغ میں میرے پریم کا بھُس تو نہیں بھرا ہے

رنجن: اتنا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔

مرد: چہ چہ رنجن۔ اس طرح کی صاف گوئی سے عورت کی ذلت ہوتی ہے۔

عورت: (بناوٹی لہجے میں) جبکہ مجھے اب بھی تمہارا خیال ہے۔ یہ لو چائے (لہجے میں کچھ خلوص آجاتا ہے) دیکھو شادی کر ڈالو۔ بیوی ہوگی تو تمہارے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی فکر کرے گی۔ تمہارے کوٹ کے کالر سے گرد جھاڑے گی پھٹی آستین کو رفو کرے گی۔ تمہیں حجامت بنوانے اور شیو کرنے پر مجبور کرے گی۔

مرد: تم اس طرح کی باتیں کروگی تو مجھے رشک ہونے لگے گا۔

رنجن: (بے دلی سے) تمہیں رشک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے اور تم لوگوں کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے۔

عورت: پھر وہی سماج پر لکچر؟

رنجن: نہیں۔ یہ دیوار میں نے خود کھڑی کی ہے۔ میرے خیال نے بقول تمہارے میرے اصول اور میرے آئیڈیل نے، میرے فلسفے نے۔

مرد: تمہارا فلسفہ؟ (قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا (عورت بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی ہے) ہا! ہا!! ہا!!! لو بھئی یہ فلسفی بھی ہو گئے۔ ہا ہا۔

عورت: اپنی ہنسی کو بمشکل روک کر) ذرا سنبھل کر ہنسو۔ نہیں تو اچھو ہو جائے گا (سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے) اچھا بھئی سنیں تمہارا فلسفہ کیا ہے؟

رنجن: نہیں۔ وہ تمہارے سننے کا نہیں ہے۔

عورت: (اٹھلا کر) رَن ۔ جَن ۔ ہم تو تمہاری اتنی خاطر کر رہے ہیں۔ اور تم اتنا بھی نہیں کر سکتے۔ یہ لو ٹوسٹ اور جیم۔

رنجن: (ترشی سے) نہ تم اسے سُن سکتی ہو نہ سمجھ سکتی ہو۔ وہ بھوکوں کا فلسفہ ہے مکھن اور شہد کھانے والوں کا نہیں۔

عورت: (تیزی سے) بس بس۔ میں سوشلزم سننے نہیں بیٹھی ہوں۔ ایک سیدھی سی بات پوچھی تو لگے واہی تباہی بکنے۔

مرد: (حقارت سے) واقعی نیکی کا زمانہ نہیں۔ ہم نے جو اتنی لفٹ (Lift) دے دی تو لگے بدتمیزی کرنے۔

رنجن: (کڑوا ہو کر) سچی بات امیروں کو ہمیشہ بدتمیزی معلوم دیتی ہے لیکن تم لوگ جو میری ذلت کر رہے ہو یہ شاید بدتمیزی نہیں۔

عورت: (تعجب سے) تمہاری ذلت؟

رنجن: (تلخی سے) ہاں۔ ایک چائے کی پیالی کا طعنہ، سیدھے منہ بات کرنے کا طعنہ، میرے پھٹے پرانے کپڑوں کے باوجود مجھے پاس بٹھانے کا طعنہ۔ گھبراؤ نہیں۔ اپنی چائے کے دام میں خود دوں گا۔

مرد: (جھینپ کر ہنستا ہے) ہا ہا ہا! خوب بھئی خوب۔ ابھی راکھ میں چنگاری باقی ہے۔

عورت: (سنجیدگی سے) رنجن میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔

رنجن: (افسردگی اور بے دلی سے) ہائیں ہائیں کیا غضب کر رہی ہو میں اس کا عادی نہیں ہوں۔

عورت: (مذاق کے لہجے میں) اچھا۔ اب تو اپنا فلسفہ بتا دو۔

رنجن: (ایک لمبی سانس لیتا ہے) عورت کی بات کی کوئی کاٹ نہیں۔ ایک ہی سانس میں

معافی بھی اور دوسری چوٹ بھی۔ خیر سن لو۔ لیکن میں یہ بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں سن کر تعجب ہوگا۔ کیونکہ یہ فلسفہ بڑے بڑے ریشمی لفظوں میں لپٹا ہوا کتابی فلسفہ نہیں ہے۔

عورت: اچھا اچھا کوئی ٹاٹ میں لپٹی ہوئی بات۔ ہے کیا آخر؟

رنجن: (سنجیدگی، اطمینان اور یقین کے ساتھ) میں کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔

(وقفہ)

مرد: بس؟

عورت: کیا؟

رنجن: میں نے کہا تھا تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔

عورت: ارے مہاشے جی۔ یہ تو ہر آدمی چاہتا ہے۔

رنجن: (تیز ہوکر) نہیں۔ کوئی روٹی چاہتا ہے۔ کوئی کپڑا چاہتا ہے۔ کوئی عزت، کوئی شہرت، کوئی عورت، کسی کو یہ چیزیں محنت سے ملتی ہیں، کچھ بغیر محنت کے حاصل کر لیتے ہیں۔

مرد: (چڑھ کر) کیا بکواس کر رہے ہو۔ میں تم سے زیادہ محنت کرتا ہوں۔ کیا تم اسی کو محنت سمجھتے ہو۔ تھالی کے بینگن کی طرح ادھر اُدھر لڑھکتے پھرو۔ کیا تم نے کبھی جم کر کوئی کام کیا ہے؟

عورت: کہنا آسان ہے فلسفی جی مہاراج، کرنا بہت مشکل ہے۔ تم بیکار پیدا ہوئے، اور بیکار مروگے۔

رنجن: (سادگی سے) مگر میں... میں کوشش جو کرتا رہتا ہوں۔

عورت: (حقارت سے) کوشش! ہونہہ! تمہاری حالت قابلِ رحم ہے۔ طوڈ ارلنگ!

مرد: یس یس۔ (فیڈ آؤٹ)

(موٹر کے اسٹارٹ ہونے کی آواز)

رنجن: قابل رحم۔ قابل رحم۔ (فیڈ آؤٹ)

(بیک گراؤنڈ میں کیبرے کی آوازیں۔ پھر موٹر کے آنے اور رُکنے کی آواز)

عورت: (کچھ ہانپتے ہوئے) بیرا۔ او بیرا۔ اس میز کا بل لاؤ۔

مرد: ارے بھئی۔ پریشانی کاہے کی ہے۔ یہ بھی اپنا ہی ہوٹل ہے۔ اگر میں یہاں بل نہ ادا کروں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیوں، جی۔

بیرا: جی سرکار۔ جی حضور۔

مرد: اچھا لاؤ۔ بل کہاں ہے؟

بیرا: حضور۔

مرد: (ڈانٹ کر) کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟

بیرا: جی سرکار۔ جی۔ بل تو وہ بابو جی ادا کر گئے۔

مرد: کون؟

عورت: رنجن؟

مرد: (تعجب سے) ارے کہاں گیا وہ؟

بیرا: حضور باغ کی طرف۔

عورت: ڈارلنگ۔ معلوم نہیں اس نے کس طرح ادا کئے ہوں گے۔

مرد: ہاں ہاں۔ معلوم نہیں۔ کل کے کھانے کے دام بھی اس کے پاس ہوں گے یا نہیں۔ چلو لے پیسے واپس کر آئیں۔

عورت: چلو۔ لیکن (رُک جاتی ہے)

مرد: لیکن کیا؟

عورت: کچھ نہیں۔ شاید (رُک جاتی ہے)

مرد: شاید کیا؟

عورت: کچھ نہیں۔ جلدی چلو۔ (فیڈ آؤٹ)

(وقفہ)

رنجن: (غصے میں) قابل رحم۔ قابل رحم (غصے کو قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے) میں کہتا ہوں مجھے تمہارا رحم نہیں چاہیئے۔ (زور زور سے سانس لیتا ہے) یہ عورتیں اور ان کی زہر کی بجھی باتیں۔ (رک کر سانس کو قابو میں لاتا ہے) میاں فلسفی۔ بھیا رنجن تمہارا فلسفہ کیا ہوا۔ کیا تمہیں اب بھی اس سے محبت ہے؟ نہیں، نہیں، پھر کیسے ڈرتے ہو۔ کہیں ساری دنیا تمہیں قابلِ رحم تو نہیں سمجھتی۔ کہیں تم سچ مچ قابل رحم تو نہیں ہوگئے۔ (چیخ کر) نہیں نہیں۔ انسان صرف اپنی نگاہ میں ذلیل ہوتا ہے۔ دوسرے کی رائے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیئے۔ (دھیمے ہو کر) بس اپنا کام کئے جاؤ۔ کام۔ کام۔ کوئی کام۔ ہر مرض کا علاج کام۔ لو وہ دونوں پھر آرہے ہیں۔ پھر ایک جھوٹا چہرہ لگا لو۔ پھر ایک جھوٹی مسکراہٹ۔ نہیں نہیں جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت، بس دل کا درد اُن پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ یہ اپنی نجی دولت ہے۔ (لہجہ بدل کر) ہلو ہلو۔ ہنسوں کی جوڑی ابھی تک ہوٹل سے اکتائی نہیں۔

مرد: بھائی رنجن بہت شرمندہ ہوں۔ چلتے چلاتے بل ادا کرنا بھول گیا۔ ہاں تو کتنے دام ہوئے بھئے؟

عورت: (مصنوعی ہنسی ہنس کر) تم نے مذاق مذاق میں پیسے دینے کو کہا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ بھگتنا ہی پڑے گا۔

مرد: اور فرض کرو نہ ہوتے تمہارے پاس اتنے دام تو کتنی سبکی، کتنی پریشانی ہوتی۔ ہاں تو بھائی، کتنے پیسے ہوئے۔

رنجن: رہنے دو۔ جلدی کیا ہے۔ جب کبھی ضرورت پڑے گی۔ مانگ لوں گا۔

عورت: میں... میں...

مرد: کیا؟

عورت: جانے دو۔ فضول اصرار نہ کرو۔ میں جانتی تھی وہ پیسے نہ لے گا۔

رنجن: اوہ میرے متعلق یہ نیک خیال کیسے؟

مرد: مگر... مگر...

رنجن: چھوڑو بھی۔ کبھی میں بھی تمہاری طرح شریف یعنی امیر تھا۔ پرانی عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ اچھا تمہیں یہ خیال تو نہیں کہ میں تمہارا بل ادا کر کے اپنے کو تمہارے برابر کا سمجھوں گا۔

عورت: اونہہ! اب جلی کٹی کون سنا رہا ہے؟

مرد: (کھسیانی ہنسی ہنس کر) ہا ہا ہا۔ قسم لے لو جو یہ گمان بھی ہوا ہو۔ اچھا بھئی رنجن بیٹھ جاؤ۔ آؤ کچھ باتیں کریں۔ اگر تم برا نہ مانو تو کچھ اپنا حال چال سنا دو۔

رنجن: یہ آج تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے۔ مجھ میں اتنی دلچسپی کیوں؟ تفریحاً؟

عورت: نہیں۔

مرد: قسم لے لو۔ بالکل نہیں۔

رنجن: خیر میں بھی آج بھرا بیٹھا ہوں۔

مرد: سگریٹ؟

رنجن: نہیں شکریہ! (کچھ رک کر) میری کہانی ایک معمولی آدمی کی کہانی ہے۔ نہ معلوم تم لوگ کیوں سننا چاہتے ہو — آج سے ۳۰ سال پہلے میں پیدا ہوا۔ ماں بچپن میں ہی مر گئی۔ باپ ایک سورج بنسی راجپوت تھے۔ ہم لوگ چھوٹے موٹے زمیندار رہتے۔ لیکن بابا کی مونچھوں پر ہمیشہ بل پڑا رہتا تھا اور ان کی

گردن ہمیشہ نسلی غرور سے اکڑی رہتی تھی۔ پھر رانی ماں یعنی میری سوتیلی ماں آئیں۔ اور میں تعلیم حاصل کرنے گھر سے باہر نکل پڑا۔

عورت: (ہلکے مذاقیہ انداز میں) وہی قلم اور ہل کی لڑائی۔

رنجن: ہاں۔ اور وہی نتیجہ۔ ہل کی موٹھ پکڑنے والی انگلیاں موٹی بھدی اور سخت ہوتی ہیں۔ قلم جیسا نازک ہتھیار ان سے نہیں سنبھلتا۔ مگر مجھے پڑھنا تھا ہمسایوں کے طعنوں سے بچنے کے لئے، رانی ماں کی طنز بھری مسکراہٹ کو مٹانے کیلئے باپ کی مونچھوں کے بل کو قائم رکھنے کے لئے پڑھنا تھا۔ میں نے اندھا دھند محنت کی۔ (دور سے اسکول کے گھنٹوں کی مدھم آواز سنائی دیتی ہے) اور مجھے گمان ہونے لگا جیسے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ (گھنٹے تیز ہو جاتے ہیں) امتحان کا ہال (گھنٹے کچھ مدھم ہو جاتے ہیں) امتحان کا نتیجہ (اخبار والوں کی پکار "امتحان کا نتیجہ۔ تازہ اخبار" دور سے بہت مدھم قہقہوں اور آوازوں کا شور، ہا ہا ہا میں پاس ہوگیا، ہا ہا ہا میں پاس ہوگیا، ہا ہا ہا میں پاس ہوگیا، رنجن کا تازہ قہقہہ ان آوازوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ "ہا ہا ہا۔ میں پاس ہوگیا"۔ سناٹا گھنٹے اور دوسری آوازیں رک جاتی ہیں) اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوگیا (تلخ لہجے میں کہہ کر رک جاتا ہے)

مرد: تو اس میں کون سی نئی بات ہے۔ میں خود تھرڈ کلاس بیٹھا ہوں۔

رنجن: تم ؟ ہاں خیر۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں نے اپنی کامیابی کے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ مجھے والد سے بڑی شرمندگی تھی لیکن وہ میری امید کے خلاف بہت خوش تھے۔ ان کے لئے یہی بہت تھا کہ میں پاس ہوگیا۔ میں جب گھر پہنچا تو انہوں نے مجھے گلے لگا لیا۔ اور ان کی آنکھوں میں ایسے غرور اور خوشی کے آنسو جھلکنے لگے، جیسے انہوں نے خود کوئی بہت بڑی فتح حاصل کی ہو۔

عورت: پھر کیا غم؟

رنجن: میں جس روز یونیورسٹی میں داخل ہوا اُسی روز اُن کی موت کا تار پہنچا۔ اور میری حالت ایسی ہو گئی جیسے ... جیسے کوئی کتے کا پلّا کسی میلے میں اپنے مالک سے بچھڑ جائے۔ تعلیم کا خیال ترک کر دیا۔ گھر پہنچا۔ رانی ماں ایک دن میں بوڑھی ہو گئی تھیں۔ ان کے بالوں میں سفیدی اور ان کے چہرے پر جھرّیاں دکھائی دیتی تھیں لیکن حیرت خیز یہ بات تھی کہ ہاتھوں میں رعشے کے ساتھ ساتھ ان کی نگاہوں میں ایک بجلی اور آواز میں کڑک بھی آ گئی۔ میں انہیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ٹھاکر کا رعب اور دبدبہ اُن میں آ بسا ہے۔ مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے۔

(Play Back)

رنجن کی آواز: (رنج و غم سے چور چور) رانی اماں!

رانی ماں کی آواز: بیٹے بڑی دیر لگائی تم نے۔ ہائیں چھوٹے ٹھاکر تم رو رہے ہو۔ دھیرج سے کام لو۔ دیکھو۔ میں تو نہیں رو رہی ہوں۔

رنجن کی آواز: اب میرا کون ہے۔ اب میرا کیا ہوگا؟

رانی ماں کی آواز: ہوش کرو ٹھاکر۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ میرے ہوتے تمہیں چنتا نہیں کرنی پڑے گی۔ جاؤ اطمینان سے پڑھو۔ تمہیں پہلے سے زیادہ خرچہ ملے گا۔

(میوزک جس میں گھنگروؤں کی بجائے روپے کی جھنکار ہے)

رنجن: اور سچ مچ مجھے روپے ملنے لگے۔ میں عمر میں پہلی مرتبہ امیر تھا۔ نئے سوٹ، نئے کھلونے، نئے دوست، نئی عادتیں، ایسا لگتا تھا جیسے میں کسی سپنوں کے دیش میں ہوں۔ اور پھر ایک سپنوں کی پری سے ملاقات۔

عورت: کیا یہ میری طرف اشارہ ہے۔

رنجن: شاید۔ ابھی اس پری سے میل جول بڑھ ہی رہا تھا کہ کالا دیو بھی آپہنچا۔

مرد: ارے یار میں ایسا کالا تو نہیں ہوں۔

رنجن: نہیں۔ تم نہیں میرے نئے ماما۔ یعنی رانی ماں کے بڑے بھائی۔ در اصل یہ سارا روپوں کا فرش ان ہی نے بچھایا تھا۔ بڑی محبت، بڑی عنایت (آواز بناکر) رنجن بیٹا۔ تم انگلینڈ کیوں نہیں چلے جاتے۔ بیرسٹر ہوکر آؤگے تو زندگی بن جائے گی۔ رنجن بیٹا۔ ایم اے کے بعد پی 'ایچ' ڈی ضرور کرنا (اصل آواز میں) میں پیسوں کا عذر کرتا تو (آواز بناکر) رنجن بیٹا۔ تم مجھ کو غیر سمجھتے ہو۔ جیسے تم رانی کے بیٹے ویسے ہی میرے بیٹے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ ہم لوگ سب طے کرلیں گے۔

عورت: کیا طے کرلیں گے؟

رنجن: سودا اور کیا چیز۔ نئے ماما کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ایک گال سورج تو ایک گال چاند صرف اس کے ہونٹوں پر ذرا سا کوڑھ کا نشان تھا۔ اور ذرا سا لنجی تھی اور ذرا سا پیر گھسیٹ کر چلتی تھی۔ اور ذرا تتلا کر بولتی تھی۔ اور ذرا اس کے منہ سے ہر وقت رال بہا کرتی تھی۔

عورت: Horrible

رنجن: اور سب (کھینچ کر کہتا ہے) ٹھیک تھا۔

مرد: بھیانک۔ بھگوان بچائے۔

رنجن: یہ آپ میری ہونے والی بیوی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ جی ہاں رانی ماں نے رشتہ پکا کرلیا تھا۔ بس میری منظوری کی دیر تھی۔ اور ظاہر ہے میں کیسے انکار کرسکتا تھا۔ مگر کلجگ کا زمانہ ہے نا۔ میں نے اپنے تمام بھلا چاہنے والوں

کا کہنا ماننے سے انکار کر دیا۔
رانی ماں کا غصہ:

(Play Back)

رانی ماں: (غصّے میں) یہ مت بھولو۔ تم ہمارے ٹکڑوں پر پل رہے ہو۔ اگر بھیا ہاتھ کھینچ لیں تو بھوکوں مر جاؤ گے۔

رنجن کی آواز: (غصّے میں) تو میں آج عہد کرتا ہوں کہ آپ کا یا آپ کے بھیا کا دیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے لئے حرام سمجھوں گا۔ اور جتنا مجھ پر خرچ ہوا ہے سب ایک ایک پائی آپ کو ادا کئے بغیر آپ کو منہ نہ دکھاؤں گا۔

مرد: شاباش!

رنجن: اس کے بعد زندگی تمہارے سامنے ہے۔ ہر چیز میں کوشش اور ہر بات میں ناکامی، سب سے پہلے محبت میں ناکامی۔ اور اس کے بعد...

مرد: (بات کاٹ کر) رنجن!

رنجن: کیا ہے۔

مرد: بھئی ہم سنیں گے، میڈم کی اجازت سے ہم ضرور سنیں گے۔

عورت: (کچھ شرما کر کچھ گھبرا کر) ہشت۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

رنجن: جانے بھی دو۔

مرد: واہ۔ ہمیں تو ہر کہانی میں یہیں پر مزا آتا ہے۔

رنجن: ارے بھئی۔ اس میں بات ہی کیا ہے عام انسان و پری کا سامنا کیا؟

عورت: (رُک کر نرم لہجے میں) نہیں۔ یہ بات نہیں۔ تم نے بہت دیر میں کہا۔

رنجن: (معافی مانگنے کے لہجے میں) تمہارے پریم کے ساتھ مجھے ماما کے روپوں کا علم ہوا

میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ دوسرے کے روپیوں پر پلتے ہوئے تم سے محبت کا دعویٰ کروں۔ جب اس بندھن سے آزاد ہو لیا۔ تبھی دل کی بات کہی۔

مرد: بھئی گول گول نہیں، صاف صاف کہو۔

عورت: (تیکھی ہو کر) اچھا تو سن لو۔ انہوں نے کہا "میں تم سے پریم کرتا ہوں۔" میں نے کہا "بہت جلد خبر لی۔" کہنے لگے "کیا تم مجھے پسند کرتی ہو؟" میں نے کہا...
(رُک جاتی ہے)

رنجن: انہوں نے کہا "شاید" میں نے کہا "مجھ سے شادی کرو گی؟" پوچھا "تمہاری آمدنی کیا ہے؟" میں نے کہا "خدا حافظ!"

مرد: (قہقہہ لگاتا ہے) خوب خوب۔ ہا ہا۔ کیا نرالے ڈھب کا پریم تھا۔

رنجن: (ہنس کر) اور تو سنو۔ انہوں نے کہا "بائی بائی۔ امید ہے کہ ہماری دوستی میں فرق نہ آئے گا۔

عورت: تم چاہے مانو۔ یا نہ مانو۔ بالکل یہی باتیں ہوئیں۔

مرد: تم دونوں سمجھدار عشق کے قائل معلوم ہوتے ہو۔

عورت: نہیں۔ یہ بات نہیں۔

مرد: پھر کیا، کہو نا، نگاہیں کیوں جھکا لیں؟

عورت: دراصل ہم لوگوں میں شاید پریم تھا ہی نہیں۔

رنجن: خیر جو کچھ بھی ہو۔ مجھے جلد ہی اس بیماری سے صحت ہو گئی۔ یا یوں کہو کہ روٹیوں کے ٹکڑے جوڑنے میں اتنا مصروف ہو گیا کہ دل کے ٹکڑے جوڑنے کی فرصت ہی نہ ملی۔

مرد: شاباش! Iron Cross کے مستحق ہو! بالکل ہیرو!

رنجن: پھر غلط۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں ایک بالکل معمولی آدمی ہوں۔ تمہارا ہیرو

فوراً ہی زندگی میں کامیابی حاصل کر لیتا۔ دولت، عزت اور شہرت سبھی اس کے قدم چومنے لگتی۔ (کرسی ہٹا کر ٹہلنے لگتا ہے) وہ فوراً ماما کے دیے ہوئے روپے ایک تھیلی میں بھر کر اُن کے مُنہ پر پھینک آتا مگر میں ....

عورت: بیٹھ جاؤ۔ ہاں تو تم نے کیا کیا۔

رنجن: میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا بس وہی تیسرے درجے کی کامیابی حاصل کی۔ جی جان دے کر کوشش کی کہ کسی نہ کسی کام میں تو اچھا ہو جاؤں۔ مگر شاید ابھی تک میرا کام مجھے مل نہیں سکا ہے۔ ماما کا قرضہ بھی صرف ایک تہائی ادا ہوا ہے اور اب (لہجہ جذبات کی شدت سے تھرا جاتا ہے)

مرد: اب کیا؟

رنجن: (غصے میں اُبل کر) اور اب ہمیشہ میرے مُنہ پر یہ کالک لگی رہے گی۔ اب میں کبھی بھی ماما کا قرضہ ادا نہیں کر سکتا۔ دیکھو یہ خط۔ لو پڑھو۔

(عورت خط بہ آواز بلند پڑھتی ہے۔ شروع اپنی زبان میں کرتی ہے لیکن دوران میں اس کی آواز ایک بوڑھی عورت کی آواز ہو جاتی ہے)

چھوٹے ٹھاکر۔ جیتے رہو!

تم جن سے ناخوش تھے وہ ایک ایک کر کے مر چکے۔ بیٹی کی موت کے بعد بھیّا بھی چل بسے۔ اب تو شاید اس سارے سنسار میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں۔ بوڑھی ہوں اور اکیلی۔ نہ کوئی غصہ رہا نہ شکایت، جی چاہتا ہے مرنے سے پہلے ایک دفعہ پھر تمہیں دیکھ لیتی۔ مگر جانتی ہوں کہ راجپوت اپنا عہد نہیں توڑتے۔ تمہارے بھیجے ہوئے روپے ایک ایک کر کے بھیّا کے پاس بھیجدئے۔ خیر جہاں بھی رہو سکھی رہو ــــ بہر حال تمہارا احسان مانتی ہوں کہ تم نے مجھے بڑی بھول سے بچا لیا۔

تمہاری
رانی ماں

مرد و عورت: (ایک ساتھ) تمہیں جانا چاہیئے۔

عورت: بے چاری مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔

مرد: مجھے بھی۔ رنجن۔ کیا تم اب بھی اس سے خفا ہو؟

رنجن: وہ میری ماں ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔

مرد: اچھا وہ بھول کیا تھی؟

رنجن: جس دن سے میں نے ماما کے روپے لینا بند کیا، رانی ماں نے بھی بھائی کے روپیوں میں ہاتھ لگانا پاپ سمجھا ہے۔ وہ اب چٹائی پر سوتی ہیں۔ روکھا سوکھا کھاتی ہیں۔ موٹا جھوٹا پہنتی ہیں۔ کہتی ہیں مجھے پرائشچت کرنا ہے۔

عورت: اے سنو۔

مرد: ہاں ڈارلنگ!

عورت: رنجن کو جانا چاہیئے۔ اور اس کا عہد بھی پورا ہونا چاہیئے۔

مرد: ٹھیک ہے۔ رنجن تم ماما کے باقی روپے ہم سے لے لو۔ اور اپنی رانی ماں کو دے آؤ۔

عورت: تم یہ رقم قرض سمجھنا اور جب جی چاہے ادا کر دینا۔ مگر تم ماں کو دکھی نہ رہنے دو۔ اسے لے آؤ۔ اور اس کی سیوا کرو۔

رنجن: نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا، نہ میں تمہارے روپے قبول کر سکتا ہوں۔ نہ ماں گھر چھوڑ سکتی ہے۔

مرد: سوچو نا۔ اگر اس میں ذلت ہے تو تم یہ ذلت اپنے لئے نہیں بلکہ ایک بوڑھی عورت کے لئے اٹھا رہے ہو۔

رنجن: نہیں، میں بھکاری نہیں۔

مرد: بزنس کو بھیک نہیں کہتے۔ دیکھو میرے کارخانے میں ایک کلرک کی خالی ہے۔ میں تمہیں اس پر نوکر رکھتا ہوں۔ کم تنخواہ دوں گا اور اس میں سے قرضے کے روپے

کاٹ لوں گا۔ اچھا چلو سود بھی لگا لوں گا۔ اب ٹھیک ہے۔

عورت: بس بس۔ اب انکار نہیں ہو سکتا۔

رنجن: میں....

عورت: بس اب چپ رہو۔ چلو ڈیر۔ ہم لوگ ابھی رانی ماں کے یہاں اسے لے چلیں۔

رنجن: (گھٹی ہوئی آواز میں) چلو۔

(موٹر کے سٹارٹ ہونے کی آواز۔ موٹر چل رہی ہے)

رنجن: (جذبات سے بھرے لہجے میں) آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میرے سینے سے ایک پتھر ہٹ گیا۔

مرد: (ہارن بجا کر) ہیر ہیر (Hear Hear)

رنجن: (خلوص سے) اور یہ سب تم لوگوں کی بدولت ہے۔ میں آج تک تم لوگوں کو بلکہ تمام دولت والوں کو....

عورت: کیا سمجھتے تھے؟

رنجن: (خوشی سے ہنس کر) جاپانی گڑیاں۔ خوبصورت اور کمزور کھلونے۔

مرد: ہا ہا ہا۔

عورت: اور آج تک ہم لوگ تمہیں ایک پاگل سمجھتے تھے ایک جھکی اور خبطی۔

مرد: ایک Scare Craw ایک ہوّا۔ ایک ایسا ڈھانچہ جو کسان چڑیوں اور جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں رکھ دیتے ہیں۔

رنجن: ہا ہا ہا۔ (دھیما ہو کر) آج شاید ہم دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ آج معلوم ہوا کہ ہم سب اپنے کپڑوں اور اپنی کھال کے نیچے ایک ہیں۔ ایک انسان، ایک جسم، ایک دل، ایک جذبہ۔

عورت: ہیر ہیر (Hear Hear) (موٹر کے ہارن کے ساتھ)

رنجن : مکان آگیا (موٹر کے رُکنے کی آواز ۔ رنجن کی آواز میں بے چینی اور تیزی آجاتی ہے ۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز) آؤ آؤ ۔ تم لوگ بھی آؤ میں جب تک رانی ماں کو ڈھونڈ کر اطلاع دیتا ہوں ۔ رانی ماں ۔ رانی ماں !

(فیڈ آؤٹ)

مرد : کتنے فالتو تھے پیسے پرانے زمانے کے لوگوں کے پاس ۔ مکان، کیا ایک قلعہ ہے ۔

عورت : ہاں ۔ مگر یہ سب کمرے بند کیوں ہیں ۔ دروازوں پر جالا کیوں لگا ہے ۔

مرد : اتنے بڑے مکان کی دیکھ بھال کے لئے بھی پیسہ چاہئے ۔

عورت : لو ۔ یہ کمرہ تو کھلا ہے ۔

رنجن کی آواز (نزدیک سے) رانی ماں ! رانی ماں !

عورت : کیا ہوا ۔ کیا گھر میں کوئی نہیں ؟

رنجن : کھانا لگا ہے ۔ پوجا پاٹ کا سامان تیار رہے مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا ۔

مرد : ذرا اندر کے کمرے میں تو دیکھنا ۔

رنجن : وہ تو پتا جی کا کمرہ ہے (آواز ذرا دور ہو جاتی ہے) رانی ماں ۔ رانی ماں ۔ (زور سے چیختا ہے) رانی ماں !

(وقفہ)

(غم انگیز میوزک ۔ بہت کم)

مرد : (آہستہ سے) کیسا سکون ہے رانی ماں کے چہرے پر ۔

عورت : (چپکے سے) اور یہ تصویر جس کے قدموں پر رانی ماں کا دم نکلا ہے ۔

مرد : شاید رنجن کے پتا کی ہے ۔ بڑے ٹھاکر کی ۔ کیوں رنجن ۔ چپ کیوں ہو رنجن ؟

رنجن : (بھیانک قہقہہ لگاتا ہے) ہا ہا ۔ ہا ہا ۔ چپ کیوں ہے ۔ روتا کیوں نہیں ، ہنستا کیوں نہیں ۔ ہا ہا ہا ۔ ہاں ہنسوں گا ۔ کیونکہ قسمت مجھ پر ہنس رہی ہے ۔ میں پھر ناکام

رہا۔ تمہاری مدد، تمہارا احسان سب بیکار۔میری گردن ہمیشہ جھکی رہے گی۔(چیختا ہے) لے جاؤ اپنے ذلیل کاغذ کے ٹکڑے۔ مجھے یہ دولت نہیں چاہیئے۔

عورت: (نرمی سے) رنجن۔ رنجن۔

رنجن: (ہانپتے ہوئے اپنے پر قابو پاتا ہے) تم تم۔خیر معاف کرنا۔اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ مگر میں تم سے کہتا ہوں کہ میں ہمت نہ ہاروں گا۔میں کسی کا سہارا نہیں چاہوں گا۔میں کوشش کئے جاؤں گا۔یہاں تک کہ میں ختم ہو جاؤں گا۔ اور لوگ کہیں گے کہ ایک تیسرے درجے کا آدمی مر گیا۔ایک انسان جو ایک فلسفی ہونے کے باوجود ایک تنکا تھا۔جو قسمت کے دھارے میں بہہ گیا۔لیکن اس تنکے نے دھارے سے لڑنے کی کوشش کی۔اور یہ تنکا دھارے سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

(میوزک میں طوفان کا شور۔تھوڑی دیر بعد ایک لمحے کے لئے طوفانی آوازوں کا شور رُک جاتا ہے لیکن پھر چل نکلتا ہے۔پھر رُک جاتا ہے۔پھر چل نکلتا ہے۔اور اسی طرح فیڈ آؤٹ)

جے گوپال

.....عجب آزاد مرد تھا

ہم تین آدمی تھے۔ ویرانے میں چھپے مقام سے ہندوستان کی طرف مشکل گذار راستوں سے جانے کا پربندھ جب ہم نے کیا تو رات بسر کرنے والے اڈوں کا حساب پہلے ہی طے کر لیا تھا۔ بدیشی ایسوسی ایشن کے سکریٹری نے ۱۶۲ میل پر عارضی ہوائی اڈے کے پاس بسی ہوئی بستی میں رہنے والے ہندوستانی کے نام چھٹی دی تھی۔ اگرچہ ہم اس بستی میں دوپہر کے کھانے کے وقت پہنچ گئے پر موٹر والوں نے آگے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ سامنے کی پہاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۱۹ میل سیدھی چڑھائی ہے۔ اور گاڑی کا انجن کمزور ہے۔ وقت مقررہ پر اپنے دیس میں پہنچنے کے لئے ہم بیتاب تھے۔ چھ روز اور پہاڑی جنگلی راستے کی بل کھاتی ہوئی ۸۰ میل سڑک اور اپنا سامان پیدل جانے میں سد راہ تھا۔ چار و ناچار اس رات کو ہم وہاں رہ گئے کوئی اچھے انجن والی موٹر آ گئی تو ۲۵ میل تو لے ہی جائے گی۔

مسٹر شرما کے مکان پر ہی ہمیں ٹرک والوں نے اُتارا تھا۔ اور مسٹر شرما کو ہی ہم ڈھونڈ رہے تھے۔ ساری بستی ہی ناگوں کی تھی۔ جب کسی سے بھی پوچھئے وہ موٹی موٹی

آنکھیں نمایاں کر دیتا - اور ہاتھ سے اشارہ کر کے بتاتا ۔

"کچھ نہیں سمجھا" بستی میں مشکل سے چالیس بانس اور پھونس کے بنے ہوئے گھر تھے بمشکل دس بارہ مرد آرام سے پڑے یا لیٹے ہوئے افیم پیتے نظر آئے ۔ ناگا عورتیں پاس کے جنگل سے لکڑیاں پیٹھ پر باندھے ہوئے یا پیٹھ پر کی ٹوکریوں میں چاول لادے ہوئے آتیں یا ندی سے موٹے بانس کے خولوں میں پانی بھر کر لاتیں۔ ہم بستی کی خصوصیات پر بحث کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک پرانی فلیٹ ، خاکی پتلون اور بنیان نما قمیص پہنے اور منہ میں بانس کا پائپ دبائے دھواں چھوڑتا ایک آدمی صحن میں داخل ہوا۔ ہم نے اس کے ایک قدم کے انداز سے ہی سمجھ لیا کہ یہی اس در و دیوار کا مالک ہے ۔ اور اس لئے جھٹ سکریٹری کی چھٹی نکال کر اسے دی اور کہا کہ یہ مسٹر ٹیری نے مسٹر شرما کے نام دی ہے ۔ لفافہ افسرانہ بے نیازی سے اس نے کھولا اور جھٹ کہا ۔

" ڈیم بلڈی مسٹر ٹیری !" اور وہ بانس کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھ گیا ۔

ایک منٹ کے بعد اس نے ہم سب کو اوپر بلایا ۔ بانس کے فرش پر چٹائیاں بچھائی گئیں ۔ اور اگلے پانچ منٹ میں ہی خوشنما اور بڑے پھولدار پیالوں میں چائے ہمارے سامنے رکھدی گئی ۔

" یہ بستی میں نے آباد کی ہے ۔" اس نے خود بخود کہنا شروع کیا " اور میں ہی یہاں کا بنجی مکھیا ہوں ۔"

" اجی یہ بتاؤ ۔ ہم ٹنگپ کب پہنچیں گے ۔ اور ہیل گیٹ (برما ہندوستان کی سرحد) کب پار کر پائیں گے ؟" میرے بیتاب ساتھی نے پوچھا ۔ کیونکہ اس کے پاس کی میعاد صرف چھ روز اور تھی ۔

" ابھی تو آپ میرے مہمان ہیں ۔ کئی دنوں کے بعد کچھ باتیں جاننے والے دوستوں سے واسطہ پڑا ہے ۔ میں کوئی بیکار تو اس جنگل میں نہیں بیٹھا ۔ میں آئی این اے میں تھا

میرے بہت سے ساتھیوں کی ہڈیاں ان پہاڑیوں اور جنگلوں میں پڑی سڑ رہی ہیں۔ پنجاب میں میرا گھر بار اور بھائی بہن ہیں۔ ایف اے تک میں پڑھا ہوں۔ اور تو اور میری منگیتر آج میرا انتظار کر رہی ہے۔ پر ان لوگوں کو میرا خاک پتہ چل سکتا ہے۔"

اس کی کہانی مشین کی طرح چل رہی تھی۔ اتنے میں ایک بھاری آواز جانور کے بولنے کی آئی۔ اور اس کی ناگا عورت نے جو پیٹ میں بچہ ہونے کی وجہ سے کم ہلتی تھی۔ اندر سے کچھ ناگی زبان میں تیزی و طراری سے کہا۔ وہ فوراً وہیں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہم سب کو بلا کر کھڑکی سے باہر دکھانے لگا۔

"وہ بھینسا دیکھا آپ نے؟" ایک سفید بھورے رنگ کا جوان بھینسا درخت کے نیچے بندھا ہوا تھا۔ "تین دن بعد ہم اسے بنائیں گے۔"

جھٹ ہی ہمارے ایک ساتھی نے قدرے گھبراہٹ سے پوچھا۔

"پھر کیا کرو گے؟"

اُدھر دیکھتے ہوئے ہی اس نے کہا۔ "کھائیں گے۔ پرشاد بانٹیں گے۔ آپ کو تب تک یہیں رہنا ہو گا۔ ہم ناگوں کی رسم ہے۔"

ہم نے اس دلچسپ کہانی کی طرف دھیان دینے کی بجائے اس پر اس بات کی اہمیت کا احساس کرانا ضروری سمجھا کہ ہمارا اس بستی سے جلدی سے جلدی جانا بہت ضروری ہے۔ موٹر کے ملنے کا تو کوئی بھی بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے پھر یقین دلایا کہ پی ڈبلیو ڈی کی موٹر آ رہی ہے۔ اور ایس ڈی او ہندوستانی ہے۔ وہ آپ کو ضرور اس جگہ چھوڑ آئے گا۔ جہاں تک سڑک بنی ہے۔

ہمیں وہ بستی کی سیر کرانے کو لے گیا۔ اب اس کا انداز گفتگو اور رنگ ڈھنگ اس طرح تھے جیسے وہ یہاں کا راجہ ہو۔ پہلی عورت ہی جو سامنے آئی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ کہ یہ اس علاقہ کے چیف کی سالی ہے۔ تھوڑے دنوں میں

اس سے شادی کروں گا۔ اور وہ سامنے والا مکان میں نے اس کے رہنے کے لئے بنوا دیا ہے۔"

ابھی ہم مشکل سے چند گز گئے ہوں گے کہ ایک مکان کا بانس کا فرش کرٹکر کر تا زور زور سے ہل رہا تھا۔ اور کئی نسوانی آوازیں کلکاریاں مارتی ہوئی آرہی تھیں۔ پانچ چھ جوان لڑکیاں ہانپتی اور بھاگتی ہوئی باہر آئیں۔ جیسے بھیڑوں کے ریوڑ کے پیچھے کوئی شکاری کتا اور شکاری بھی پیچھے بھاگتا ہوا آرہا ہو۔

"یہ پی ڈبلیو ڈی کا کلرک ہے۔ اور یہ مکان ہے۔ یوں سمجھ لو جیسے پنجاب میں کنواریوں کا کوٹھا ہے۔ بات یہ ہے بستی میں بمشکل دس بیس مرد ہوں گے۔ اور عورتیں ہیں ستر سے بھی اوپر۔ اس طرح سے کنواریوں کے کوٹھے ہر بستی میں دو یا تین آپ کو ضرور ملیں گے۔ ناگاؤں کی بیاہی عورتوں کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ اور کنواری کا جو جی چاہے کرے۔ اسے کھلی چھٹی ہے۔ ایسا ناگاؤں کا دستور ہے۔"

ہم پاس کی ندی کی سیر کر کے واپس آ گئے۔ اس نے ناگاؤں کی کئی باتیں ہمیں سنائیں۔ یہ لوگ ساچن (افیم) کی ناجائز تجارت کرتے اور کافی روپے کما لیتے ہیں۔ آج کل جنگل سے ایام جنگ کے بچے کھچے پرانے زنگ آلودہ موٹر کے پرزے ڈھونڈ لاتے ہیں۔ اور جو مول ملے بیچ دیتے ہیں۔ کوئی کوئی اس ندی کی ریت سے دن بھر میں روپیہ دو روپیہ کا سونا بھی نکال لیتے ہیں۔ ان کی بڑی خواہش ہے ہندوستان کے ساتھ ملنے کی۔ کیونکہ وہاں ناگے بہت ہیں۔

پہلے یہ لوگ ننگے رہا کرتے تھے اور دشمن کا سر کاٹ لاتے تھے اور گھروں میں سجا دیتے تھے۔ اب پرانی باتیں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں۔

اپنی باتوں پر یقین دلانے کے لئے وہ سیدھا ایک گھر میں گھس گیا۔ "وہ دیکھو سامنے ہیڈ ہنٹنگ کی بات"۔ دیوار پر لگے ہوئے بھینسوں کے سینگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"اب آدمی کی جگہ بھینسے نے لے لی ہے" اور اس آدمی اور اس عورت کا پہناوا بھی دیکھ لو"۔ ایک ادھیڑ عمر کے افیم کے مارے ہوئے آدمی نے کمر سے گھٹنوں تک کسی درخت کی چھال باندھ رکھی تھی۔ اور عورت نے لتے ہی جسم پر ایک بوسیدہ ٹکڑا کپڑے کا۔ اس کے اوپر کے جسم کا حصّہ ننگا تھا۔ وہ جوان اور مضبوط تھی۔ اس کے جسم پر چٹکی بھرتے ہوئے اس نے کچھ ناگا زبان میں کہا۔ اور وہ ہنس دی۔ ہم جھینپ گئے۔

رات کو چاول اور ترکاری ایک لڑکی ہمارے سامنے رکھ گئی۔ اس نے الماری سے ایک برانڈی کی بوتل نکالی۔ اور چار گلاسوں میں چار پیگ انڈیل دیئے۔ اب وہ ہم سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ اور اس کا پنجابی رنگ نکھر رہا تھا۔ ہم نے دن کی بحث کو چھیڑا۔ آخر اس کا مقصد کیا ہے۔ اس دور دراز کنارے پڑی جنگلی بستی میں رہنے کا؟

شراب کو حلق سے نیچے اُتارتے ہوئے بولا۔ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

از راہ مذاق ہم میں سے کسی نے کہا۔

"ہندو تو کہتے ہیں کہ جنم پھر ہوتا ہے اور ناگے بھی یہی مانتے ہوں گے"۔

"ہاں ہاں" وہ بولا "اور ناگے اسی لئے اپنے مردے کو اپنے گھر کے نیچے ہی گاڑ دیتے ہیں"۔

"تو پھر ہوئی نہ بات۔ عالم دوبارہ است"۔

وہ پھر مسکرا دیا۔ "تو پھر جوانی دوبارہ نیست"۔

ہم ذرا اور بھولے بن گئے تھے کہ اس سے کچھ اور نکال لیں۔ اب وہ پنجابی کا ایک شعر گنگنایا۔ ؎

تیرے پچھے سوہنے دو سونٹے کنڈا
بارہ آنے خرچ کر کے دوائی دمڑا

اور اب جو لڑکی چاول ڈالنے آئی تھی اس کے گالوں پر ہلکی سی چپت اس نے جما دی۔ باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ہمیں آرام کی جگہ بتا کر وہ باہر جانے کے لئے تیار ہو پڑا ہمیں پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پر اس نے خود ہی کہا۔

"رات کو ایرو ڈروم پر ہرن آتے ہیں!"

دوسرا دن اور دوسری رات بھی اسی بستی میں کٹے۔ ہم سارا دن آنے والی لاری، یا ٹرک کی راہ دیکھتے رہے۔ اندھیرا پڑنے پر ایک ڈین کیرر آیا۔

اس میں ایس، ڈی، او تھا اور اس نے اسی سے ہمارا تعارف کرایا۔ آدمی زندہ دل تھا۔ تین لڑکیاں ساتھ بٹھا لایا تھا۔ وہی ندی، وہی جھونپڑی اور ہم تین مسافر اور ہمارا بوجھ! پی، ڈبلیو، ڈی کا کلرک بھی کبھی اس کنوار کوٹھے میں جا گھستا۔ ایک لڑکی جو دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔ اس کے پاس جا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور اس کے کانوں میں گنے کی پوری کے برابر جو بڑے پتھر پڑے تھے۔ انہیں سہلانے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا کلرک آ گیا۔ اسی لڑکی کی گود میں دونوں طرف وہ بیٹھ گئے۔ جب ہم نے نمبردار کو یہ نظارہ سُنایا تو وہ خوب ہنسا اور کہنے لگا۔ "یہ ہے آزاد دُنیا" اور اس نے کہا: "آزاد دنیا کے نعرے کے صلے میں ایک پیگ اور....."

یہی بات اس نے رات کے کھانے کے وقت دُہرائی۔ ہم نے لمبے ہندوستان میں بھودان کے تحریک کے بارے میں کچھ بتایا۔ اس نے کہا: "نہیں نہیں۔ جب تک عورت قید ہے کوئی دان نہیں چل سکتا۔ کنیا دان اور اب بھودان۔ یہ کیا ہے سب۔ تم یہ نعرہ اپناؤ۔ اور جتنی بندشیں ہیں توڑ دو۔ اور دیکھو لوگ حقیقی طور پر آزاد ہو جاتے ہیں یا نہیں۔ اس موزونیت کا نام چاہے کچھ رکھ لو۔"

ہم سب مسکرا دئے۔ ہم نے صبح ایک ساتھی کو پہلے تھوڑے سے سامان سے روانہ کر دیا تھا۔ اس لئے کہ کہیں وہ مقررہ دن تک نہ پہنچے تو کچھ حرج نہ ہو۔ سارا دن شرما کے آنگن

میں چاولوں سے شراب کشید کی جاتی رہی۔ شراب بنانے میں لڑکیاں محو تھیں، جب کسی کے پاس سے وہ گذر جاتا وہ ہلکی سی چیخ نکال دیتی اور کبھی نرم نرم ہاتھوں سے ایک آدھ تھپڑ بھی ٹکا دیتی۔

"ایک پیگ اور..... تو صاحب یہ جول آپ نے یہاں اپنایا؟ تو اب اس نے تیسرا گلاس چڑھایا تھا اور نشے کی لال ڈوری اس کی آنکھوں میں آگئی تھی۔ جو لڑکی ایک بار سوئی سے پانی یا دال چاول دینے آتی۔ وہ اندر جا کر اپنے گالوں کو سہلاتی یا دکھتے ہوئے سینے پر ہاتھ پھیرتی رہتی۔ اور دوسری دفعہ کسی دوسری کو بھیجتی۔ واجد علی شاہ پورے جوبن پر تھا۔ اردو، فارسی اور پنجابی کے اشعار اس کے منہ سے بے ساختہ نکل رہے تھے۔ اس کی تمہید تھا سے

مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

وہ لودھیانہ میں جب ایف اے میں پڑھتا تھا تو ایک مالی کی لڑکی کو لے کر بمبئی بھاگ گیا۔ اور مجبوراً جب واپس آنا پڑا تو لڑکی چھت سے چھلانگ لگا مر گئی۔ وہ لڑائی میں بھرتی ہو گیا۔ پھر آئی این اے میں وہ ملایا کی لڑکیاں اور ان کی ہیر ڈریسنگ سیلونس آج بھی اسے یاد آتی تھیں۔ برما کے ان ہی جنگلوں میں اور ان ہی پہاڑیوں میں مادر وطن کو آزاد کرانے کا جذبہ زور سے بھڑکا۔ مگر افسوس.....

وہ قید ہو گیا۔ دلی لایا گیا۔ اور جب آزاد کیا گیا تو لودھیانہ جا کر چند روز ہی رہا۔ اور پھر آ گیا اب جگہ سات برس سے اسی جگہ ہے۔

اب اس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "میں نے آپ کو غلط بتایا تھا کہ پنڈت جی نے خاص کام سے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ میں تو ان ناگاؤں کو ایک کر رہا ہوں۔"

"ان ناگاؤں کو" اس نے زبان اور ہونٹ چبا کر کہا۔ اور بجلی کی طرح کوند کر دروازے کے پاس کھڑی لڑکی کو اٹھا لایا اور اپنی ٹھوڑی سے اس کے ابھرے ہوئے

سینے کو گدگدانے لگا " میں ان کو ایک کروں گا۔ ان کو زبان دوں گا۔ اور ان کی فوج کے آگے آگے سینہ تان کر چلتا ہوا ہندوستان کو فتح کر دوں گا۔ ہم آزاد ہند بنانے والے ہیں۔ ہم سے دھوکا ہوا ہے۔ اس دھوکے کا میں بدلہ لوں گا۔ مجھے بہت جلد ناگاؤں کا ایک بڑا لیڈر ہندوستان سے ملنے آرہا ہے۔ میرے پاس ہی سے ہاتھی پر سوار ہو کر دوسرا لیڈر گیا ہے۔ میں نے بہت سے آدمی دنیا کے ہر حصہ میں بھیج رکھے ہیں " اب وہ تیز تیز کہتا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک اور حسینہ اندر داخل ہوئی اس نے قدرے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کھانا چھوڑ کر وہ ایک زنج پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کے بال کھینچے۔ اس کی گردن کو دبوچا۔ اس کی انگلیوں کو مروڑا۔ اور پھر ناگی زبان میں ہماری بابت کچھ کہا۔ اور ہمیں کہنے لگا۔

" تمہیں سفر کے لئے گاڑی چاہیے تھی۔ لو یہ ٹیکسی آگئی ہے "

ہم میں سے ایک بول اٹھا۔ " سچ مچ۔ یہ تو وین کیریر ہے "

لڑکی نے بائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنے دائیں ہاتھ کی کلائی کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے اس سے پوچھا۔ " کیا یہ گھڑی مانگتی ہے ؟ "

" نہیں " وہ بولا۔ " یہ کہتی ہے کہ سونے کے کنگن بنوا دو "

ہم حیران تھے کہ گہنوں کا شعور اس ناگا لڑکی کو کیسے ہوا؟ اس نے بتایا کہ یہ لڑائی کے دنوں میں آسام سے چینیا تک فوجیوں کو محظوظ کرتی رہی۔ اس سے بہت سی باتیں کرنے کے بعد وہ چلی گئی۔ جاتے جاتے زور سے ہنسی۔

رات کافی ہو گئی تھی۔ ہمیں نیند آرہی تھی۔ پر اس کو نیند کہاں ؟ وہ ایک پرانی چٹھیوں کا پلندہ اٹھا لایا اور ہمیں سنانے لگا۔ پھر اسے یاد آیا کہ ابھی ابھی وہ لڑکی سونے کی فرمائش کر گئی ہے۔ وہ اندر گیا۔ اس کی بیوی ابھی سوئی نہیں تھی۔ دو چار منٹ دونوں کی تلخ کلامی سنائی دی۔

جب وہ کمرے سے باہر آیا تو کہہ رہا تھا: "کم بخت تم بکڈ ہو۔ اور میں نے تمہارا ٹھیکہ تھوڑے ہی لے رکھا ہے؟ اگر ٹھیکہ لینا تھا تو ہندوستان ہی میں رہتا۔"

وہ اندر سے کچا سونا لایا تھا۔ اس نے وہ ہمیں دکھایا اور جیب سے ایک دس روپے کا نوٹ نکال کر اس میں اُسے بُری طرح لپیٹ دیا۔ اور کہنے لگا۔ جاتے ہی یہ اس نوٹ سمیت ...... اور پھر وہ کہنے لگا۔

"وہ سالا ایس' ڈی' او۔ تین لے کر پڑا ہے۔ اس سے کہوں گا دو آپ کے لئے بھیجدے۔" اور وہ نکل گیا۔

My dear

[illegible] who is going through this book. Read this book carefully [illegible] as later [illegible]

[illegible]

بسمل سعیدی

نغمۂ آزادی

آج ہم آزاد ہیں ہندوستاں آزاد ہے
یہ زمیں آزاد ہے یہ آسماں آزاد ہے
اوجِ آزادی پہ ہے جمہوریت کا آفتاب
آج جو ذرہ جہاں بھی ہے وہاں آزاد ہے
جسمِ آزادی میں ہے جمہوریت کا خونِ گرم
آنکھ ہے آزاد، دل آزاد، جاں آزاد ہے
ملک میں نافذ ہوا اس طرح جمہوری نظام
جیسے قیدِ جسم میں روحِ رواں آزاد ہے
مٹ چکا ہے آج سے فرقِ بلند و پستِ ملک
ہند از تحت الثریٰ تا لامکاں آزاد ہے
امتیازِ لالہ و گل ہے نہ فرقِ خار و خس
سایۂ ابرِ بہارِ گلستاں آزاد ہے

ذرّے ذرّے کو ملی ہے وُسعتِ برِّ عظیم
قطرہ قطرہ مثلِ بحرِ بے کراں آزاد ہے
اب ہوائے شرق سے گونجے فضائے غرب تک
نعرۂ جمہوریِ ہندوستاں آزاد ہے
جتنی ہم چاہیں پیئیں اور جتنی وہ چاہے پلائے
میکدہ آزاد ہے، پیرِ مغاں آزاد ہے
نفع ہے تو باہمی، نقصان ہے تو باہمی
ملک از اندیشۂ سود و زیاں آزاد ہے
گُردوارے پر، کلیسا پر، حرم پر، دیر پر
چاہے جس منزل پہ ٹھہرے کارواں آزاد ہے
کل قفس تھا جس قدر وابستۂ آلامِ زیست
آج اس سے بھی زیادہ آشیاں آزاد ہے
مدتوں کم بخت اسیرِ باغِ ہندوستاں رہی
اب جہاں چاہے چلی جائے خزاں آزاد ہے
عقل اور اخلاق کی حد میں ہیں یوں آزاد ہم
مُنہ کے اندر جس طرح اپنی زباں آزاد ہے
اللہ اللہ بسملؔ آزادی کی ذمہ داریاں
آدمی کم بخت دُنیا میں کہاں آزاد ہے

روشن صدیقی

اے کشورِ ہندوستاں

اونچا رہے تیرا نشاں!
اے کشورِ ہندوستاں

اے خلد سے لائی ہوئی رنگیں بہاروں کے وطن
کوثر ہے جن میں موجزن اُن آبشاروں کے وطن
نازاں ہے جن پر ایشیا' اُن کوہساروں کے وطن
ہے کیف تیرے سامنے' افسانۂ باغِ جناں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

تھا زندگی کے نور سے معمور کاشانہ ترا!
اے شمعِ تہذیبِ کہن! عالم تھا پروانہ ترا
خورشید و انجم کو ابھی ہے یاد افسانہ ترا
وہ عہدِ زریں آج تک بھولا نہیں ہے آسماں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

ہم دوشِ شیخ و برہمن اُٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمعِ وطن اُٹھے ہیں تیری گود سے
غازی، مجاہد، صف شکن اُٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج خضرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

حُبِّ وطن کی لہر ہے بیگانۂ زنجیر پھر
ہلنے لگی ہے ظلم و استبداد کی تعمیر پھر
آزادیوں کے خواب ہیں دامن کشِ تعبیر پھر
پھر انقلابِ دہر نے بدلا ہے اندازِ جہاں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

پھر شعلہ افشاں زمزمے آتش زنِ مضراب ہیں
پھر ولولوں کی تیز موجیں عالمِ سیلاب ہیں
پھر نوجوانِ ہند کی ہر سانس میں بیتاب ہیں
بیداریوں کے قافلے، آزادیوں کے کارواں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

ہے زیبِ دامانِ شفق، خونِ شہیدانِ وطن
گہوارۂ خورشید ہے، چاکِ گریبانِ وطن
پیغمبرِ صبحِ وطن ہیں نوجوانانِ وطن،
اُفتاں و خیزاں بھاگتی جاتی ہیں سب تاریکیاں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا رہے تیرا نشاں

جنت کو پھر تیری فضاؤں میں بسایا جائے گا
آزادیٔ افکار کا مژدہ سنایا جائے گا
انسانیت کا تجھ کو گہوارہ بنایا جائے گا
وہ دن بہت نزدیک ہیں از فضلِ ربِّ دوجہاں
اے کشورِ ہندوستاں! اونچا ہے تیرا نشاں

بسمل سعیدی

ہردوار

پہلی کرن بہارِ سحر کو ہسار سے
پڑتی ہے رنگِ نور کے نصف النہار سے
جو صبح بخشتی ہے بنارس کو شہر میں
بسمل طلوع ہوتی ہے وہ ہردوار سے

منورؔ لکھنوی

اے داعیانِ انقلاب

کہیں وجود کی بنیاد ہی نہ ہل جائے
ذرا سنبھل کے نظامِ کہن کو ٹھکرانا

جس انجمن نے سفر کے لئے کیا تیار
قدم قدم پہ اسی انجمن کو ٹھکرانا؟

اگر نہیں ہے یہ دیوانگی تو پھر کیا ہے
قفس سے پا کے رہائی چمن کو ٹھکرانا

کہاں سے سیکھ لیا ہے یہ رنگِ موجِ شمیم
روش روش پہ یہ سرو و سمن کو ٹھکرانا

جو عاشقی کا ہو سودا تو کیا ضروری ہے
ذلیل نل کو بنانا دمن کو ٹھکرانا

گزر کے دشت و دمن سے یہ وحشتیں کیوں ہیں
نہیں درست یہ دشت و دمن کو ٹھکرانا

یہ کیا مذاق ہے نقد و نگاہ کا آخر
گہر کی قدر نہ کرنا عدن کو ٹھکرانا

جو تشنگی کو مٹائے وہ جام ہو بے قدر
یہ کیا ہے کام ردائے دہن کو ٹھکرانا

یہ کیوں ہے تختۂ النسریں پہ قہر کی بارش
یہ کیا ہے جلوہ گہِ نسترن کو ٹھکرانا

حصولِ مشک پہ یہ بد دماغیاں توبہ ! حذر غزال سے کرنا ، ختن کو ٹھکرانا
ہوئی ہے جس سے ترے بازوؤں کی آرائش اسی کی زلفِ شکن در شکن کو ٹھکرانا
وقارِ کوثر و تسنیم ہو کبھی مضروب کبھی تقدّسِ گنگ و جمن کو ٹھکرانا
ملا ہو جس سے تجھے قصر و جامۂ زرتار اسی غریب کے گور و کفن کو ٹھکرانا

کرے گا تجھ کو مقدّر سپردِ رسوائی
وطن میں پل کے یہ تیرا وطن کو ٹھکرانا

بسمل سعیدی

لاعن آزادی سے

باش او بیزارِ آزادی غلامِ عارِ ملک
کوچۂ ننگِ بنی نوعِ بشر کے ہرزہ گرد
اپنی بربادی کے او ماتم گسارِ یاوہ گو
ہم سنیں گے خود تجھی سے تیری بربادی کی فرد

ہاں بتا جہدِ معیشت میں اس آزادی سے قبل
سر کئے ہیں تو نے کتنے معرکہ ہائے نبرد
رک گئے ہیں اب ترے کیا کاروبارِ خانگی
پڑ چکا ہے آج کیا تیرا سیہ بازار سرد

بازیٔ دولت میں کیا پڑتا نہیں اب تیرا داؤ
کیا بساطِ زر پہ اب رقصاں نہیں ہے تیری نرد
کیا تری چاندی کا چاند اب پڑ گیا پہلے سے ماند
کیا ترے سونے کا سورج ہو گیا ہے آج زرد

سن کہ آزادی ہے ان حالات کی رہنِ کرم
عرش لرزے میں ہے جن سے زلزلے میں جن سے ارض
زمہریر ان کو سنے گا تو دمے اٹھے گا لو
منکشف ہونگے جہنم پر تو پڑ جائے گا سرد

حریت ہے رہن منت آج ان احرار کی   آہ وہ مظلوم لیکن، واہ وہ آزاد مرد

حشر تک تاریخ کے لب پر رہے گی جن کی آہ
تا ابد محفوظ دل فطرت رکھے گی جن کا درد

مرحمت جو کر گئے ہم کو حیاتِ جاوداں   جانبِ ملکِ عدم ہوتے ہوئے بھی رہ نورد

سوچ اب دل میں کہ زیرِ چرخ و بالائے زمیں
ہے کوئی افرادِ انسانی میں تجھ سا اور فرد

اشرف المخلوق عالم کے افق پر نجمِ نحس   او جبینِ مجدِ انسانی کے آئینے کی گرد

ہمچو تو نالائقے در صلبِ آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیسِ ملعوں سجدہ پیش او نہ کرد

کرشن موہن

سیمیں سویرا

شبِ ماہ کا یہ جمالِ درخشاں — یہ تنویرِ رقصاں
فقط اک طلسمِ حسیں ہے
نہ اُلجھاؤ مجھ کو طلسمِ حسیں میں
غمِ جانگزا کے گھنیرے اندھیرے
مری زندگانی پہ چھائے ہوئے ہیں
یہ ماہِ درخشاں
مری بے کسی کا مداوا نہیں ہے
مری بے کسی اور اُداسی کی پالی ہوئی ظلمتوں کو
ضیاؤں میں تحلیل ہونا نہیں ہے

یہ تابندہ تارے
مرے قلبِ مجہور کے داغ ہیں — اور کیا ہیں؟

کسی اپسرا نے بچھائی ہوئی ہے
جو یہ موہنی شاہرہِ کہکشاں کی
مری راہ سے مجھ کو بھٹکا رہی ہے۔
فقط اک سراب حسیں ہے
سراب حسیں میرا ملجا و ماویٰ نہیں ہے
مری بے بسی کا مداوا نہیں ہے
میں کیسے چراغ سرِ راہ کو اپنی منزل سمجھ لوں

نہیں چاہیے کہکشاں زار مجھ کو
نہیں چاہئیں مجھ کو گُل ریز راہیں
عروسِ چمن کی دل آویز بانہیں
مصائب کے اونچے پہاڑوں سے ہو کر گذرنا ہے مجھ کو
مری راہ میں دشت و صحرا دریدہ دہن ہیں

یہ چاند اور ستارے — فریبندہ شمعیں
فقط اک سرابِ حسیں کے ہیں ذراتِ رخشاں
مجھے تو اک ایسی ضیائے دل افروز کی جستجو ہے
جو میری اُداسی کی تاریک شب کو نگل کر
اُفق کے کنارے دوامی مسرت کا سیمیں سویرا بچھا دے

گوپال مِتّل

صبحِ کاذب

یہ جو اِک نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
کون کہتا ہے اسے صبحِ درخشاں اے دوست
مجھ کو احساس ہے باقی ہے شبِ تار ابھی
لیکن اے دوست مجھے رقص تو کر لینے دے
کم سے کم نور نے الٹا تو ہے اک بار نقاب
ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار
اس سے ثابت تو ہوا صبح بھی ہو سکتی ہے
پردۂ ظلمتِ شب چاک بھی ہو سکتا ہے
صبحِ کاذب بھی تو ہے اصل میں دیباچۂ صبح
صبحِ کاذب بھی تو ہے صبحِ درخشاں کی نوید
ایک اعلان کہ ہنگامِ وداعِ شب ہے
قافلہ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
جلد ہونے کو ہے خورشیدِ درخشاں کی نمود

سنہ ۱۹۴۸ء

رعنا جگی

منکرانِ بہار

ہر یقیں کو گماں سمجھتے ہیں
آگ کو بھی دھواں سمجھتے ہیں
ہیں کچھ ایسے بھی لوگ جو ضد سے
فصلِ گُل کو خزاں سمجھتے ہیں

پروفیسر آغا صادق

منکرانِ صبح

بجلی کو اسیرِ دام کہنے والو
کرنوں کو سیاہ فام کہنے والو
تغلیطِ حقائق تو زوالِ فن ہے
روزِ روشن کو شام کہنے والو

کرشن آشو

نئی جوت

کتنے جیون دیپ بجھا کر
ایک سہانی جوت جلائی
اُجلی اُجلی
پیاری پیاری
نیاری نیاری
نور کا اک فوّارہ جیسے
جھل مل کرتی کرنیں پھوٹیں
چمک اُٹھا دھرتی کا کن کن
ڈگر ڈگر ہے روشن روشن
نگر نگر ہے جگ مگ جگ مگ
دمک اُٹھے ہیں
پورب، پچھم، اتر، دکھن

جوت جلی ہے
جوت جلی ہے
جوت جلے گی
کتنے ہی طوفاں گذرے ہیں
کتنے ہی طوفاں گذریں گے
لاکھ اُٹھیں گے سُرخ بگولے
دم دم بڑھتا ہوا اندھیرا
جوت مگر یہ بجھ نہ سکے گی
جوت جلی جلتی ہی رہے گی
بیری لاکھ جتن کر دیکھیں
اس جوتی کے ہم رکھوالے
اسے بجھائے کس کی ہمّت
دن بیتیں گے جگ بدلیں گے
جوت جلے گی
جوت جلے گی

گوپی ناتھ امن

کمیونٹی پراجکٹ

دیہات میں تعمیر کے جذبے کو ذرا دیکھ   آ اور ذرا ہندِ حقیقی کی فضا دیکھ
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ
زردار ہیں کنگال ہیں چھوٹے ہیں بڑے ہیں   سب جذبۂ تعمیر سے سرشار کھڑے ہیں
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ
معصوم حسینوں کی یہ ہنستی ہوئی محنت   نوخیز جوانوں میں مشقّت کی رقابت
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ
باتوں سے نہیں، ہاتھوں سے ہوتا ہے یہاں کام   اس دور میں تونے کہا ہے باتوں سے کہاں کام
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ
تو قصرِ ہوائی کے بنانے کا ہے مشّاق   یہ گاؤں کے حالات بدلنے کے ہیں مشتاق
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ
ہے تیری غرض روز نئے فتنے اُٹھانا   یہ چاہتے ہیں گاؤں کو گلزار بنانا
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ

ہے جلسے جلوسوں میں ترے دن کا تصرف   یہ محوِ مشاغل ہیں تو تو محوِ تاسف
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ

سرشارِ وطن یہ ہیں کہ تو مجھکو بتا دے   معمارِ وطن یہ ہیں کہ تو مجھکو بتا دے
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ

کیوں غیر ممالک کا پرستار ہوا ہے   نظریں تو اُٹھا دیکھ ترے ملک میں کیا ہے
اے نعرہ زن، اے نعرہ زن، اے نعرہ زن آ دیکھ

جگر مرادآبادی

غالبؔ

اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ
قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا رشکِ ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے
اک جنتِ شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ

ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن
ہر خار ترے دشت کا انگشتِ شفق رنگ

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے
ہم نغمہ و ہم دشنہ و ہم نکہت و ہم رنگ

تو نے اسے گنجائشِ کونین عطا کی
ہر چند بہت تھا ابھی دامانِ غزل تنگ

اِک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحوں
اک موجِ نفس میں ترے رقصاں جمن و گنگ

عرفیؔ و نظیریؔ و ظہوریؔ و فغانیؔ
تیرا کوئی ہمسر نہ ترا کوئی ہم آہنگ

تھے ملکِ سخن میں ترے ہمعصر ہزاروں
تنہا تھی تری ذات مگر صاحبِ اورنگ

تو نظم میں بھی نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

الحق کہ تری وسعتِ تخئیل کے آگے
صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ

عرشؔ ملسیانی

غالبؔ

لوگ کہتے ہیں کہ اجداد پرستی نہ کرو
یہ زمانہ نہیں اجداد پرستی کے لئے
کیف آور ہے ہر اک جرعۂ مے تازہ کا
مے کہنہ ہی تو لازم نہیں مستی کے لئے

صفحۂ دہر پہ چھوڑو نہ کوئی نام سلف
کار نیک اس سے بڑا اور نہیں ہے کوئی
توڑ دو عظمتِ ماضی کے سبھی کہنہ صنم
نعرہ اب اِس کے سوا اور نہیں ہے کوئی

شور ہر سمت ہے اب وقت ٹھہرنے کا نہیں
نام اسلاف مٹادو تو بڑا کام کرو
کہنہ افکار کی تعمیر تو بوسیدہ ہے
اِس گھروندے میں نہ اب بیٹھ کے آرام کرو

لوگ کہتے ہیں کہ ناقص ہے ہر اک رسم کہن
سابق انداز سے تنظیم ریاست نہ رہے
لحظہ لحظہ متغیر ہیں زمیں اور زماں
کل جو تھا آج وہ آئینِ سیاست نہ رہے

ادبِ نو کے تقاضے بھی کچھ ایسے ہیں کہ اب
کہنہ قدروں کے پرستار نہیں جی سکتے
ہنس کے کہتی ہے یہ برنائیِ افکارِ جدید
اے قدامت ترے بیمار نہیں جی سکتے

پھر بھی کچھ بات ہے یہ محض عقیدت ہی نہیں
لطف دیتا ہے ہمیں عرفی و طالب کا کلام
مارکس کی مہر نہیں اس پہ مگر اس پر بھی
روح افزا و دل افروز ہے غالب کا کلام

جعفر علی خاں اثر

ضمیر اور انقلاب

جلوہ دکھا کے چھپتی ہے قوسِ قزح ہنوز
تصویرِ حسن پھول ہے اب تک گلاب کا
لبریزِ انبساط ہے تاروں کی انجمن
گاتی ہے موجِ بحر ترانہ شباب کا
ہر صبح مہر ہوتا ہے اس طرح جلوہ گر
جیسے چھلک رہا ہو پیالہ شراب کا
لیکن بشر کہ جس کے لئے ہے یہ اہتمام
غفلت سے ہے شکارِ غمِ بے حساب کا
صورت بھی واقعات کی بدلی تو کیا اثر
مرکز اگر ضمیر نہیں انقلاب کا

اسد ملتانی

نیا ادب

نہ پاسِ خلق، نہ خوفِ خدا، نہ شرمِ نبی
نیا ادب ہے کہ سعیٔ فروغِ بے ادبی

ہوائے نفس کی تصویرِ شوخ و عریاں کو
کہیں حیات کا آئینہ، وائے بوالعجبی!

بیانِ حال میں پنہاں ہے آرزومندی
ہے احتساب کے پردے میں مدّعا طلبی

یہ چاہتے ہیں کچھ ایسی مکمّل آزادی
کہ جس کے دور میں کوئی بدی رہے نہ دبی

ہے سر میں ہوش بہ اندازۂ پریشانی
ہے دل میں جوش بمقدارِ بادۂ عنبی

یہ زندگی ہے کہ دنیائے دل کی بربادی
یہ روشنی ہے کہ فکر و نظر کی تیرہ شبی

وہ بوالہوس بھی جنہیں جرأتِ گناہ نہیں
ادب میں ڈھونڈ رہے ہیں علاجِ تشنہ لبی

نئے ادب میں چمک اور تپش سہی لیکن
وہی کہ اصل ہے جن کی شرارِ بولہبی

جدید بھی تو نہیں یہ ادب کہ ہے اس میں
وہی قدیم ہوس جوئی و طرب طلبی

پھر ایک بار بہ فیضِ فرنگ اُبھرا ہے
دبا ہوا ادبِ جاہلیّتِ عربی

اسدؔ "ادیبِ ترقی پسند" سے کہہ دو
رہے تجھی کو مبارک فریبِ خوش لقبی

تلوک چند محروم

سرخ سویرا

اے شاعرِ امروز نگاہوں کو تری کیوں
آتا ہے نظر سرخ سویرا بہت اچھا
آبادی و ویرانہ میں جو آگ لگا دے
اس سرخ سویرے سے اندھیرا بہت اچھا

گوپی ناتھ امن

سرخا سرخ شاعری

سرخ کلیاں، سرخ پتے، سرخ پھول
سرخ طوفاں، سرخ آندھی، سرخ دھول
اور ہر سرخی میں سرخی شراب
انقلاب و انقلاب و انقلاب

مخمور سعیدی

اے جنّتِ کشمیر

کھلتے ہوئے رنگین چمن دیکھ رہا ہوں
فردوسِ نظر دشت و دمن دیکھ رہا ہوں
ہر سمت بہاروں کی پھبن دیکھ رہا ہوں
اک خُلد تصوّر ہے ترے حُسن کی تصویر
اے جنّتِ کشمیر

ہر پھول یہاں غیرتِ گلزارِ عدن ہے
ہر خار یہاں رشکِ صد سرو و سمن ہے
تو خُلد کی رنگین بہاروں کا وطن ہے
یا وادیٔ ایمن سے چرائی ہوئی تنویر
اے جنّتِ کشمیر

بہتے ہوئے چشموں میں یہ نغموں کا تلاطم
گاتی ہوئی جل پریوں کا یہ شوخ تکلم
بڑھتی ہوئی موجوں کا یہ پُر کیف ترنّم
ہر موج میں یہ کوثر و تسنیم کی تاثیر
اے جنّتِ کشمیر

یہ چھاؤنی چھاتی ہوئی پربت پہ گھٹائیں
یہ جھومتی گاتی ہوئی دھرتی کی فضائیں
بہکی ہوئی، لہکی ہوئی یہ مست ہوائیں
کس شاعرِ فطرت کے تو خوابوں کی ہے تعبیر
اے جنّتِ کشمیر

صدیوں تو رہینِ غمِ دوراں بھی رہا ہے
یہ تیرا چمن برق بہ داماں بھی رہا ہے
یہ خلدِ بشر، دوزخِ انساں بھی رہا ہے
پھولوں میں ترے تھی کبھی شعلوں کی بھی تاثیر
اے جنّتِ کشمیر

اے جنّتِ کشمیر! مجھے پھر وہی ڈر ہے
اک شعلہ خو عفریت کی پھر تجھ پہ نظر ہے
پھر تیری بہاروں میں وہی رقصِ شرر ہے
بن جائے تو پھر تیغِ خزاں کا کہیں نخچیر
اے جنّتِ کشمیر

آزادیاں تیری کہیں آمادۂ رم ہوں
خوشیاں تری اک دن کہیں محبوسِ الم ہوں
تجھ پر نہ مسلط کہیں اربابِ ستم ہوں
پڑ جائے غلامی کی ترے پاؤں میں زنجیر
اے جنتِ کشمیر

یہ "سرخ سیاست" ہے تباہی کی پیامی
اک دردِ شب و روز اک آزارِ دوامی
اے خطۂ آزاد! کوئی "تازہ غلامی"
بن جائے ترے لوحِ مقدر کی نہ تحریر
اے جنتِ کشمیر

رہبر ترے تجھ کو سرِ منزل نہ لٹا دیں
یہ تیرے مسیحا تجھے خود ہی نہ مٹا دیں
یہ اہلِ ہوس تجھ کو جہنم نہ بنا دیں
بن کر نہ بگڑ جائے کہیں پھر تری تقدیر
اے جنتِ کشمیر

میرزا ہرگوپال تفتہ

تبّت

تبت اے وادیٔ بہشت نظر
تو اور آئینۂ جہنم ہو؟
تیرے کیلاش کی بہاروں پر
شعلہ انداز، سُرخ پرچم ہو؟

تیرے باسی ہوں خستہ و رنجور
پھول، گلشن میں مسکرا نہ سکیں؟
خوف گلچیں سے گلستاں والے
بات دل کی زباں پہ لا نہ سکیں؟

حق پرستوں کو مل سکے نہ نجات
اہلِ باطل کے جبرِ پیہم سے؟
شل ہو پائے مسرتِ جمہور
سامراجی، سلاسلِ غم سے؟

تیری آزاد زندگانی پر
ہو مسلط نظامِ جبر و جفا؟
ہو تری خلد زار دھرتی پر
آسماں سے نزولِ کرب و بلا؟

کیسے مانوں کہ وسعتوں میں تری
مادی تنگ کی حکومت ہو
غیر ممکن، یہ غیر ممکن ہے
تجھ کو تسلیم "سرخ عظمت" ہو

خونِ انسانیت کی ارزانی
اک نہ اک دن تو رنگ لائے گی
سرخ اندھیرا یہ چھٹ ہی جائیگا
سرخ آندھی گذر ہی جائے گی

تبت، اے وادئ بہشت نظر
تو اور آئینۂ جہنم ہو؟
تیرے کیلاش کی بہاروں پر
شعلہ اندازِ سرخ پرچم ہو؟

گوپال مِتّل

امن

فاختہ اور اُمّتِ لینن
دستِ قاتل میں پھول کی پتّی ؟
ایک جلّاد اور موسیقار ؟
نغمۂ امن سے فریب نہ کھا
یہ رجز کے سوا کچھ اور نہیں
صرف قاتل نے بھیس بدلا ہے

کہنہ انساں شکار اُٹھے ہیں
دامِ تازہ کا اہتمام کیے
لب پہ ہے صُلح و دوستی کی نوید
آستینوں میں دشنۂ پنہاں
غازۂ امن مَل کے نکلے ہیں
وارثانِ ہلاکو و چنگیز

کیا قیامت ہے قاتلِ جمہور
دشمنِ ارتقائے اِنسانی
دعوتِ انقلاب دیتے ہیں
ہیں وہی امن و آشتی کے نقیب
جن کے سینے ہیں بُغض سے معمور
جن کے جبڑوں سے خوں ٹپکتا ہے

پوچھ ان امن کے نقیبوں سے
جنگ جو کون ہے زمانے میں
کون تھا کوریا میں بانیٔ جنگ
ہند چینی پہ کس کی ہے یلغار
کس نے تبت کو پائمال کیا
کس نے پولینڈ کو کیا تھا شکار

اتنا تاریک نامۂ اعمال
اور یہ شورِ پاک دامانی
اے ریاکار اے مجاہدِ امن
روس کے سامراج کے حامی
تیری ریشہ دوانیوں کا جواب
اِک حقارت بھرا تبسم ہے

مخمور سعیدی

امن باز

(روسی ڈکٹیٹروں سے معذرت کے بغیر)

دوست! یہ غارتگرانِ امنِ عالم "امن باز"
یہ ریا پیشہ، یہ حیلہ ساز، یہ فتنہ طراز
یہ اسیرِ زلفِ لینن، یہ سٹالن کے غلام
اُن کے لب اور امن و آزادیٔ عالم کا پیام
جن کا اک اک سانس ہے اک حلقۂ بادِ خزاں
اُن کی نظریں اور حدیثِ رنگ و بو کی ترجماں
جن کا ایماں بربریت، جن کا مذہب شیطنت
اُن کے وحشی دل اور احساسِ غمِ انسانیت
جن کی فطرت میں ہے سنگینیٔ مزاجِ مرگ کی
اُن کی روحیں اور شناسائے گدازِ زندگی
مذہب و اخلاق کو جو کر رہے ہیں پائمال
اُن کو اور موجِ مقامِ آدمیت کا خیال
خلوتوں میں جن کی ہر دم موت سے سرگوشیاں
اُن کی بزم اور ارتقائے زندگی کی داستاں

آدمیت جن سے ہے نذرِ تفنگ و تیر و تیغ
پی رہے ہیں جو لہو انسانیت کا بے دریغ
جو شریکِ درد اس کے ہیں نہ اُس کے چارہ ساز
جن کے سینوں میں ہیں دل بیگانۂ سوز و گداز
جن کی نظروں میں زلیخا کی محبت کچھ نہیں
جن کے بازاروں میں خود یوسف کی قیمت کچھ نہیں

کتنے راموں کی محبت لوٹنے والے ہیں یہ ؟
کتنی سیتاؤں کی عظمت لوٹنے والے ہیں یہ !
جانے کتنے لچھمن ان کے جبر کے محکوم ہیں
جانے کتنے بھرت اپنے رام سے محروم ہیں
کتنے رانجھا ہیں جوان پر آہ قرباں ہو چکے
کس قدر ہیروں کے ارماں خاک و خوں میں مل گئے
کتنی آغوشیں ہیں جو سونی ہیں ویراں ہو چکیں
کتنی مانگیں صندل و سیندور اپنا کھو چکیں
کسقدر گلفام چہرے زرد ہو کر رہ گئے
کتنے نازک دل رہینِ درد ہو کر رہ گئے
گرمیاں کتنے دلوں کی سرد ہو کر رہ گئیں
کتنی لاشیں نذرِ خاک و گرد ہو کر رہ گئیں
صدمۂ جانکاہِ غم سے پھٹ پڑے کتنے دماغ
بڑھ گیا کتنا اندھیرا بجھ گئے کتنے چراغ

امن کے پردے میں یہ جنگیزیاں، خونخواریاں
نسلِ آدم کو مٹا دینے کی یہ تیاریاں
یہ ریاکاری، یہ مکاری، یہ عیاری کے جال
رہ سکیں گے اور کب تک پردہ دارِ اصلِ حال
کہہ رہی ہے وقت کی بدلی ہوئی رفتار دوست !
یہ ستم پیشہ، جفا پرور، یہ ناہنجار دوست !
اپنے پھیلائے ہوئے داموں میں خود آجائیں گے
خود انہیں کے "پالتو کتے" انہیں کھا جائیں گے

سیّد سہیل واسطی

نیا بول

کسی کو حق نہیں افکار و عرفاں کی بلندی کا
کسی کو حق نہیں آفت زدوں کی دردمندی کا
کسی کو حق نہیں دنیا میں آزادی پسندی کا
کسی کو حق نہیں ہے امن کی منصوبہ بندی کا
محاذِ آدمیت پر اجارہ داریاں میری
اُفق سے تا اُفق مشہور ہیں بقراطیاں میری
مری جاگیر فکرِ حال و مستقبل، غمِ ماضی
مجھی پر ختم ہے علم و ادب کی ساری فیاضی
مری "انگلی کی رقاصہ" غمِ دوراں کی نبّاضی
مرے احکام پر ہونا پڑے گا وقت کو راضی
میں ذہنِ دَور و قلبِ عہد ہوں میں چشمِ عالم ہوں
مسلّم پرتوِ صبحِ ازل، نورِ مجسّم ہوں!

دہکتا ہوں میں انگاروں میں شعلوں میں بھڑکتا ہوں
میں بادل میں گرجتا ہوں میں بجلی میں کڑکتا ہوں
رُخِ کہسار پہ سورج سے کرنیں میں چھڑکتا ہوں
اور اب تو آپ کے پہلو میں بھی میں ہی دھڑکتا ہوں
کوئی جانے نہ جانے میں کئے ہی جاؤنگا "میں میں"
کوئی مانے نہ مانے میں رٹے ہی جاؤں گا "میں میں"
چڑھا جو دار پہ منصور کب تھا وہ تو میں ہی تھا
پھدا گولی سے جو مزدور کب تھا وہ تو میں ہی تھا
جو فاقوں سے مرا جمہور کب تھا وہ تو میں ہی تھا
جدائی میں کوئی مہجور کب تھا وہ تو میں ہی تھا
کسی کا کارنامہ ہو مرے سر اس کا سہرا ہے
کسی دولھا کا جامہ ہو مرے سر اس کا سہرا ہے
زمامِ عصر میرے ہاتھ ہے اے فلسفہ دانو
زمانہ آج میرے ساتھ ہے سمجھو بھی دیوانو
مری سرکار میں دنیا کی دولت نذر گذرانو
نہیں تو تم کو گولی مار دی جائے گی شیطانو
اسی پر منحصر ہے اب ترقی اہلِ عالم کی
ضرورت ہے یہی سب سے بڑی ابنِ آدم کی

فیثا غورث

غیر مبہم شاعری

ہے مارکس مفکرِ یگانہ — تصنیف ہے اس کی فاضلانہ
انگلس کی بھی نظر عقابی — لینن تھا عظیم انقلابی
دُنیا میں تھا فرد اسٹالن — فولاد کا مرد اسٹالن
بعد اس کے ہے دوسرا ملنکف — ہے امن کا دیوتا ملنکف
غدار ہے بیریا وطن کا — جیسے ہندوستان کے نیتا
برلن میں پُلاؤ پک رہا ہے — کشمیر کا دل دھڑک رہا ہے
بنگال اُبال کھا رہا ہے — پنجاب کو طیش آ رہا ہے
کیا بات ہے چین و کوریا کی! — ہے فارغ دورِ اشتراکی
اللہ کا نام لفظ مہمل — الحاد جہاں میں سب سے افضل
اے فاقہ زدہ غریب لوگو — دے دو ہمیں اپنے ووٹ دیدو
قدرت کے یہ کھیل ہیں نرالے — سب کو حیران بنانے والے
ہاتھی کو بڑا کیا۔ بڑا ہے — لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے
دندانِ تو جملہ در دہانند — چشمانِ تو زیر ابروانند

شفیق انجم سہسوانی

سُرخ پرچم کے پرستار

ادب نو کے اداکار یہ سُنتے کیسے!
سُرخ پرچم کے وفادار یہ سُنتے کیسے!
آمریّت کے پرستار یہ سُنتے کیسے!
امن و تہذیب کے سردار یہ سنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سنتے کیسے
محفلِ شعر میں "یلغار" کی لے میں بہکے
امن و تہذیب پہ تقریریں کھُل کر چہکے
سرخرو ہو گئے الفاظ کی رَو میں بہکے
کس قدر خوش تھے "غلط فہمیٔ شاعر" کہکے
ذکرِ خوش فہمیٔ افکار یہ سُنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سنتے کیسے!

۱؎ مصنف کی ایک نظم سرحد جنگ علی سردار جعفری کو برہم کر دیا تھا یہ نظم اُسی برہمی کا جواب ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ تھا فتویٰ توہین عوام
بہرِ آسانیٔ تنقید، برائے الزام
مسخ کرنا ہی پڑے ان کو اشاراتِ کلام
قابلِ دید تھا واللہ جوابی پیغام
مائلِ یورش و یلغار، یہ سنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سنتے کیسے!

آلۂ جنگ نہیں صرف یہاں تیر و تفنگ
وقت کیسا تھ بدل جاتے ہیں بیداد کے ڈھنگ
نعرۂ سُرخ ہی اعلانِ خداوندیٔ جنگ
خونِ طبقات ہے تہذیب کے ماتھے پہ کلنگ
اس نئی جنگ کے اوتار، یہ سُنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سُنتے کیسے!

جنگ کو مذہبِ طبقات بنانے والے
جنگ کو راہ نظریات دکھانے والے
جنگ پر خولِ بغاوت کا چڑھانے والے
امن کا ڈھونگ زمانے میں رچانے والے
ڈھونگ ہے امن کا پرچار، یہ سنتے کیسے
روس بھی ہے پئے پیکار، یہ سُنتے کیسے

چل گیا مشرقی یورپ پہ 'رہائی' کا فسوں
سُرخ فوجوں نے گرا ہی دئے کمزور ستوں
اب پسِ پردۂ آہن ہے خطرناک سکوں
خود سمجھ جائیگا ہر شخص، کہوں یا نہ کہوں

قصۂ آمرِ عیّار، یہ سُنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سُنتے کیسے

بُغض میں قدرِ دوامی کہیں ہوتی ہی نہیں
جبریت امن کی حامی کہیں ہوتی ہی نہیں
آمریت تو عوامی کہیں ہوتی ہی نہیں
ایسی مدہوش غلامی کہیں ہوتی ہی نہیں

اس غلامی کے طلبگار یہ سُنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سُنتے کیسے!

نفرت و جبر سے حل ہوگا نہ خاقوں کا سوال
جرمِ تاریخ سے بہتر ہے یہ دشواریٔ حال
مستقل جنگ ہے طبقات پرستی کا کمال
سُرخیٔ صبح ہے شبخونِ تمدّن کا مآل

مجرمِ سُرخیٔ خوں بار، یہ سُنتے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سُنتے کیسے!

بزمِ اشعار میں 'یلغار' پہ آتی ہے ہنسی
بزمِ افکار میں تکرار پہ آتی ہے ہنسی
اصطلاحات کی بھرمار پہ آتی ہے ہنسی
اعتراضات کی بوچھار پہ آتی ہے ہنسی

فتنۂ روس پہ اشعار یہ سنئے کیسے!
روس بھی ہے پئے پیکار یہ سنئے کیسے
امن و تہذیب کے سردار یہ سنئے کیسے؟

ایک شعر

دَورِ حاضر کے تغیّر پہ نظر تک نہ ہوئی
انقلاب آ بھی گیا تم کو خبر تک نہ ہوئی

(نامعلوم)

محمود ایاز بنگلوری

مراجعت

کتنی زہرائیں مری بزم میں رقصندہ رہیں
کتنی سلمائیں مرے شوق کا عنوان بنیں
کتنی بے تاب نگاہوں نے مجھے اپنا کہا
کتنی نادیدہ ادائیں مرا ارمان بنیں

آج جب حسنِ تخیل کا فسوں ٹوٹتا ہے
وقت آئینۂ ایام دکھاتا ہے مجھے
آگہی شوق کا خمیازہ بنی جاتی ہے
میرے بڑھتے ہوئے ادراک نے لوٹا ہے مجھے

فکر کے اوج پہ احساس کو موت آئی ہے
اب تخیل نہ تخیل کی فسوں کاری ہے
خود تراشیدہ خداؤں کا گنہگار ہوں میں
میرے احساس کی قسمت میں نگوں ساری ہے

مجھے افکارِ دو عالم کا گراں بار نہ دو
میں تمدن کے حقائق کا طلبگار نہیں
میری کھوئی ہوئی فردوس میں لے جاؤ مجھے
میں شعورِ غمِ گیتی کا سزاوار نہیں

مخمور سعیدی ٹونکی

حرّیتِ فکر

حرّیتِ فکر ایک ستم سوز شرارا
دہکے ہوئے جذبات کا چڑھتا ہوا پارا

سرگشتگیٔ جہل کی ظلمت میں اُجالا
احساسِ خود آگاہ کی بھڑکی ہوئی جوالا

آہِ دلِ مجبور کی جاگی ہوئی تاثیر
ہر سینۂ جابر میں اُترتی ہوئی شمشیر

مظلوم کے اشکوں کا نکھرتا ہوا عالم
ظالم کے ارادوں پہ برستی ہوئی شبنم

خلدِ دلِ نمرود میں شعلوں کا تلاطم
گلزارِ براہیم کے پھولوں کا تبسّم

وہ کرشن کی مُرلی کا لہکتا ہوا نغمہ
پہنا نہ سکا کنس جسے طوقِ اجل کا

گوتم کا، مہاویر کا پیغامِ مساوات
آئینۂ خورشید میں عکسِ رُخِ ذرات

عزمِ دلِ موسیٰ کا گُل آہنگ ترانہ
فرعون کی خوں گشتہ امیدوں کا فسانہ

حق گوئی کے جذبے کی وہ آوازِ مکرّر
نکلی لبِ عیسیٰ سے جو سولی پہ بھی چڑھ کر

کردار میں اظہار تقاضائے دلی کا
افسانۂ اخلاصِ حسین ابنِ علی کا

سرمد کی جبیں کا حشمِ نازِ گدائی
خودداریٔ افسوں شکنِ حشمتِ شاہی

وہ سوزِ یقیں، ذوقِ عمل کو جو جِلا دے
ذرّوں کو مہ و مہر کا ہمدوش بنا دے

لیکن نہیں اِس جرأتِ گستاخ کا یہ نام
آدم کو کرے سجدہ نہ ابلیس بد انجام
پوجے نہ برہمن صنمِ دیر مکیں کو،
رکھے نہ درِ کعبہ پہ شیخ اپنی جبیں کو
ہر بندۂ یزداں درِ یزداں سے پلٹ کر
ہو سجدہ گذار اہرمنِ وقت کے در پر
اس طرح بدل جائیں کچھ انداز دو عالم
لہرائے سرِ عرشِ بریں فرش کا پرچم
اُٹھ جائے ہر اک رسمِ کہن باغِ جہاں سے
غنچے جو کریں بات تو کانٹوں کی زباں سے
ہر شاخِ چمن زار کی شمشیر رواں ہو
ہر پردۂ گل میں کوئی شعلہ بھی نہاں ہو
رفتار بدل جائے نسیمِ سحری کی
پھولوں کی روش اور ہو کچھ جامہ دری کی

ہے کون جو قدرت کے قوانین بدل دے؟
فطرت کے تراشے ہوئے آئین بدل دے؟

جوہر ٹونکی

ہزار بار سلام

(جوش ملیح آبادی سے معذرت کے بغیر)

جو مصلحین کو سمجھے ہیں موردِ الزام
سُنیں اب اپنی حقیقت وہ شاعرانِ کرام

جو ہیں فدائے وطن برگزیدۂ اقوام
ہو کیسے اُن پہ تمہیں فرصتِ درود و سلام

تمہارے واسطے یکساں ہے حلّت و حُرمت
شراب نوشی نے تم کو عطا کیا وہ مقام

ہو جس کے نام پہ توہینِ مذہب و ملّت
تمہارے ذہن میں ہر شاعری اسی کا نام

تمہارے قول ہیں صدق و صفا سے یوں خالی
کہ تیغ ٹوٹ کے رہ جائے جیسے خالی نیام

غمِ جہاں سے ہو آزاد گو بہ ظاہر تم
شکم پری کی بباطن ہے فکر صبح و شام

غیور اتنے کہ صرف ایک جام مے کے عوض
کسی امیر کے در پہ ہنر کرو نیلام

غلط کلام پہ تحسین صاحبِ زر سے
نکالتے ہو تم اپنی سبیلِ شُربِ مدام

حریفِ صاحبِ زر ہو اگرچہ ظاہر میں
مگر ہو اصل میں اہلِ دول کے دل سے غلام

نظر اُٹھا کے نہ دیکھو کسی کی تم تکلیف
میسّر آئے جو تقدیر سے تمہیں آرام

اگر نظامِ مشیّت نے طرح دی تم کو
سمجھتے ہو اسے تم اپنے جُرم کا انعام

کہیں تو تم ہو خدا کے وجود سے مُنکر
کہیں ہو معترفِ صنعِ ربِّ ذوالاکرام

کہیں ہو آئینہ دارِ یقینِ محکم تم　　کہیں یقین تمہارا ہے کشتۂ اوہام
غرض ہو ایک ہی شے کے مقر بھی منکر بھی　　دلیل ہے مرے دعویٰ کی خود تمہارا کلام
کلام میں تمہیں ملحوظِ فن نہ ہوشِ تضاد　　نہ دستِ فکر میں ہے توسنِ بیاں کی لگام
وہ عکسِ مے جو نگاہوں کا نور دل کا سرور　　تمہارے قلب پہ ہے جس سے بارشِ الہام
نہ ہے وہ مے جو نہ کرنے دے فرقِ زشت و خوب　　تمہارے واسطے یکساں کرے حلال و حرام
یہ شوقِ بوالہوسی ہے کہ جوشِ بادہ کشی　　جو نامِ حافظ و خیامؔ کو کرے بدنام
خرد کے چہرے پہ غازہ ملو نہ مستی کا　　کہ راز ہو کے رہے گا ہوس کا طشت از بام
جو مے کو موجبِ تکمیلِ شاعری سمجھو　　ہے شعر گوئی کے فن میں تمہارے مجھ کو کلام
نہیں ادب کو کوئی ساقی و مغاں سے غرض　　کہ فطرتاً ہے ادب بے نیازِ بادہ و جام
اسی ادب میں ہے تعمیرِ ملک و قوم نہاں　　کہ جو اصولِ مذاہب سے پائے استحکام
ستم کہ بے ادبی کو سمجھ رہے ہو ادب　　ادب کا واسطہ دو اپنی تم زباں کو لگام
مشاعروں میں تم احباب کو برا کہہ کر　　نہ بن سکو گے کبھی شاعرِ بلند مقام
یہ بزمِ شعر ہے دکانِ مے فروش نہیں　　جدا یہاں کا ہے حضرت طریقِ حسنِ کلام
مشاعروں میں نہ آنے سے یوں ڈراتے ہو　　کہ جیسے مقتدیانِ ادب کے تم ہو امام
برائے نام تو شاعر ہو اور ادیب ہو تم　　درونِ پردہ مگر اور ہیں تمہارے کام
سنو کہ تم ہی مذاہب کی کر کے دل شکنی　　بگاڑتے ہو وطن کی معاشرت کا نظام
تمہیں ادیب ہو بانیٔ فسادِ باہم کے　　سوائے طعنہ زنی کے نہیں تمہیں کچھ کام
سلام کیوں نہ کرو پھر مشاعروں کو تم　　بجائے داد کے دیں اہلِ بزم جب دشنام

اگر ہو موجبِ تخریبِ ملک و قوم ادب
تو جوہر ایسے ادب کو ہزار بار سلام

مخمور سعیدی

شکستِ طلسم

(مشرقی جرمنی کی روسی سامراج کے خلاف بغاوت)

نہ امن ہے نہ سکوں ہے نہ چارۂ غم ہے
تمہاری بزمِ طرب کا عجیب عالم ہے
وہ سرزمیں کہ جسے رشکِ خلد کہتے ہو
خطا معاف! دہکتا ہوا جہنّم ہے

"نیاز مند" لبوں پر ہے "رازِ خلوتِ ناز"
جو بے زبان تھے بے باک ہوتے جاتے ہیں
کہاں تک اور زمانے کو دے سکو گے فریب
کہ پردے مکر کے اب چاک ہوتے جاتے ہیں

دلوں سے حُسنِ عقیدت کے مٹ رہے ہیں نقوش
مہیب شکل حقائق کی ہے نگاہوں میں
بھڑک رہے ہیں وہ شعلے درونِ پردۂ گل
"جہنموں" کے مناظر ہیں "خلدگاہوں" میں

ہے جس میں "سرخ صداقت" کی عظمتوں کا بھرم — وہ دامن آپ کے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گا
کچھ اور "سحر طرازی" سے کام لیں ورنہ — "طلسم عدل و مساوات" ٹوٹ جائے گا

سنا رہی ہے یہ مژدہ بغاوتِ برلن — جو محوِ خواب تھے بیدار ہوتے جاتے ہیں
فسوں طراز فسانوں سے جو بہلتے رہے — حقیقتوں کے طلب گار ہوتے جاتے ہیں

نظام جبر و جفا کارگاہِ ہستی میں — نہ کامیاب ہوا ہے نہ ہو سکے گا کبھی
جس "انقلاب" کے خواہاں ہو تم زمانے میں — وہ "انقلاب" ہوا ہے نہ ہو سکے گا کبھی

گوپال متل

قطعات

ہمالہ

ہمارا ضبط و تحمل تو تم نے دیکھ لیا — ہمارے عزم و ارادہ پہ بھی نظر ڈالو
نہ ٹوٹ جائے کہیں سعیٔ خام میں گردن — ہمالیہ کی بلندی کو تاکنے والو

کیلاش

ہمارے عزم کا مظہر ہمالیہ کا ہے اوج — ہماری پاکیٔ مقصد کی داستاں کیلاش
میانِ باطل و حق پھر شروع ہوتا ہے — وہی مجادلہ جس کا ہے ترجماں کیلاش

بدری ناتھ

بہت پوتر ہے ہندوستان کی دھرتی — اور اس میں سب سے زیادہ پوتر بدری ناتھ
نگاہِ کفر ادھر اُٹھ سکے اسے توبہ! — کہ ہے طہارتِ فطرت کا چتر بدری ناتھ

کاشمیر

نہ لیں بہشت بھی ہم کاشمیر کے بدلے — یہ کیف و نور کا، یہ رنگ و بو کا گہوارہ
پر اس سے سرخ جہنم کی آنچ آتی ہے — دہک رہا ہے جو پہلو میں اس کے انگارہ

جے چانڈی

ترے حضور چڑھاتے رہے ہیں سر ماتا — ہمارا ذوقِ پرستش بھی کیا نرالا ہے
ہمیشہ خونِ عدو میں نہا کے نکلے ہیں — کبھی جو ہم نے علمِ جنگ کا سنبھالا ہے

شمس نوید

تہ نشین طوفان

(زندگی کے سمندر میں)

وقت :- ملک چین کی تاریک رات۔

کردار :- "شی شین" ایک دولتمند خوبصورت چینی عورت۔ (۲) "چنگ" ایک فلسفی وشاعر

جگہ :- "شی شیں" کا آستانہ

شی شیں کون ہو تم ؟ اجنبی ! غلطاں ہو کن آفات میں

چنگ ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں دن کا اجالا رات میں !

شی شیں رات میں، اور دن کی پنہاں روشنی کی جستجو ؟ موت کی گہرائیوں میں زندگی کی جستجو ؟

چنگ ہاں ! مگر اس میں تعجب کی ہے آخر بات کیا ؟ دن بھی راتوں کی طرح کالا ہو تو دن رات کیا

عصرِ نورِ روشن ہے بجھتا جا رہا ہے آدمی
ظلمتوں میں آدمی کو کھا رہا ہے آدمی

چین کی قسمت میں اب اک "رات" ہے کالی مہیب
جسمیں آوارہ ہے چینی قومیت دور و قریب

رات جو انسانیت کے خواب سارے کھا گئی
رات جسمیں دن کے امکانات کو موت آ گئی

رات جسکو "اقتدارِ آتش و آہن" ملا
رات جس کی گود میں تہذیب کو مدفن ملا

جل رہا ہے امن کے خوں سے سیاست کا چراغ | "نعش دل" پر لڑ رہے ہیں گرگسی بھوکے دماغ
سُرخ لاوا پھٹ رہا ہے وقت کے کہسار سے | آدمی کیسے بچے افلاک کے ادبار سے ؟

شی شین (حیرت سے) ہوں !

چنگ : کیا فقط "ہوں" ہے تمہارے پاس ان سب کا جواب ؟ | دیکھتی ہو جیسی سی آگ خوں کا انقلاب !
رو پڑو واتنا، نظر کی قوتیں گھٹنے لگیں | چیخ اٹھو، چیخو یہاں تک پھیپھڑے پھٹنے لگیں
ہاتھ میں لیکر مسل دو حسن کا سارا سنگھار | نوچ ڈالو اپنے بالوں کی لٹیں دیوانہ وار
یہ لباسِ نرم و نازک چاک کر کے پھینک دو | پھونک دو یہ ہار، زیور خاک کر کے پھینک دو
توڑ دو یہ میز پر رکھے ہوئے نازک گلاس | ان سے بجھ سکتی نہیں احساس بربادی کی پیاس
تم میں گر جرأت نہیں اتنی کہ ان کو توڑ دو | لاؤ یہ سب کچھ مرے رحم و کرم پر چھوڑ دو
توڑ کر یہ ساز و ساماں اک حسیں جھنکار سے | آؤ دونوں پھوڑ لیں سر مرمریں دیوار سے

شی شین (شدید دہشت و حیرت سے) کون ہو؟ اُف! کہہ رہے ہو کیا یہ پاگل اجنبی!

چنگ (بھیانک ہنسی کے ساتھ) ہاں میں "پاگل چین" کا اک آدمی ہوں آخری !!
تم مجھے افکار کی بھٹی کا انگارا کہو ! | زندگی کی رات میں "ٹوٹا ہوا تارا" کہو
خواب آوارہ ہوں جو کہ چین کی پہنائی میں | جو بھٹک کر آ گیا ہے حسن کی تنہائی میں

شی شین (خوف و تجسس کے لہجے میں) تم ہو جمہوری کہ کمیونسٹ

چنگ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) سب جھوٹے ہیں سب | یہ حقیقی زندگی کا فلسفہ سمجھے ہیں کب ؟
نظریوں کے ڈھونگ ہیں لفظی گھروندے ہیں تمام | خوف ہے آغاز ان کا، یاس ان کا اختتام
ہر سکوں کے واسطے انساں میں فطری دوڑ دھوپ | جو بدلتی آئی ہے افکار و ذہنیت کے روپ
عقل کی چھلنی میں لاکھوں فلسفے چھنتے رہے | کچھ بگڑتے کچھ نظامِ زندگی بنتے رہے
ہر نئی تہذیب آئی ٹھوکریں کھاتی ہوئی | زندگی کے راستے کھوتی ہوئی پاتی ہوئی
"پہلے پیغامات" تازہ فکر جھٹلاتا رہا ! | "حال" آیا اور "ماضی" کی جگہ پاتا رہا

ہر تمدن نے کہا "میں ہوں مصیبت کا علاج" زندگی کے غم میں لیکن کچھ کمی کل تھی نہ آج!
زندگی کرتی گئی ہر اک تصور پر یقیں پی گیا انسان سب کچھ زہر ہو یا انگبیں
وقت ہر تدبیر کو پامال کرتا ہی گیا نوعِ انسانی کا شیرازہ بکھرتا ہی گیا
آج کمیونزم اور جمہوریت کی دھاک ہے دیکھتی ہو؟ پھر بھی دنیا کس قدر غمناک ہے

شی شیں (طنزیہ تردید کے ساتھ) "چین" ہے یا ساری دنیا؟!

چنگ (جوش کے ساتھ) ساری دنیا ہے تباہ تم نے ڈالی ہے کبھی دنیا کے چہرے پر نگاہ؟
کیا قیامت آ چکی ہے ہند و پاکستان میں تیز ہے کتنا خمارِ زندگی "جاپان" میں
روس میں تحت الشعوری کس قدر ہیجان ہے ملک ہے آباد لیکن آدمی "ویران" ہے
محو یہ دنیا ہے خونی جنگ کے آلات میں آدمی بیٹھا ہوا ہے آدمی کی گھات میں
لڑ رہے ہیں کس طرح مصر و فلسطین و عراق ہے ہر اک محدود طاقت کو حکومت کا "مراق"
کیا زمانہ کا سکوں منظورِ قسمت ہی نہیں؟ ساز و سامانِ مسرت ہیں مسرت ہی نہیں
سطح ساکن ہے تلاطم ہے مگر گہرائی میں زیست جلوت میں تبسم، اشک ہے تنہائی میں

شی شیں (الجھن کے ساتھ) آہ لیکن کیوں؟

چنگ — نہ پوچھو! گرم ہے اس کا جواب جل نہ جائیں "ارتقائے دہر" کے رنگین خواب
زیست کے دو نصف ہیں جسمانیت روحانیت یہ ملیں گے جب تو ہی ہو گی حسیں انسانیت
ارتقائے حال کی منزل ہے جسمانی سکوں روح اس توہین کی جرأت سے برہم ہو نہ کیوں
آج "دونوں نصف" ہیں اک دوسرے سے دور دور ایک سے یہ مرحلہ ہوتا نہیں تنہا عبور
مادیت کی فضا میں اُڑ رہا ہے آدمی کشمکش کے پیچ و خم میں مر رہا ہے آدمی
ہر حسیں تہذیب کا ہوتا ہے خونی اختتام لے رہی ہے "روح" "ذہنِ زندگی" سے انتقام

جسم بنتا ہے سکوں کے واسطے خوابوں کے جال
روح اک ٹھوکر سے کر دیتی ہے ان کو پائمال

سروَن کمار سوز

انقلاب آ ہی گیا

(ایک منظوم فیچر)

شاعر: ہائے مغرب میں اُفق پر ڈوبتی کرنوں کا جال
اس طرح بکھری ہوئی ہیں ہر طرف رنگینیاں
جیسے کوئی مور پھیلا دے فضا میں اپنے پنکھ
اس طرف موجِ ہوا پر جھومتے رنگین پھول
منتشر ہو جائیں جیسے پھوٹ کر چنگاریاں
جیسے اک معصوم دوشیزہ کے عارض کے کنول
تمتما جائیں کسی کی جرأتِ بے باک سے
اونگھتے ہیں اس طرح سائے درو دیوار پر
کھیل سے تھک ہار کر معصوم بچہ جس طرح
اپنی ماں کی گود میں آ جائے آنکھیں موند کر
کیف کی موجوں میں ڈوبی، مست، متوالی ہوا

نرم پتوں کو ہلارے دے رہی ہے اس طرح
اپنے ننھے بھائی کا زانو پہ رکھ کے جیسے سر
تھپتھپا کر، لوریاں دے کر سُلاتی ہے بہن
چہچہاتے، غل مچاتے پنچھیوں کی یہ قطار
جیسے کوئی فوج اپنی جیت کے نشے میں چور
لوٹتی ہے رزم گہہ سے اپنے خیموں کی طرف
ہائے یہ رنگینیاں، رعنائیاں، سرمستیاں
جی میں آتا ہے یہیں رہ جایئے، کھو جایئے

بھکارن: ایک روٹی، ایک پیسہ میرے بچے کے لئے

شاعر: اُف یہ رنگیں شام، یہ تیری صدائے دلخراش
کر دیا غارت مرے رومان کا سارا طلسم
آرہے تھے کچھ حسیں مضمون میرے ذہن میں
پایۂ تکمیل کو پہنچی نہ تھی میری غزل
اُف، خدا غارت کرے آئی بھی تو کس وقت پر

شاعر کا دوست: کس لئے لائے شاعرِ مزدور اتنی برہمی
ہے تمہاری. بیسیوں نظموں کی زینت ان کا ذکر
ان کا حالِ زار، ان کی بے بسی، بے چارگی
مضطرب، مایوس، بے کل، مضمحل سی زندگی
مضمحل، بے نور چہرے شمعِ کُشتہ کی طرح
ان کی غم آسودگی، مجبوریاں، محرومیاں
ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا شرافت کا غرور

چیتھڑوں میں نیم عریاں نوجوانی کا وقار
کوچۂ و بازار میں بکتا ہوا، لُٹتا ہوا
خستہ و بوسیدہ ان کے جھونپڑے تاریک و تنگ
ان کی گندی بستیوں میں جا بجا پھیلے ہوئے
گندگی کے ڈھیر جن پر اُڑ رہی ہیں مکھیاں
ہے تمہارے شعر و نغمہ کا انہی پر انحصار
ان کی قیمت ایک پیسہ، ایک روٹی بھی نہیں

.. ..

مائی لو تم ایک آنہ اپنے بچے کے لئے

شاعر: تم بھی کیا احمق ہو سکھلاتے ہو ان کو مانگنا
بھوک سے مرتے ہیں گر نادار انہیں مرنے بھی دو
ان کے پھیلے ہاتھ خالی ہیں تو خالی ہی رہیں
ان کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان کو کچھ نہ دو
تاکہ ان کی مٹھیاں بھنچ جائیں فرطِ غیظ سے
تاکہ یہ مجبور ہو کر چھین لینا سیکھ جائیں
پھینک دیں کشکول، شمشیر و سناں کو تھام لیں
ظلمتِ افلاس سے اُبھرے گا مہرِ انقلاب
"خود بخود" حالت سدھر جائے گی ہر نادار کی
— انقلابِ چین کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟

دوست: یہ تو سب سچ ہے مگر وہ جذبۂ انسانیت
اپنے نغموں کی جسے کہتے ہو تم روحِ رواں

کیا اسے قربان کر دو گے برائے انقلاب
آدمی اک بار چھو کر سرحدِ حیوانیت
لوٹ آئے گا کبھی انسانیت کی راہ پر ؟

شاعر: دوست چھوڑو بھی کہاں تک بحث کی بے کیفیاں
اُٹھ رہے ہیں کیف پرور نغمے ریستوران سے
یہ ہوا مہکی ہوئی جیسے نشے میں چور ہو
آ رہا ہے میکدے سے جیسے کوئی بادہ خوار
یہ فضا میں سرسراتی نیلی پیلی ساڑھیاں
ہائے یہ ملبوس رنگیں، ہائے یہ رنگین جسم
مہکی مہکی سی فضا میں بہکے بہکے قہقہے

ریستوران میں

ہاں وہ دیکھو سُرخ ساڑھی میں کوئی لپٹی ہوئی
کاکلوں کے ناگ لہرائے ہوئے ہیں دوش پر
مسکرائے جا رہی ہے کس ادائے ناز سے
لب نہیں، ٹکڑے ہیں یہ یاقوت کے ترشے ہوئے
اُف! یہ آنکھیں ہیں کہ دو چھلکے ہوئے جامِ شراب
سینہ، جیسے مائلِ پرواز ہوں دو قمریاں
اب کوئی دیوانہ ہو جائے تو کیا اس کا قصور
(بوائے سے) بوائے دیکھو چار پیگ شمپین اور دو آملیٹ
(دوست سے) قبلہ ماچس لے کے یہ سگرٹ ذرا سلگائیے

— سچ تو یہ ہے لازم و ملزوم ہیں شعر و شراب
ہائے یہ مدھم دُھنیں، سرگوشیاں، قلقل کا شور
کھنکھناہٹ، سرسراہٹ، جگمگاہٹ، قہقہے
ہر نئی دُھن پر بہک کر فرش پر بوٹوں سی تال
ہائے کیا ماحول ہے، کیا زندگی، کیا سرخوشی
وہ ادھر اک نوجواں کے ساتھ محوِ رقص ہے
موتیوں سے دانت چمکاتی ہوئی اک ساحرہ
ہائے ان کے لب ملے دونوں نے آنکھیں موند لیں
اور حسینہ نے زباں ہونٹوں پہ اپنے پھیر لی
مسکرا کر نوجواں نے اس کے وہ چٹکی بھری
کس ادا سے مُسکرائی ہے وہ کافر ساحرہ
میں چلا، اللہ کوئی آئے، مجھ کو تھام لے
ان دُھنوں پر کاش آجاتا مجھے بھی ناچنا

دوست: آ چلی ہے رات سر پہ آداب باہر چلیں،
شاعر: کاش یہ لمحہ ٹھہر جائے ہمیشہ کے لئے

ریستوران سے باہر

بھکارن: ایک پیسہ بھائی، میری ماں بہت بیمار ہے
شاعر: کون بھائی ہے یہاں؟ کچھ ہوش کی باتیں کرو
اُف! یہ تم ہو خیر کر دیتے ہیں ہم تم کو معاف
"ماں بہت بیمار ہے" کیا خوب ہے یہ پھر کہو

ہائے یہ بالی عمریا، یہ جوانی، یہ شباب
ہر نفس کی آمد و شُد پر یہ سینے کا اُبھار
جیسے موجوں پر ہلارے کھا رہی ہوں کشتیاں
ہائے یہ گولائیاں، قوسیں، قیامت خیز خم
ہائے یہ گدرائی رانیں، ہائے یہ پتلی کمر،
اور یہ مخمور آنکھیں، جاگتے میں اونگھتی
زلف جیسے رات ہو برسات کی بھیگی ہوئی
کیوں بھٹک جائے نہ کوئی راہ رو اس موڑ پر

(دوست سے) آؤ کچھ اس سے بنائیں، "رات بھر کا سلسلہ"
گر یہ ظالم مان جائے لطف ہی آجائے گا

دوست: میں ذرا سگرٹ جلا لوں، سامنے دُکان سے

بھکارن: خون ہی پی جاؤں گی کم بخت کیا سمجھے ہو تم
— اور پھر گونجی فضا میں ایک چانٹے کی صدا
شاعرِ مزدور اپنا گال سہلانے لگے
سامنے سگرٹ لئے حیران تھا شاعر کا دوست
سوچتا تھا وہ کہ شاید انقلاب آ ہی گیا

گوپال متّل

سُرخ آندھی

مِٹ ہی جائے گی ظلمتِ ماحول
مشعلِ علم جگمگائے گی
ہم نے دیکھے ہیں سینکڑوں طوفاں
سُرخ آندھی بھی چھٹ ہی جائیگی

ترقی پسندی

میں تو رجعت پسند ہوں لیکن
وہ بھی اربابِ انقلاب نہیں
اس بغاوت کے طنطنے پہ نہ جا
یہ بجز نشّۂ شراب نہیں

سفینۂ غزل

رضا علی وحشت

باقی ہے یادِ شوکتِ عہدِ کہن ابھی — موجود اپنی وضع میں ہے بانکپن ابھی
کیوں ہو خیالِ شکوۂ جورِ خزاں مجھے — بھولی نہیں ہے یادِ بہارِ چمن ابھی
گو آپڑا ہے شامِ غریبی سے سابقہ — پیشِ نظر ہے رونقِ صبحِ وطن ابھی
کچھ لطف اٹھاؤں زندگیٔ مستعار کا — حاصل ہے مجھ کو فرصتِ سیرِ چمن ابھی
خونریزیوں سے گرمیٔ بازارِ حسن ہے — کیوں کم ہو اُن کی دل کشیٔ انجمن ابھی
جدت پسندیوں کی طرف رخ کروں گا کیا — اُترا نہیں ہے نشۂ جامِ کہن ابھی

بہتر ہے یہ کہ پوچھے نہ وحشت سے کوئی اب
کیسا ہے رنگِ محفلِ شعر و سخن ابھی

ماہر القادری

رضائے دوست جہاں لازمی نہیں ہوتی — کچھ اور چیز ہے وہ بندگی نہیں ہوتی
تسلیوں سے بھی غم میں کمی نہیں ہوتی — یہ بات وہ ہے کہ جو گفتنی نہیں ہوتی
لطافتِ نگہِ ملتفت کا کیا کہنا — کبھی کبھی تو یہ محسوس بھی نہیں ہوتی
دلوں کے واسطے نورِ یقیں ضروری ہے — فروغِ مہر سے تابندگی نہیں ہوتی

نگاہِ حسن کی یہ تہمتیں ارے توبہ !
اب ان کی شوق سے تردید بھی نہیں ہوتی

یہ بزمِ عیش و ہوس یہ جہانِ سود و زیاں
بڑے بڑوں سے یہاں عاشقی نہیں ہوتی

یہ لازمی ہے کہ دل بھی شریک ہو ماہر
دماغ ہی سے فقط شاعری نہیں ہوتی

بسمل سعیدی

پھر میں ہوں اور وہی کرمِ التفات ہے
زیبِ نگینِ شوق وہی کائنات ہے

پھر ہر نفس ہے اور وہی ذوقِ حیات ہے
پھر زندگی ہے اور غرورِ ثبات ہے

حسبِ مراد دل میں زمانے کی کروٹیں
پھر آرزو کا دن ہے تمنا کی رات ہے

پھر حسن سامنے ہے جدھر دیکھتا ہوں میں
پھر کائناتِ شوق بہشتِ جہات ہے

پھر جڑ گیا ہے ٹوٹ کے رشتہ نباہ کا
پھر ابتدا سے سلسلۂ واقعات ہے

پھر ہر معاملہ ہے کہے بن، سنے بغیر
پھر ایک جان اور دو قالب کی بات ہے

لطفِ صفاتِ عشوہ و ناز و ادا کے ساتھ
شوقِ تمام، خلوتیِ حسنِ ذات ہے

پھر ہے بساطِ عیش پہ بازی مراد کی
پھر آرزو کی جیت ہے حسرت کو مات ہے

قانونِ حسن و عشق ہے اور شوق جرم کار
پھر جرمِ شوق داخلِ مستثنیات ہے

پھر ہو رہی ہیں دل پہ مسرت کی بارشیں
پھر اک نشاط لازمۂ واردات ہے

جامِ مئے نشاط میں دنیا و دیں ہیں غرق
اندیشۂ مآل، نہ فکرِ نجات ہے

پھر فیضِ کفرِ حسن سے ہے مستفیض عشق
حسبِ قدیم کعبۂ دل سومنات ہے

گنجائشِ دعا ہے، نہ امکانِ بندگی
دنیا مرے خیال کی بے حادثات ہے

ناممکنات کے بھی احاطے میں جو نہ تھا
پھر وہ محاطِ دائرۂ ممکنات ہے

ہے گردشِ زمانہ مرے زیرِ اقتدار
بسمل عنانِ دہر پہ پھر میرا ہات ہے

محمود ایاز بنگلوری

اب تیرا الم، الم نہیں ہے — غم وجہِ سکوں ہے غم نہیں ہے
گو بارِ حیات کم نہیں ہے — پر غم ہے کہ تیرا غم نہیں ہے
ان آنکھوں کا کیا فریب کھائیں — جینے کا فریب کم نہیں ہے
اے شوقِ وصال و حسرتِ دید — قربت سے فراق کم نہیں ہے

سعید اللہ خاں زخمی (ممبر پارلیمنٹ)

ذرّوں سے چھین لوں شرف رہگذر کو میں
اے فرطِ شوق آج بچھا دوں نظر کو میں
ان کی نگاہِ ناز کی رسوائیاں تو کیا؟
بدنام کر رہا ہوں مذاقِ نظر کو میں

موہن سنگھ دیوانہ

حسن کی تحمید ہم صبح و مسا کرتے رہے — اپنے دل کو یوں حقیقت آشنا کرتے رہے
دن میں جتنی بار پی الحمدللہ کہہ کے پی — شکرِ نعمت ہم سے جتنا ہو سکا کرتے رہے
اک نہیں مانگی خدا سے آدمیت کی روش — اور ہر شے کیلئے بندے دعا کرتے رہے
دل کی گہرائی میں رکھتے ہیں نشاطِ سرمدی — ہم کہ استقبالِ ہر کرب و بلا کرتے رہے
رنگ کیا بھرتے رہے ہم حسن کی تصویر میں
عشق کی مجبوریوں کو آئینہ کرتے رہے

اسمٰعیل اسرار

رہگذاروں میں کانٹے بچھاؤ نہیں　　آزماؤ نہیں، آزماؤ نہیں
ہم نشیمن بنانے میں مصروف ہیں　　بجلیو گرم آنکھیں دکھاؤ نہیں
مسکرائی کلی پر کی شبنم ہو تم　　مہرِ تاباں سے آنکھیں لڑاؤ نہیں
جام دلکش سہی، جام رنگیں سہی　　زہر جیلے سے لیکن پلاؤ نہیں
پھر ہواؤں کو ڈسنے لگیں ناگنیں　　گیسوؤں کو فضا میں اُڑاؤ نہیں
آؤ پہلو نشینی کا ہنگام ہے　　ہچکچاؤ نہیں، ہچکچاؤ نہیں

لاکھ اسرار اصرار کوئی کرے
دل میں جو بات ہے منہ پہ لاؤ نہیں

رعنا جگی

ہ صبح کو اک عشوۂ شب کہتے ہیں　　نا سمجھ لوگ کرم کو بھی غضب کہتے ہیں
شیشہ بھی نہیں جن کی متاعِ ہستی　　وہ بھی اب خود کو خریدارِ حلب کہتے ہیں
احساس پہ غالب ہیں فنا کے اثرات　　جاوداں شے کو بھی وہ جان بلب کہتے ہیں
ق میں ہر لفظ کے معنی ہیں نئے　　بے زبانی کو یہاں حسنِ طلب کہتے ہیں
یقت میں جو تسلیم و رضا کے بندے　　وہ غم و رنج کو بھی عیش و طرب کہتے ہیں

گوپال متل

ہوائے موسمِ گل کچھ چاک گریباں ہوتے ہیں
وحشی آہستہ آہستہ مانوسِ بہاراں ہوتے ہیں
اب سے حرماں کا احساس فزوں تر ہوتا ہے
جب وصل کی ساعت آپہنچے شکوے بھی فراواں ہوتے ہیں

گر خندۂ گل ہے جامہ دری اے دیدہ ورو ایسا ہی سہی
جب فصلِ بہاراں آتی ہے ہر بات کے امکاں ہوتے ہیں
تو شکوہ بلبل اس بات پہ ہے ترتیب گلستاں ناقص ہے
میں حیراں ہوں کب گل بوٹے شایانِ گلستاں ہوتے ہیں
نغمے سے اگر محروم ہے دل ماحول کو مت بدنام کرو!
کتنا ہی جنوں زا ہو موسم کب زاغ غزلخواں ہوتے ہیں

وشواناتھ درد

ہو اگر جوشِ طلب، عزمِ تجسّس کامل
خود بخود بڑھ کے قدم لے گی ہمارے منزل
لاکھ طوفان اُٹھیں، لاکھ بگولے روکیں!
ہم کو پہنچائے گا منزل پہ جنونِ کامل
حسنِ فردا کے حسیں باغ دکھانے والو
آج کی بات کرو کل سے بھلا کیا حاصل
آج دعوے ہے انہیں وقت کی نبّاضی کا
جو رہے وقت کی رفتار سے کل تک غافل

